لب اللباب

فی

تعليم فقه الإمام الشافعي للأحباب

(تعلیم فقہِ شافعی)

جلددوم

تالیف:
علامہ شیخ محمد علی سلطان العلماء

تخریج:
ڈاکٹر محمد عبدالرحیم بن محمد علی سلطان العلماء

ترجمہ
ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی

ناشر
معہد امام حسن البنا شہید۔ بھٹکل

تعلیم فقہِ شافعی؛ترجمہ لب اللباب

پہلا ایڈیشن

نام کتاب:	لب اللباب في تعليم فقه الإمام الشافعي للأحباب
اردونام :	تعلیم فقہِ شافعی
تصنیف :	علامہ شیخ محمد علی سلطان العلماء
تخریج :	ڈاکٹر محمد عبدالرحیم بن محمد علی سلطان العلماء
ترجمہ :	ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی
صفحات :	۳۸۴
تاریخ اشاعت:	ربیع الثانی ۱۴۳۳ ہجری مارچ ۲۰۱۲ء
کمپوزنگ:	ذاکر حسین حفیظ ندوی
تعداد اشاعت:	۲۰۰۰
قیمت :	۳۰۰ روپئے

ملنے کے پتے:

نیوشباب بک ہاؤس، ندوہ روڈ لکھنؤ۔یوپی

مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر: ۳۰، بھٹکل، کرناٹک ۵۸۱۳۲۰

ناشر

معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل

پوسٹ بکس نمبر ۱۳ بھٹکل ۵۸۱۳۲۰، کرناٹک۔انڈیا

فہرست کتاب

موضوع	صفحہ	موضوع	صفحہ
کتاب النکاح		رجوع کے مسائل	
نکاح کے ارکان اور قسمیں		ایلاء کے مسائل	
باطل نکاحوں کا بیان		ظہار کے مسائل	
مکروہ نکاحوں کا بیان		لِعان کے مسائل	
غلام کے لیے بیویوں اور طلاق کی جائز مقدار		عدت اور استبرائے رحم کے مسائل	
نکاح فسخ کرنے کے عیوب		رضاعت کے مسائل	
اسلام لانے کا نکاح پر اثر		نان نفقہ کے مسائل	
آزاد کردہ باندی کو اختیار		حضانت و پرورش کے مسائل	
حائضہ سے اگلی شرمگاہ میں جماع کا حکم		**کتاب الجهاد**	
والدین کو پاک دامن بنانے کا حکم		جہاد کی قسمیں اور احکام	
کتاب الصداق (مهر)		باغیوں کے احکام ومسائل	
خلع جس میں مہر مثل واجب ہوتا ہے		**کتاب السیر**	
نصف مہر مثل واجب کرنے والی رضاعت		مالِ غنیمت کے احکام	
حق متعہ		جزیہ اور ذمیوں کے بعض احکام	
ولیمہ		صلح کے مسائل	
تقسیم اور نافرمانی کے مسائل		خراج کے مسائل	
خلع کے احکام		مسابقہ اور تیر اندازی کے مسائل	
کتاب الطلاق		**کتاب الحدود**	
طلاق کی قسمیں		چوری کے احکام	

موضوع	صفحہ	موضوع	صفحہ
ڈاکہ کے احکام		تقسیم کے مسائل	
صیال اور جانوروں کی ضمانت کے احکام		گواہی	
کتاب الجنایات		دعوی اور بینات	
جرائم کے مسائل		آزاد کرنے کے مسائل	
قتل واجب کرنے والے امور		مدبر بنانے کے احکام	
غلاموں پر جرم کرنے کے مسائل		ام ولد کے مسائل	
جرائم میں شرکت کے مسائل		مبعض غلام باندی کے مسائل	
جان سے کم درجہ کے جرائم		قرعہ	
قصاص کے مسائل		اندھے کے احکام	
دیت کے مسائل		غلاموں کی اولاد کے احکام	
عاقلہ سے مراد		اختتام	
حادثات اور ایکسیڈنٹ کے مسائل		مراجع	
جنین کے خلاف جرائم			
دیت مغلظہ اور مخففہ			
قسامہ			
جادو سے قتل کے مسائل			
مرتد کے احکام			
نشہ آور کے احکام			
مجبور کرنے کے مسائل			
کتاب الأیمان والنذور			
قسموں کا بیان			
نذر			
کتاب الأحکام والذبائح			
قربانی کے مسائل			
عقیقہ کے مسائل			
قاضی کے آداب			

نکاح

(شادی بیاہ کے مسائل)

نکاح کے لغوی معنی: ملانے اور جمع کرنے کے ہیں، جب درختوں کی ٹہنیاں ہواؤں کی وجہ سے ایک دوسرے سے مل جائیں تو عربی میں ''تَنَاکَحَتِ الْأَشْجَارُ'' کہا جاتا ہے۔
(المصباح المنیر ۴:۳۲۱)

نکاح کے شرعی اور اصطلاحی معنی

ایسا عقد جس سے لفظ ''اِنکاح'' (نکاح کرانا) یا ''تزویج'' (شادی کرانا) یا اس کے ترجمہ سے جماع جائز ہو جاتا ہے۔ (مغنی المحتاج ۴:۳۰۹)

عرب لفظ نکاح کا استعمال کبھی جماع کے معنی میں کرتے ہیں اور کبھی عقدِ نکاح کے معنی میں، شوافع فقہاء کے نزدیک لفظِ نکاح کا حقیقتاً اطلاق عقدِ نکاح (شادی کے عقد) پر ہوتا ہے اور مجازاً جماع کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ (مسلکِ شافعی میں یہ سب سے صحیح قول ہے۔ شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں یہی کہا ہے ۴:۳۰۹۔ اور ماوردی نے ''الحاوی الکبیر'' ۹:۷ میں یہی لکھا ہے)

نکاح کے فوائد

نکاح سے نسل کی حفاظت ہوتی ہے، اس میں اضافہ ہوتا ہے، ایسی طاقت کو جسم سے باہر نکالا جاتا ہے کہ اگر اس کو روکا جائے تو نقصان دہ ہو سکتی ہے، مکمل لذت حاصل ہوتی ہے، یہی وہ لذت ہے جو جنتیوں کے نکاح کا مقصد ہے، جب کہ جنتیوں کے نکاح میں بچے نہیں ہوں گے۔ نکاح آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جاری واحد طریقہ اور شریعت ہے،

دین حنیف اسلام نے اس کی ترغیب دی ہے اور نکاح کا سلسلہ جنت میں بھی جاری رہے گا۔ (امام غزالی نے نکاح کے فوائد اور مقاصد شریعت سے اس کی مطابقت اور موافقت کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''احیاء العلوم الدین'' میں تحریر کیا ہے ۲:۲۸)

قرآن کریم میں جماع اور مباشرت کے معنی میں لفظِ نکاح استعمال ہوا ہے، فرمان الٰہی ہے: ''فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ '' (بقرہ ۲۳۰) پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو وہ عورت اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے سے جماع نہ کر لے۔

اس آیت میں لفظِ نکاح سے مقصود جماع ہے، کیوں کہ جس عورت کو تین طلاق دی گئی ہو تو طلاق دینے والے کے لیے وہ عورت اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی دوسرا مرد اس عورت کے ساتھ عقدِ صحیح کے بعد جماع کر کے طلاق نہ دے اور اس کی عدت گزر نہ جائے، اس کے بعد ہی وہ عورت پہلے شوہر کے لیے عقدِ جدید (نئے نکاح) کے بعد حلال ہو جاتی ہے، کیوں کہ تین طلاق کے بعد دوسرے شوہر کی طرف سے جماع کرنا واجب اور ضروری ہے۔
(بغوی نے ''معالم التنزیل'' ۱:۲۷۳ میں اور ابن عربی نے ''أحکام القرآن'' ۱:۱۹۸ میں یہی تفسیر کی ہے)

امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ اس عورت سے آپ نے فرمایا جس کو پہلے شوہر نے تین طلاق دی پھر اس نے دوسرے مرد سے شادی کی اور اس کو طلاق ہوئی پھر اس عورت نے اپنے پہلے شوہر سے رجوع کرنا چاہا جب کہ دوسرے شوہر نے اس کے ساتھ ابھی جماع نہیں کیا تھا: ''نہیں، یہاں تک کہ تم اس کا مزا چکھ لو اور وہ تمھارا مزا چکھ لے''۔ (صحیح بخاری: کتاب الطلاق، باب اذا طلقها ثلاثا ۵۰۱۴، صحیح مسلم؛ کتاب النکاح، باب لاتحل المطلقة ثلاثا لمطلقها حتی تنکح زوجا غیرہ ۲۶۶۵، دونوں نے یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کی ہے، اس حدیث میں جس عورت کا تذکرہ ہے وہ رفاعہ قرظی کی بیوی ہے)

مذکورہ بالا آیت میں لفظ نکاح جماع کے معنی میں آیا ہے تو دسیوں مرتبہ عقدِ نکاح کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ

الْكِتَابُ أَجَلَهُ ''(بقرہ ۲۳۵)اوراس وقت تک عقدِ نکاح کا ارادہ نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہوجائے۔

نکاح کے ارکان پانچ ہیں:

شوہر، بیوی، ولی، دو گواہ اور صیغہ یعنی ایجاب وقبول، یعنی بیوی کے ولی کی طرف سے ایجاب اور شوہر کی طرف سے قبول۔

نکاح مشروع ہونے کی دلیل بہت سی آیاتِ قرآنی ہیں مثلاً اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:''فَانْكِحُوْ ا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ ''(نساء:۳) پس نکاح کرو ان سے جو تمہیں عورتوں میں سے پسند آئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اے نوجوانو! جو تم میں سے طاقت رکھتا ہو تو شادی کر لے''۔ یہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداوٗد، ترمذی اور نسائی نے روایت کی ہے، مکمل حدیث یہ ہے ؛ اور جو طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ روزہ رکھے، کیوں کہ روزہ اس کے لیے ڈھال ہے''۔

(بخاری کتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف علی نفسہ العزبۃ ۱۸۱۹، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ الیہ ۵۰۶۵، صحیح مسلم : کتاب النکاح باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ الیہ ۱۴۰۰، سنن ابی داوٗد : کتاب النکاح، باب التحریض علی النکاح ۲۰۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''چار چیزیں رسولوں کی سنتوں میں سے ہیں: ''حیاء، عطر لگانا، مسواک کرنا اور شادی کرنا''۔ امام احمد اور امام ترمذی وغیرہ نے یہ روایت کی ہے۔

(مسند امام احمد ۲۳۵۸۱، ترمذی: کتاب النکاح: باب ماجاء فی فضل التزویج ۱۰۸۰، مصنف عبدالرزاق ۱۰۳۹۰، المعجم الکبیر طبرانی ۴۸۰۵۔ اس کی سند ضعیف ہے کیوں کہ اس میں حجاج بن ارطاۃ ہے جو قوی نہیں ہے اور وہ مدلس ہے اور انہوں نے عن فلان عن فلان سے روایت کی ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تین لوگوں کی مدد کرنا اللہ پر حق ہے: مکاتب (وہ غلام جس نے اپنی غلامی کو اپنے آقا سے خرید لیا ہو) جو ادا کرنا چاہتا ہو، وہ نکاح کرنے والا

جو پاکدامنی چاہتا ہو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا''۔ ترمذی اور بزار نے یہ روایت کی ہے۔ (ترمذی: کتاب الجہاد، باب ماجاء فی المجاہر والناکح ۱۶۵۵، بزار: ۸۵۰۰، یہ روایت ابوہریرہؓ سے ہے)

نکاح کی تین قسمیں ہیں:

حرام، مکروہ، اور حلال۔

۱۔ حرام نکاح: سبھی قریبی رشتہ دار عورتیں حرام ہیں سوائے چچازاد، پھوپی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنوں کے، یعنی چچازاد بھائی کی شادی چچازاد بہن سے، پھوپی زاد بھائی کی شادی خالہ زاد بہن سے، پھوپی زاد بہن کی شادی خالہ زاد بھائی کے ساتھ، ماموں زاد بہن کی شادی خالہ زاد بھائی کے ساتھ اور خالہ زاد بھائی کی شادی ماموں زاد بہن کے ساتھ جائز اور حلال ہے۔

۲۔ مکروہ نکاح: مثلاً کسی دوسرے شخص کی مخطوبہ (منگیتر) کے ساتھ شادی، اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

۳۔ حلال نکاح: یہ کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مندوب ومستحب اور کبھی جائز، حلال نکاح وہ ہے جو نہ حرام ہو اور نہ مکروہ۔

نکاح یا تو صحیح ہوتا ہے یا فاسد:

صحیح نکاح وہ ہے جو شریعتِ اسلامی کے مطابق ہو اور فاسد نکاح وہ ہے جو شریعتِ اسلامی کے مطابق نہ ہو، مثلاً کسی عورت کے ساتھ دوسرے مرد کی عدت کی موجودگی میں شادی کرنا، یا دو بہنوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں شادی کرنا، یا غلطی ہونے کا امکان ہو مثلاً اس کی ایک بہن گاؤں کی پچاس لڑکیوں میں ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ اس کی بہن کون ہے، تو وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کرسکتا ہے، پہلے اس کو معلوم کرنا پڑے گا کہ اس کی بہن کون ہے۔ (یہ دو اقوال میں صحیح قول ہے، یہ اس وقت ہے جب تعداد کم ہو، اگر تعداد زیادہ ہو تو مجہول کو معدوم کے حکم میں مانا جائے گا یعنی وہ گاؤں کی کسی بھی لڑکی کے ساتھ شادی کرسکتا ہے، ابن رجب حنبلی نے ''القواعد الفقہیۃ'' میں لکھا ہے ۲۲۹: جب کسی کی بہن شہر کی عورتوں کے ساتھ مل جائے اور کون بہن ہے معلوم نہ ہو تو وہ وہاں کی عورتوں سے شادی کرسکتا ہے اور دو میں سے صحیح قول کے مطابق اس سلسلہ میں تلاش وجستجو کرنا ضروری نہیں ہے)

جب عقدِ نکاح میں کوئی خلل پایا جائے تو نکاح فاسد ہو جاتا ہے مثلاً دو علاتی بھائی اپنی بہن کا نکاح الگ الگ مردوں سے کر دیں اور معلوم نہ ہو کہ کون سا عقد پہلے ہوا ہے تو اس صورت میں دونوں عقد باطل ہو جاتے ہیں۔

عین حرام نکاح: مثلاً نسب کی طرف سے حرام ہو مثلاً محرم عورتوں کے ساتھ نکاح، یا رضاعت کی وجہ سے مثلاً رضاعی بہن کے ساتھ نکاح، یا مصاہرت (سسرالی رشتہ داری) کی وجہ سے ہو مثلاً باپ کی بیوی کے ساتھ، اسی طرح بیٹے کی بیوی کے ساتھ نکاح، یہ سب حرام نکاح کی شکلیں ہیں اور یہ سب نکاح باطل بھی ہیں۔

نسب کی وجہ سے محرم بننے والی عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہیں اور ان کا نکاح باطل شمار ہوتا ہے، وہ عورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

ماں، بیٹی، بہن، پھوپی، خالہ، بھتیجی، بھانجی؛ یہ سات عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں، ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اور رضاعت کی وجہ سے بھی، یعنی رضاعی ماں، رضاعی بیٹی، رضاعی بہن، رضاعی پھوپی، رضاعی خالہ، رضاعی بھتیجی اور رضاعی بھانجی کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔

نسب کی وجہ سے محرم بننے والی عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''**حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ**'' (نساء۲۳) تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں۔

رضاعت کی وجہ سے محرم بننے والی عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''**وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ**'' (نساء۲۳) اور تمہاری مائیں ہیں وہ جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو نسب کی وجہ سے حرام ہے وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہے''۔ (صحیح بخاری: کتاب الشہادات، باب الشہادۃ علی الانساب ۲۶۴۵، صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب تحریم الرضاعۃ من ماء الفحل ۱۴۴۷)

مصاہرت کی وجہ سے مندرجہ ذیل عورتیں حرام ہو جاتی ہیں:

باپ کی بیوی؛ اوپر تک، بیٹے کی بیوی (بہو) نیچے تک، بیوی کی ماں؛ اوپر تک، یہ سب عورتیں صرف عقدِ نکاح سے ہی حرام ہو جاتی ہیں، بیوی کی بیٹی؛ نیچے تک حرام ہو جاتی ہیں جب اس کی ماں کے ساتھ جماع کیا جائے، مصاہرت کی وجہ سے عورت پر مندرجہ ذیل مرد حرام ہو جاتے ہیں: ماں کا شوہر؛ اوپر تک، جب اس کی ماں کے ساتھ جماع کرے، داماد؛ نیچے تک، شوہر کا باپ (سسر) اوپر تک، شوہر کا بیٹا؛ نیچے تک، یہ تینوں مرد صرف عقد کرنے سے ہی حرام ہو جاتے ہیں۔

مصاہرت کی وجہ سے نکاح صرف عقد کرنے سے ہی حرام ہو جاتا ہے، چاہے لڑکی کے ساتھ ابھی جماع نہ کیا گیا ہو، جب کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے اور جماع کرنے سے پہلے اس کو طلاق دے یا اس کا انتقال ہو جائے تو وہ عورت اس شخص کے بیٹوں اور پوتوں و نواسوں پر حرام ہو جاتی ہے، جب کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرلے اور اس سے جماع کرنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے تو وہ عورت اس کے باپ اور داداؤں و ناناؤں پر حرام ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرلے اور اس کو طلاق دے اور اس کے ساتھ جماع بھی نہ کیا ہو تو اس شخص پر اس عورت کی ماں اور نانی سے شادی کرنا حرام ہے؛ اوپر تک، اسی طرح اگر کوئی کسی عورت سے شادی کرے اور اس کو طلاق دے اور اس سے جماع کر چکا ہو تو اس کی بیٹی سے شادی کرنا اس پر حرام ہے، اگر جماع کرنے سے پہلے اس کو طلاق دے تو اس کی بیٹی سے شادی کرنا اس کے لئے حلال ہے، مندرجہ بالا عورتوں کے حرام ہونے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''**وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ**'' (نساء۲۲) اور ان سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو۔

''**وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ**'' (نساء۲۳) اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہارے اولاد کی بیویاں۔

ان افراد کے ساتھ شادی کرنے کی حرمت کا تذکرہ سورہ نساء کی ۲۲ تا ۲۵ آیات میں کیا گیا ہے، مؤلف کی کتاب ''**صفوۃ العرفان**'' میں ان آیتوں کی مکمل تفسیر کے لیے رجوع کیا جائے، اسی طرح ''**الفلاح بالنکاح**'' اور ''**النجاح فی النکاح**'' کی طرف بھی

نکاح کے تفصیلی احکام جاننے کے لیے رجوع کیا جائے۔

جمع کرنے کی وجہ سے جو نکاح حرام ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص دو بہنوں کے ساتھ ایک ہی ساتھ شادی کرے جیسا کہ اللہ تبارک تعالی کے اس فرمان میں ہے: ''**وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ**'' (نساء۲۳) اور یہ (جائز نہیں ہے) کہ تم دو بہنوں کو (نکاح میں ایک ساتھ) جمع کرو، مگر جو گزر چکا ہے۔

اسی طرح عورت اور اس کی پھوپی، یا عورت اور اس کی خالہ کے ساتھ ایک ہی ساتھ شادی کرنا حرام ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''عورت اور اس کی پھوپی کے درمیان جمع نہیں کیا جائے گا اور نہ عورت اور اس کی خالہ کے درمیان''۔ (بخاری: کتاب النکاح، باب لاتنکح المرأۃ علی عمتھا او خالتھا فی النکاح ۱۴۰۸، یہ روایت ابو ہریرہؓ سے ہے)

امام نووی نے اس روایت سے وجہِ استدلال کو واضح کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: یہ سبھی علماء کے مسالک کی دلیل ہے کہ عورت اور اس کی پھوپی کو اور عورت اور اس کی خالہ کو جمع کرنا حرام ہے، چاہے پھوپی اور خالہ حقیقی ہو یعنی باپ کی بہن اور ماں کی بہن، یا مجازی ہو یعنی دادا کی بہن؛ اوپر تک، یا نانی کی بہن ہو یا پرنانا کی بہن، اسی طرح دادی یا پردادی کی بہن؛ اوپر تک، علماء کے اجماع کی وجہ سے ان عورتوں کے درمیان جمع کرنا حرام ہے۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم ۵/۲۰۷)

جن عورتوں کے ساتھ ابدی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نکاح کرنا حرام ہے ان کی تعداد ۲۶ ہے، اس کی تفصیلات میری کتابوں ''**الفلاح بالنکاح**'' اور ''**النجاح فی النکاح**'' میں بیان کی گئی ہیں۔

آزاد مرد کے لیے دو باندیوں کو ایک ہی وقت میں نکاح میں رکھنا صحیح نہیں ہے، یہ اس وقت ہے جب اس شخص کے پاس لطف اندوزی کے لائق کوئی آزاد بیوی ہو، اگر آزاد بیوی لطف اندوزی کے لائق نہ ہو تو اس شخص کے لیے دو باندیوں سے ایک ہی ساتھ نکاح کرنا جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس باندی کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہو۔

کوئی مرد اپنے نکاح میں چار سے زائد عورتیں نہیں رکھ سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

غیلان ثقفی کو حکم دیا کہ چار بیویوں کا انتخاب کریں، ان کی دس بیویاں تھیں، آپ نے فرمایا: ''تم اپنے پاس چار کو روکے رکھو اور باقی سبھوں کو چھوڑ دو''۔ یہ روایت ابن حبان وغیرہ نے کی ہے اور انہوں نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحیح ابن حبان: کتاب الحج، باب الہدی، ذکر الخیر المحض ۴۲۱۸، المستدرک علی الصحیحین، حاکم: کتاب النکاح ۲/۱۵، مؤطا مالک: کتاب الطلاق، باب جامع الطلاق ۱۲۲۸)

اسلام قبول کرتے وقت بنی ثقیف کے چھ لوگوں کی دس دس بیویاں تھیں، وہ افراد مندرجہ ذیل ہیں: غیلان، مسعود بن عامر، مسعود بن عمرو، عروہ بن مسعود، سفیان بن عبداللہ، ان میں سے ہر ایک نے چار بیویاں اپنے ساتھ رکھی اور باقی کو طلاق دے دیا۔

غلام کے لیے دو سے زیادہ بیویاں رکھنا صحیح نہیں ہے، بیہقی نے لیث بن حکم بن عتبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا اس بات پر اجماع ہے کہ غلام دو سے زیادہ شادی نہ کرے۔ (السنن الکبری: کتاب النکاح، باب نکاح العبد بغیر اذن مالکہ ۷/۱۵۸)

جب کسی شخص کی محرم عورتوں میں سے کوئی عورتوں کی اتنی تعداد کے ساتھ مل جائے کہ اس تعداد کو ایک ہی نظر میں اندازہ سے معلوم کرنا ممکن ہو، فقہاء نے اس کو سو سے تین سو تک مقرر کیا ہے تو اس کے لیے اس گاؤں کی کسی بھی عورت سے شادی کرنا صحیح نہیں ہے، اگر ان میں سے وہ اپنی محرم کو پہچان لے تو پھر دوسری عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے، اگر تعداد میں ایک ہزار تک اضافہ ہو جائے تو محرم کی تحقیق کرنا دشوار ہونے کی وجہ سے حرمت باقی نہیں رہتی ہے۔ (اس مسئلہ کی طرف تھوڑی دیر قبل ہی اشارہ کیا گیا ہے)

محصور تعداد جس کو ایک ہی نظر میں شمار کرنا ممکن ہوتا ہے وہ دو سو اور تین سو ہے اور غیر محصور وہ تعداد ہے جس کو ایک ہی نگاہ میں شمار کرنا ممکن نہ ہو مثلاً ایک ہزار عورتیں۔

وہ نکاح جو عقد میں کسی کمی کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے اور وہ نکاح باطل بھی ہو جاتا ہے مندرجہ ذیل ہیں: نکاح شغار، نکاح متعہ، حج اور عمرہ کا احرام باندھنے والے کا نکاح، ایک ہی عورت کے ولی دو الگ الگ مردوں سے نکاح کرا دیں اور معلوم نہ ہو کہ کون سا نکاح پہلے ہوا ہے، عدت گذارنے والی عورت سے نکاح، اس باندی سے نکاح جس کا ابھی استبراء رحم نہ ہوا ہو، مثلاً کوئی

شخص باندی خریدے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ باندی ایک حیض آنے تک انتظار کرے تاکہ یہ بات معلوم ہوجائے کہ اس کے رحم مادر میں پہلے والے مالک کا بچہ نہیں ہے،اگر وہ باندی نابالغ ہو یاسنِ یاس کو پہنچ گئی ہوتو اس کی خریداری پر ایک ماہ گذرنا واجب ہے۔

اس عورت کا نکاح بھی باطل ہوجاتا ہے جس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو، غیر اہل کتاب کافرہ سے نکاح مثلاً مجوسی یا ہندو عورت کے ساتھ،اسی طرح اپنی باندی سے نکاح کرنے سے باطل ہوجاتا ہے،نکاح کی یہ سب مذکورہ قسمیں باطل ہیں۔

نکاح شغار:

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح شغار سے منع فرمایا ہے۔امام احمد نے اپنی مسند میں یہ روایت کی ہے ۴۵۲۶، بخاری: کتاب النکاح،باب الشغار ۵۱۱۲، مسلم: کتاب النکاح،باب تحریم نکاح الشغار و بطلانہ ۱۴۱۵، یہ روایت ابن عمرؓ سے ہے)

یہ ''نکاح الکلاب'' سے بھی مشہور ہے، کیوں کہ ''شغار'' کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں، یہ عربوں کے قول ''شَغَرَ الْکَلْبُ'' سے ماخوذ ہے،اس کے معنی یہ ہے کہ کتے نے پیشاب کرنے کے لیے اپنا پیر اٹھایا،اس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بہن کی شادی کسی کے ساتھ اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بہن کی شادی اس سے کرائے گا اوران میں سے ہر ایک دوسرے کا مہر معاف کردے گا،اس طرح کا نکاح باطل اور حرام ہے۔(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: شرح النووی علی صحیح مسلم ۲۱۷/۵)

نکاح متعہ

یہ وہ نکاح ہے جس کی مدت متعین ہو، یہ کبھی ایک دن کے لیے ہوتا ہے یا ہفتہ یا ماہ یا سال کے لیے، یہ اجنبی نکاح ہے جس میں نہ کوئی نفقہ ہوتا ہے اور نہ عدت ہوتی ہے،اور نہ اس نکاح میں ولی کی شرط ہے اور نہ گواہوں کی ،اس میں صرف مدت متعین رہتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے جیسا کہ صحیح مسلم اور صحیح بخاری وغیرہ کی روایتوں میں ہے۔(صحیح بخاری: کتاب النکاح،باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعۃ ۲۵۹۰، یہ روایت حضرت علیؓ سے ہے)

حج اور عمرہ کا احرام پہننے والے کا نکاح حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''محرم نہ

نکاح کرے اور نہ نکاح کرائے''۔ یہ روایت امام مسلم نے کی ہے۔(صحیح مسلم: کتاب النکاح،باب تحریم نکاح المحرم ۱۴۰۹، ۲۶۰۱، دیکھا جائے: التہذیب۔بغوی ۴۵۰/۵،اس میں مزید وضاحت اور فائدہ ہے)

دو ولی ایک عورت کا نکاح کرائیں تو بھی نکاح باطل ہوجاتا ہے،البتہ اگر وہی شخص اس عورت سے شادی کرے جس کی وہ عدت گذار رہی ہو تو یہ عقد صحیح ہوجاتا ہے ، مثلاً کوئی عورت اپنے شوہر سے خلع لے یا اس کو عوض دے کر طلاق دیا جائے تو اس صورت میں اگر عورت راضی ہوجائے اور طلاق دینے والا بھی اس کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو وہ عورت کے ولی کی اجازت سے نیا عقد کرے گا اور وہ دوسری مرتبہ میاں بیوی بن جائیں گے۔

استبرائے رحم کرنے والی باندی کا نکاح بھی باطل ہوجاتا ہے، یہ وہ مدت ہے جو آزاد عورت کے لیے عدت کہی جاتی ہے اور باندی کے لیے استبراء کہلاتی ہے،ان دونوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ نسب کے خلط ملط سے بچنے کی ضمانت اور گیارنٹی کے لیے عورت کا مادرِ رحم کسی بھی جنین سے خالی ہونے کی تاکید ہو اور بچہ اپنے والد کے علاوہ دوسرے شخص کی طرف منسوب نہ ہو، اگر کوئی شخص اپنی باندی کو آزاد کردے تو اس باندی کے لیے شادی کرنے سے پہلے اپنے استبرائے رحم کی مقررہ مدت تک انتظار کرنا ضروری ہے، اگر اسی کا مالک اس کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو پھر استبراء کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر دوسرے کسی شخص سے استبرائے رحم کے بغیر شادی کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔(اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ہوازن کے لوگوں کو قید کرنے کے دن صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا؛ حاملہ کے ساتھ جماع نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو بچہ ہوجائے اور نہ غیر حاملہ کے ساتھ یہاں تک کہ اس کو حیض آجائے ۔مصنف ابن ابی شیبہ ۴۳۷/۳، السنن الکبری بیہقی ۱۲۴/۹)

اگر کسی عورت کو حاملہ ہونے کا شک ہو تو اس کا نکاح باطل ہے، مثلاً اس کو اپنے رحم کے اندر بھاری پن اور حرکت کا احساس ہونے لگے، اس صورت میں اس پر ضروری ہے کہ وہ شک ختم ہونے تک صبر کرلے، اگر عدت کے دوران عورت کو شک نہ ہو اور عدت گزر جائے پھر اس کے بعد اس کو شک ہوجائے تو اس شک کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور اس کا نکاح صحیح ہے۔

غیر اہل کتاب کافرہ سے نکاح باطل ہے:

مسلمان پر غیر اہل کتاب کافرہ کے ساتھ شادی کرنا حرام ہے، مثلاً مجوسی اور بتوں کی پوجا کرنے والی عورت، اگر کوئی مسلمان اس سے شادی کرلے تو اس کا نکاح باطل ہے۔

مسلمان کے لیے یہودی یا نصرانی عورت سے اس شرط کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے کہ اسلام سے پہلے اس کے آباء واجداد نصرانیت یا یہودیت پر رہے ہوں۔ (کیوں کہ اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُو االْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ'' مائدہ ۵۔ اوران لوگوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے، اور پاک دامن مومن عورتیں اور اہل کتاب پاک دامن عورتیں))

اپنی باندی کے ساتھ نکاح باطل ہوتا ہے:

کسی شخص کے لیے اپنی ملکیت میں موجود باندی سے عقدِ نکاح کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اپنی باندی پر نہ طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ ظہار اور نہ ایلاء، وہ نکاح ہی نہیں ہوتا جس میں طلاق نہ ہو۔

جنیہ (پری) کے ساتھ نکاح کا حکم:

''الحواشی'' میں ہے کہ جنیہ کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے جب اس بات کی تاکید ہوجائے کہ وہ کسی مخصوص علامت کی وجہ سے اس کی بیوی بن گئی ہے اور اس کے نکاح میں نکاح کی سبھی شرطیں پائی جائیں، وہ بیوی کے حکم میں ہوگی اور اس کو چھونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ (بجیرمی نے اپنی کتاب ''الحاشیۃ'' میں یہی بات کہی ہے ۱۶۴/۴، جب کہ ابن حجر ہیتمی نے انسانوں اور جنات کے درمیان شادی بیاہ کو حرام قرار دیا ہے اور اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے:
''جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً'' (نحل ۷۲) اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں بنائی)

یہ باطل نکاح کی شکلیں ہیں، یہ کل نو قسمیں ہیں، نکاح شغار سے لے کر باندی کے ساتھ نکاح کی تمام قسمیں باطل اور حرام ہیں۔

مکروہ نکاح: مثلاً اس عورت کے ساتھ نکاح جس کو دوسرے شخص نے پیغام دیا ہو اور اس کا پیغام قبول بھی کیا جا چکا ہو، کیوں کہ اس میں دوسرے شخص کو تکلیف پہنچانا ہے اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی کا سبب بننا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری: کتاب النکاح، باب لاتخطب علی خطبۃ اخیہ حتی ینکح اویدع ۵۱۴۲، مسلم: کتاب النکاح، باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ اخیہ حتی یاذن اویترک ۱۴۱۲، یہ روایت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے)

محلل کا نکاح: ایسی عورت کے ساتھ عقد کرنا جس کو اس کے پہلے شوہر نے تین طلاق دی ہو اور اس شادی کا مقصد اس کو پہلے شوہر کے لیے حلال کرنا ہو، مکروہ اس وقت ہے جب یہ شرط عقد کے وقت صراحۃً نہ بیان کی گئی ہو، اگر عقد میں یہ شرط صراحۃً بیان کی جائے تو یہ عقد باطل ہوجاتا ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اللہ نے محلل (حلالہ کرنے والے) اور محلل لہ (جس کے لیے حلال کیا جائے) پر لعنت کی ہے''۔ (ترمذی: کتاب النکاح، باب المحلل والمحلل لہ ۱۱۳۰، نسائی: کتاب النکاح، باب احلال المطلقۃ ثلاثا ۱۴۹/۶، یہ روایت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے)

نکاح غَرور:

یہ وہ نکاح ہے جو دھوکہ پر مبنی ہوتا ہے، مثلاً کسی شخص سے کہا جائے کہ وہ جس عورت کے ساتھ شادی کر رہا ہے وہ آزاد ہے، جب کہ وہ باندی ہو، یا کہا جائے کہ وہ عورت مسلمان ہے جب کہ وہ اہل کتاب ہو، اس عقد کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شوہر نے اس عورت کے بارے میں تحقیق کرنے میں کوتاہی کی جس کے ساتھ وہ شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، یہ اس حیثیت سے حرام عمل ہے کہ اس میں شوہر کو تکلیف پہنچائی گئی ہے، چاہے شوہر عقد سے پہلے دھوکہ کھا جائے یا عقد کے بعد، لیکن ہر حال میں یہ صحیح عقد ہے۔

ذمی عورت کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ ذمی عورت کافرہ ہے جو دار اِسلام میں رہتی ہے، اور کافر اللہ سبحانہ وتعالی کے دشمن ہیں، مسلمانوں کے مفاد میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایک ہی گھر میں اللہ کے دشمنوں کے ساتھ رہیں، جب کہ اس طرح کی شادی میں اولاد کے مستقبل پر بھی خطرات رہتے ہیں۔

حربیہ (دارالحرب میں رہنے والی یہودیہ یا نصرانیہ) کے ساتھ نکاح کرنا ذمیہ سے نکاح کرنے سے بدتر ہے، یہ وہ کافرعورت ہے جس کے ملک کے خلاف مسلمان جنگ کررہے ہوں، شیخ الاسلام زکریاؒ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ وہ طہارت کی حالت میں نہیں رہتی ہے اور بچے کو غلام بنائے جانے کا بھی اندیشہ اور خوف ہے اور اس میں جنگجوؤں کی تعداد کو بڑھانا بھی ہے۔ (اسنی المطالب ۳/۱۶۱)

ایسی عورت کے ساتھ نکاح جو بیمار ہو:

ایسی بیمار عورت کے ساتھ شادی کرنا مکروہ ہے جس کا علاج دشوار ہو، کیوں کہ شادی کا مقصد شوہر کو خوش بخت رکھنا اور سعادت پہنچانا ہے اور دائم المرض عورت سے شادی کرنے سے خود شوہر کو اس کی مسلسل تیمارداری کرنی پڑے گی جس سے شوہر کی راحت اور خوش بختی ختم ہوجائے گی، اگر بیماری متعدی ہو (اللہ اس سے محفوظ رکھے) تو وہ بیماری شوہر اور بچوں میں بھی منتقل ہوسکتی ہے۔

فاسق وفاجر عورت کے ساتھ شادی:

فاسق عورت کے ساتھ شادی کرنا مکروہ ہے، فاسق مسلم عورت کے ساتھ شادی کرنا پاکدامن کافرہ اہل کتاب سے شادی کرنے سے بدتر ہے، کیوں کہ شوہر اس کے محفوظ ہونے پر ہرگز مطمئن نہیں رہ سکتا ہے اور وہ ہروقت اس کی حفاظت میں مشغول رہے گا، جس کے نتیجے میں اس کو خوشگوار زندگی اور راحت نصیب نہیں ہوگی۔

فاسق کی لڑکی سے شادی:

فاسق شخص کی لڑکی سے بھی شادی کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ لڑکی کو اپنے والد کے اخلاق وراثت میں ملتے ہیں، جس گھر میں فاسق عورت یا فاسق شوہر ہو تو اس گھر میں نہ دنیا کی خوش بختی کا کوئی حصہ رہتا ہے اور نہ آخرت کی نعمتوں کا کوئی حصہ۔

حلال نکاح:

اس کی تین قسمیں ہیں: واجب نکاح، مندوب نکاح اور مباح نکاح۔

۱۔ واجب نکاح: اگر کسی کو شادی نہ کرنے کی صورت میں خود کے گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو ایسے شخص کے لیے نکاح واجب ہوجاتا ہے، تاکہ وہ خود کو زنا سے محفوظ رکھے اور گناہ میں پڑنے سے بچ جائے۔

۲۔ مندوب نکاح: جس کو شدت سے جماع کی خواہش ہو اور اس کے پاس بیوی کا مہر اور ضروری نفقہ موجود ہو تو اس صورت میں اس کو شادی کرنا سنت ہے تاکہ وہ اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو پاک دامن رکھے اور نیک اولاد پیدا ہوں۔

فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کی عادت رہی ہے کہ نکاح کے باب میں خاتم النبیین کی خصوصیات اور انفرادیت کو الگ سے بیان کرتے ہیں۔ (مثلاً امام بغوی نے التھذیب میں ۵/۲۱۲-۲۲۸، اور امام نووی نے روضۃ الطالبین ۶/۳ میں بیان کیا ہے) اور اس موضوع پر مخصوص کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، اس موضوع کی جامع کتابوں میں سے ایک کتاب علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی ''الخصائص الکبری'' ہے، ہم ان خصوصیات کو یہاں اختصار کے ساتھ سرسری طور پر بیان کررہے ہیں، فقہاء نے ان خصوصیات کو اس لیے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی یہ خیال نہ کرلے کہ اس میدان میں رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیوں کہ صرف آپ کو ان خصوصیات میں انفرادیت حاصل ہے، لیکن اللہ تعالی کی سب سے افضل مخلوق یعنی رسول اللہ ﷺ نے ان خصوصیات کو اپنی عظیم ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے قوت حاصل کرنے کے طور پر استعمال کیا، جب کہ یہ ذمہ داریاں انسانی طاقت سے بڑھی ہوئی ہیں، اس کے باوجود ان ذمہ داریوں کو آپ نے اٹھایا۔

ان خصوصیات کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ مباحات

۲۔ محرمات

۳۔واجبات

۴۔فضائل۔(یہی تقسیم علامہ سیوطی نے ''الخصائص الکبری'' میں کی ہے۲/۲۲۹)

ا۔مباحات

صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بات حلال کی گئی کہ آپ ولی اور گواہوں کے بغیر شادی کرلیں، آپ نے ایسا کبھی نہیں کیا، اللہ تبارک وتعالی نے آپ کے لیے ہر اس عورت سے شادی کرنا حلال کیا جو خود کو آپ کے لیے ہبہ کردے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخصت سے بھی کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، اسی طرح آپ کے لیے ایجاب وقبول کرنے کی اجازت دی گئی، آپ نے اس رخصت سے بھی کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔(سیوطی نے الخصائص الکبری میں ۲/۲۴۵ بیہقی کی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جوانہوں نے ''السنن الکبری'' سے نقل کیا ہے، انہوں نے کہا: ولی، گواہوں اور مہر کے بغیر نکاح نہیں سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے)

اسی طرح چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنے کی آپ کو اجازت ہے، یہ بات معروف ومشہور ہے کہ ان میں سے اکثر شادیاں آپ نے ان عورتوں کی دل جوئی اور حفاظت کے لیے کی جن کے شوہر اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے تھے، اس کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ ان عورتوں کے بچے آپ ہی کی توجہ اور دیکھ ریکھ میں ہوں، یا مقصد یہ تھا کہ عرب قبائل کے سرداروں کے ساتھ نسبی تعلقات قائم کئے جائیں، اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان کے قبائل میں آپ نے ان میں اسلام کی نشر واشاعت کرنے کے لیے شادی کی، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ بیویاں اپنے گھر اور اپنے قبائل کی عورتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سلوک وبرتاؤ کی نشر واشاعت کا ذریعہ بن جائیں اور وہ لوگوں میں آپ کی احادیث کی روایت کریں۔

آپ نے اللہ تعالی کے حکم کی بجاآوری میں بھی نکاح کیا ہے مثلاً آپ نے منہ بولے بیٹے کی عادت ختم کرنے کے لیے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی، کیوں کہ یہ رواج عربوں میں عام تھا۔

سورہ احزاب کی ۳۶ تا ۴۰ آیات کو پڑھنے والے خصوصاً ۳۸ نمبر آیت کی تلاوت کرنے والے کو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش سے شادی کرنے کے خواہش مند نہیں

تھے، بلکہ اللہ نے آپ کو یہ شادی کرنے کا حکم دیا کہ منہ بولے بیٹے کی عادت کو ختم کیا جائے اور مسلمانوں میں منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرنے کی حرمت کا خاتمہ کیا جائے، اگر آپ کو اس شادی کے بارے میں معلوم ہوتا تو آپ زینب بنت جحش کی شادی زید رضی اللہ عنہ سے نہیں کراتے، بلکہ خود اس کے ساتھ بکارت کی حالت میں شادی کرتے۔

آپ کو روزوں میں وصال کی اجازت تھی، وصال یہ ہے کہ دن کے روزے کو رات کے ساتھ ملایا جائے اور اپنے روزے کو دوسرے دن اور اس کے بعد والے دن کے لیے جاری رکھا جائے، اسی طرح آپ مسلسل کئی دن رات کھائے پیئے بغیر روزے کو جاری رکھتے تھے۔
(آپ نے اپنے صحابہ کو وصال سے منع فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: آپ وصال کرتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ بخاری: کتاب الصوم، باب الوصال ۱۹۶۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اجازت کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کے پاس صحیح ادراک اور سمجھ ہے وہ اس بات کو جان لے کہ کس حد تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھوک اور پیاس اپنی عظیم ذمہ داریوں کے باوجود برداشت کرتے تھے، جن ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دن رات مسلسل کام کریں، جو خاتم النبیین کی سیرت مطہرہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ ہماری کتاب ''غاية المأمول فی سيرة الرسول'' کا مطالعہ کرے، اس کو آپ کی بلند ہمتی اور اللہ کے دین کی نشر واشاعت میں جہدِ مسلسل اور برداشت کی قوت کے بارے میں معلوم ہوجائے گا۔

آپ کے لیے اپنے لیے مالِ غنیمت میں سے بہترین چیزوں کو الگ کرنے کی اجازت تھی، اسی طرح آپ کے لیے جہاد میں حاصل ہوئے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ لینا حلال کیا گیا تھا تاکہ اپنے گھر والوں پر خرچ کریں اور نیک کاموں میں لگائیں، اسی طرح آپ کے لیے مالِ فیٔ کے پانچ میں سے چار حصے جائز کئے گئے، آپ نے کبھی چار حصے نہیں لیے، بلکہ آپ مالِ فیٔ کو بھی مالِ غنیمت کے ساتھ ملا دیتے تھے تاکہ یہ مال فقراء، کمزوروں اور خیر کے کاموں میں خرچ کیا جائے، ان مصارف کو اللہ تبارک تعالی نے زکاۃ کے مصارف

میں واضح کیا ہے ۔مسند احمد (۱۷۱) اور بخاری (کتاب الجہاد والسیر ۲۹۰۴) وغیرہ میں ہے کہ
حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا: بنی نضیر کا مال رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے بطور فئی عطا کیا جس
پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ پیدل حملہ کیا، اس لیے یہ رسول اللہ ﷺ کے
لیے مخصوص تھا، اس کو اپنی بیویوں پر پورا سال خرچ کرتے ، پھر باقی بچے ہوئے مال کو اللہ کی
راہ میں تیاری کی خاطر ہتھیاروں اور غلہ پر خرچ کرتے ۔آپ کے لیے جائز تھا کہ اپنے علم
کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائیں اور گواہوں یا دلیل کا مطالبہ نہ کریں، لیکن آپ
نے اس رخصت کے مطابق کبھی بھی تصرف نہیں کیا۔

آپ کے لیے یہ بھی جائز کیا گیا کہ اپنے لیے بعض جگہوں کو مخصوص کریں تاکہ آپ کے
جانور وہاں چریں، اور کسی دوسرے کو وہاں اپنے جانوروں کو چرانے کی اجازت نہ ہو، لیکن آپ
نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا۔ (دیکھا جائے: الخصائص الکبری۔ علامہ سیوطی ۲/۲۴۲، آپ کو یہ بھی خصوصیت عطا
ہوئی کہ سونے سے آپ کا وضو نہ ٹوٹے، اس کے باوجود آپ ہمیشہ باوضو رہنے کے لیے کوشاں رہتے تھے)

آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کی گالی اور لعن وملامت اُس کے حق میں
رحمت اور ثواب بن جائے جس کو آپ نے گالی دی ہو اور ملامت کی ہو، ان سب خصوصیات
کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا دل پاکیزہ اور زبان پاک تھی ، آپ کی زبان سے کبھی فحش
بات نہیں نکلی اور آپ نے کبھی بھی گالی نہیں دی یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے خصوصی
طور پر جائز امور میں سے اکثر چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

۳۔حرام امور

آپ کے لیے باندیوں سے نکاح حرام کردیا گیا، کیوں کہ باندی سے نکاح اس شخص
کے لیے حلال ہے جس کو گناہ میں پڑنے کا خطرہ ہو، اور آپ گناہ سے معصوم ہیں ۔ (دیکھا
جائے: ''التہذیب'' بغوی ۵/۲۲۲) باندی سے نکاح کرنے کی ممانعت ہر آزاد کے لیے ہے،
کیوں کہ باندی کا بچہ اس کے آقا کی ملکیت ہوتا ہے، کون شخص اپنے بچے کو باندی کے آقا کا
غلام ہونے کو قبول کرے گا؟

اسی وجہ سے اسلام نے باندی کے ساتھ صرف اس شخص کے لیے شادی کو حلال کیا ہے جس
کے پاس آزاد عورت کو دینے کے لیے مہر اور نفقہ نہ ہو اور اس کو باندی سے شادی نہ کرنے کی
صورت میں حرام کام میں پڑنے کا خطرہ ہو، البتہ باندی کا مالک اس سے لطف اندوز ہوسکتا
ہے، کیوں کہ اس کے بچے مالک کے ہی ہوں گے، جب باندی بچہ کی ماں (ام ولد) بنتی ہے تو
پھر اس کو بیچا اور خریدا نہیں جائے گا، بلکہ وہ اپنے آقا کی موت سے ہی آزاد ہوجائے گی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے لیے کافرہ سے نکاح کرنا حرام کیا گیا، کیوں کہ کافر اللہ
کا دشمن ہے اور یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کسی اللہ کے دشمن کو پناہ دیں،
رسول اللہ کا فرمان ہے کہ آپ نے اللہ سے درخواست کی کہ دنیا میں آپ کی بیویاں آخرت
میں بھی آپ کی بیویاں ہوں ۔ (ابن سعد نے الطبقات میں ۸/۲۸ عطاء بن یسار سے روایت کیا ہے کہ
نبی ﷺ نے اپنی بیویوں سے فرمایا: تم میں سے جو بھی اللہ سے ڈرے اور کوئی کھلا ہوا فحش کام نہ کرے اور اپنی
چٹائی سے چمٹی رہی وہ آخرت میں میری بیوی ہے ۔علامہ سیوطی نے الخصائص الکبری میں اس کا تذکرہ کیا ہے
۲/۲۵۱، ابن حبان نے صحیح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: کیا تم راضی نہیں ہو
کہ دنیا اور آخرت میں میری بیوی بنو۔ اس نے کہا: کیوں نہیں، اللہ کی قسم ۔آپ نے فرمایا: پھر تم دنیا آخرت
میں میری بیوی ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''التہذیب'' للبغوی ۵/۲۲۲)

اسی طرح آپ کی امت کے مردوں پر رسول اللہ کی بیویوں سے شادی کرنا حرام ہے
چاہے آپ نے اس سے جماع نہ کیا ہو، جس عورت کو رسول اللہ کے نکاح کی شرافت حاصل
ہوئی ہو اور وہ امہات المومنین میں سے بن گئی ہو تو وہ کیسے دوسرے سے شادی کرے گی!
اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''وَمَـالَـكُـمْ أَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوْا أَزْوَاجَهُ
مِـنْ بَعْـدِهٖ أَبَـداً'' (احزاب ۵۳) تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف
پہنچاؤ اور نہ یہ کہ تم آپ کے بعد کبھی آپ کی بیویوں کے ساتھ شادی کرو۔

رسول اللہ ﷺ پر اپنے لیے کسی سے صدقہ قبول کرنا حرام ہے، کیوں کہ صدقہ لوگوں
کی مال کی گندگی ہے اور صدقہ کرنے والے کا ہاتھ بلند رہتا ہے، رسول اللہ ﷺ لوگوں

کے مال کی گندگی کیسے لے سکتے ہیں یا کسی کو اس کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں کہ آپ پر اس کا ہاتھ بلند رہے۔ (رسول اللہ کا فرمان ہے: ''یہ صدقہ لوگوں کی گندگیاں ہیں اور یہ نہ محمد کے لیے حلال ہیں اور نہ آلِ محمد کے لیے''۔ مسند امام احمد ۵۱۸/۱۷، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۴۵۲۶)

رسول اللہ پر لکھنا سیکھنا اور شعر گوئی حرام ہے، آپ کا لقب نبی امی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس لیے جس نے سابقہ امتوں کی کتابوں کو نہیں پڑھا ہو تو کوئی بھی یہ دعوی کر ہی نہیں سکتا ہے کہ آپ نے ہی قرآن کریم کی تالیف کی ہے جس سے اللہ تبارک تعالی نے اپنی تمام سابقہ آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے جہاد کے لیے ذرہ پہننے کے بعد جہاد میں حاضر ہونے اور جنگ کرنے سے پہلے ذرہ اتارنا حرام کیا گیا۔ (نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: کسی نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب وہ ذرہ پہنے تو جنگ ہونے سے پہلے اتار دے۔ مسند امام احمد ۱۴۷۸۷، ابن سعد: الطبقات الکبری ۴۵/۲، سنن دارمی ۲۱۵۹، یہ روایت جابر بن عبداللہؓ سے ہے) یہ بات معلوم ہے کہ ذرہ پہننے کے بعد اتارنا خوف اور ڈر کی علامتوں میں سے ہے، رسول اللہ ﷺ جن کی تائید اللہ نے اپنی مدد و نصرت اور رہنمائی سے کی ہے کے لیے محال اور ناممکن ہے کہ آپ کوئی ایسا عمل کرے جس سے معلوم ہو جائے کہ آپ خوف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے لوگوں کے مال کی طرف نگاہ کرنے کو بھی حرام کیا گیا، اسی طرح آپ پر نگاہوں کی خیانت بھی حرام کر دی گئی ہے۔ (نبی ﷺ کا ارشاد ہے: کسی بھی نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ آنکھوں کی خیانت ہو۔ ابو داؤد: باب قتل الاسیر ۲۶۸۳، السنن الکبری للبیہقی ۴۰/۷، حاکم نے المستدرک میں اس کو صحیح کہا ہے: کتاب المغازی والسرایا ۲۳۶۰)

۳۔ واجبات

آپ پر خصوصی طور جو امور واجب اور فرض کر دئے گئے ہیں وہ مندرذیل ہیں:
(تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''التہذیب'' امام بغوی ۲۱۴/۵۔ ''الخصائص الکبری'' امام سیوطی)

۱۔ چاشت کی نماز

۲۔ وتر کی نماز

۳۔ ہر نماز سے پہلے مسواک

۴۔ اہم امور و معاملات میں اپنے صحابہ سے مشورہ طلب کرنا تاکہ امت کے قائدین آپ کی اقتدا کریں اور کوئی بھی حاکم امور و معاملات میں سے کسی بھی معاملہ میں انفرادی طور پر فیصلہ نہ کرے۔

۵۔ منکر کو ختم کرنا چاہے اس کے لیے جتنی بھی زیادہ مشقت اٹھانی پڑے۔

۶۔ دشمنوں کے خلاف جہاد پر صبر کرنا بھی واجب ہے چاہے دشمنوں کے پاس رسول اللہ سے کئی گنا زیادہ تیاری اور تعداد موجود ہو۔

۷۔ تنگ دست مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس پر قرض ہو تو اس قرض کی ادائیگی، یہ رسول اللہ کے علاوہ کسی دوسرے پر فرض نہیں ہے۔

۸۔ تہجد کی نماز، پھر یہ نماز بعد میں منسوخ ہوئی اور دوسری سنتوں کی طرح یہ سنت باقی رہی۔

۹۔ قربانی؛ دوسرے پر واجب نہیں ہے۔ (''الخصائص الکبری'' ۲۴۴/۲، رسول اللہ پر ان چیزوں کے واجب ہونے میں بعض علماء نے اختلاف کیا ہے، ان میں امام بلقینیؒ بھی ہیں)

بعض علماء نے کہا ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے والی دو رکعتیں آپ پر واجب تھی، اللہ تبارک تعالی بلند و بالا اور سب سے زیادہ جاننے والا ہے؛ صلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

رسول اللہ ﷺ نے پندرہ عورتوں سے نکاح کیا اور تیرہ عوتوں سے جماع کیا اور گیارہ عورتوں کو اپنے نکاح میں باقی رکھا، ان میں سے دو کو طلاق دیا اور وفات کے وقت آپ کے نکاح میں مندرذیل نو بیویاں تھیں: سودہ، عائشہ، حفصہ، ام سلمہ، زینب، ام حبیبہ، جویریہ، صفیہ، میمونہ رضی اللہ عنہن اجمعین۔ رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ ترتیب کے ساتھ ان کے ساتھ شادی کی، حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کی، جن کا بھی تذکرہ یہاں کیا گیا ہے ان سبھوں کے ساتھ آپ نے حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد ہی شادی کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل:

۱۔ اللہ نے آپ کو خاتم النبیین بنایا اور آپ کی رسالت قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔

۲۔ آپ کو اللہ نے اولادِ آدم کا سردار بنایا۔

۳۔ آپ پہلے شخص ہوں گے جو قیامت کے دن اللہ تعالی کی طرف سے لوگوں کو دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد زمین سے نکلیں گے۔

۴۔ پہلے سفارشی ہوں گے اور آپ کی سفارش سب سے پہلے قبول کی جائے گی یعنی اللہ تبارک وتعالی کے پاس اللہ کی اجازت سے قیامت کے دن آپ کی سفارش سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔

۵۔ آپ کی امت سبھی امتوں میں خیر امت ہے۔

۶۔ آپ کی امت معصوم ہے جو گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔

۷۔ نماز میں آپ کی امت کی صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ہیں۔

۸۔ آپ کی شریعت ابدی ہے یعنی قیامت تک باقی رہنے والی ہے جب کہ اسلام سے پہلے والی سبھی شریعتیں منسوخ کی گئی ہیں۔

۹۔ آپ کا معجزہ قرآن کریم ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے، کیوں کہ اللہ تبارک تعالی نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ''لا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ، تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ '' (فصلت ۴۲) اس کے پاس باطل نہ سامنے سے آتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ حکیم اور حمید کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

۱۰۔ ایک ماہ کی مسافت سے رعب کے ذریعہ آپ کی مدد کی گئی۔

۱۱۔ آپ کے لیے زمین مسجد بنادی گئی، اس کی وجہ سے آپ کی امت کو کسی بھی جگہ اپنے وقت پر نماز ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

۱۲۔ زمین کی مٹی طہور بنادی گئی تاکہ معذور شخص اور پانی نہ پانے والا نماز پڑھنے کے لیے تیمّم کرے اور ایسے برتن کو صاف کرنے کے لیے جس میں کتے نے منہ ڈالا ہو۔

۱۳۔ آپ کے لیے مالِ غنیمت حلال کردیا گیا، اسی طرح آپ کی امت کے لیے بھی، جب کہ آپ سے پہلے کے انبیاء کو حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کو آگ آکر جلادیتی تھی۔

۱۴۔ قیامت کے دن آپ کو مقام محمود حاصل ہوگا، جس مقام پر اس دن سبھی مخلوق آپ کی تعریف کرے گی۔

۱۵۔ آپ کے لیے جھنڈا گاڑ دیا جائے گا جس کے ارد گرد آدم علیہ السلام سے لے کے عیسی علیہ السلام تک قیامت کے دن جمع ہوجائیں گے۔

۱۶۔ آپ کو قیامت کے لیے شفاعتِ عظمٰی حاصل ہوگی اور اس شفاعت کے ذریعہ اللہ تعالی مخلوق کو قیامت کی ہولناکیوں سے بچائے گا اور ان میں سے ہر ایک اپنے انجام کو جان لے گا۔

۱۷۔ آپ کی امت میں سے ایک تعداد بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہو جائے گی۔

۱۸۔ آپ کو انسانوں، جنات اور فرشتوں کی طرف بھیجا گیا۔ (آپ کی بعثت انسانوں اور جنات کے لیے ہے؛ اس پر اجماع ہے۔ البتہ آپ کی بعثت فرشتوں کی طرف بھی ہوئی ہے یا نہیں، اس بارے میں بعض اہل علم مانتے ہیں کہ فرشتوں کی طرف بھی آپ کی بعثت ہوئی ہے۔ دیکھا جائے ''الخصائص الکبری'' ۲/۲۷۹)

۱۹۔ آپ کے متبعین سبھی انبیاء کے پیروکاروں سے زیادہ ہیں۔

۲۰۔ آپ کا دل نہیں سوتا تھا، اس لیے آپ اپنے رب کی طرف سے وحی قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ (یہ بات ثابت ہے کہ آپ یوم الوادی میں نماز سے سو گئے اور آپ سے بلالؓ نے فرمایا: ''اللہ کے رسول! میرے دل کو اس ذات نے پکڑے رکھا جس نے آپ کے دل کو پکڑے رکھا''۔ ابن حبان ۲۰۶۹ وغیرہ۔ قاضی عیاض نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ دیکھا جائے: ''الشفاء بتعريف حقوق المصطفى'' ۲/۱۵۳)

۲۱۔ آپ اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح اپنے آگے سے دیکھتے تھے، کیوں کہ آپ کو نورِ بصیرت حاصل ہوئی۔

۲۲۔ آپ کے لیے بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے کا ثواب کھڑے ہوکر پڑھنے کی طرح ہے۔

۲۳۔ جو نماز میں آپ کو سلام کرے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی ہے، جب کہ عام

مسلمانوں میں سے کس کو سلام کرے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، جو اپنی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرے اور کہے: السلام علیک یا رسول اللہ۔ تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی ہے۔

۲۴۔ آپ کی موجوگی میں آپ کی آواز سے بڑی آواز نکالنا حرام ہے۔

۲۵۔ کمروں کے پیچھے سے آپ کو پکارنا حرام ہے۔

۲۶۔ ایک ساتھ آپ کے نام پر نام اور آپ کی کنیت پر کنیت رکھنا حرام ہے، اگر کوئی صرف ''محمد'' نام رکھے یا آپ کی صرف کنیت ''ابوالقاسم'' رکھے تو جائز ہے۔

۲۷۔ نماز میں آپ کی آواز کا جواب دینا واجب ہے اور اس سے نماز باطل نہیں ہوتی ہے، یعنی جب کسی کو آپ پکاریں اور وہ نماز پڑھ رہا ہو تو جس کو پکارا گیا ہے اس پر جواب دینا واجب ہے اور جواب دینے سے اس کی نماز باطل نہیں ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری میں ابوسعید بن معلّٰی سے روایت ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی، میں نے جواب نہیں دیا، بعد میں آپ سے میں نے کہا: اللہ کے رسول! میں نماز پڑھ رہا تھا! آپ نے فرمایا: کیا اللہ نے نہیں فرمایا: اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ)

۳۵۔ خواب میں آپ کا آنا حقیقی ہے، کیوں کہ شیطان آپ کی شکل اختیار نہیں کرتا ہے۔

۳۶۔ اسراء کی رات آپ نے فرشتوں اور انبیاء کو نماز پڑھائی۔

۳۷۔ آپ کی وفات کے بعد بھی لوگوں کا سلام آپ کے پاس پہنچتا ہے اور اللہ تعالی آپ کی روح آپ میں لوٹا دیتا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سلام کا جواب دیں۔

۳۸۔ آپ قیامت کے دن سبھی انبیاء کے بارے گواہی دیں گے کہ انہوں نے رسالت کو پہنچا دیا۔

۳۹۔ جب آپ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو زمین پر آپ کا سایہ نہیں ہوتا۔ (سیوطی نے اس کا تذکرہ الخصائص الکبری میں کیا ہے ۱/۱۷۱، اور اس کی نسبت ترمذی کی طرف کی ہے)

۴۰۔ آپ پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی، یہ بات معروف ہے کہ مکھی ان لوگوں پر بیٹھتی ہے جو اپنے جسم کی پاکی وصفائی کا خیال نہیں رکھتے ہیں، جس کا شمار پاکی اور صفائی میں فرشتوں کی صف

میں ہو تو اس پر مکھی کیسے بیٹھے گی۔

۴۱۔ جس جگہ آپ نے نماز پڑھی ہے اور آپ کے کھڑے رہنے کی جگہ محقق ہو تو پھر وہاں دائیں بائیں اجتہاد کرنا ممنوع ہے۔

۴۲۔ نماز میں تشہد اخیر میں آپ پر درود بھیجنا واجب ہے۔

۴۳۔ آپ کو جمائی نہیں آتی تھی، کیوں کہ جمائی کمزوری اور ضعف کی علامت ہے یا پیٹ بھرا رہنے کی علامت ہے (اس کو بھی سیوطی نے ''الخصائص الکبری'' میں بیان کیا ہے اور اس کی نسبت ''التاریخ الکبیر'' میں بخاری کی طرف اور ''مصنف ابن شیبہ'' کی طرف کی ہے ۱/۱۴۴) آپ کا نشاط وچستی، کم کھانا، تحمل وبرداشت کی قوت اور عزیمت وپختگی معروف ومشہور ہے۔

۴۴۔ آپ کے فیصلہ کے سلسلہ میں کسی کو اپنے دل میں تنگی محسوس ہو تو وہ کافر ہے۔

۴۵۔ آپ کی نمازِ جنازہ لوگوں نے باجماعت نہیں پڑھی، بلکہ سبھوں نے انفرادی طور پر پڑھی۔

۴۶۔ آپ پر صبح وشام درود وسلام ہو اور ہر حرکت اور استقرار پر درود وسلام ہو، اللہ آپ کو ہماری طرف سے بہترین بدلہ دے جو کسی بھی قوم کی طرف سے کسی نبی کو اور امت کی طرف سے کسی رسول کو دیا جانے والا سب سے بہتر بدلہ ہو، اور آپ کے فضل وشرافت میں اضافہ فرمائے۔

ہم نے یہ بات بتا دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اجازت تھی کہ اپنی شادی میں خود ہی ایجاب وقبول فرمائیں، یہ رخصت صرف آپ کی تنہا ذات کو دی گئی ہے، اس کے باوجود آپ نے اس رخصت سے کبھی بھی فائدہ نہیں اٹھایا، مسلمانوں میں سے کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے، آپ کا فرمان ہے: ولی اور دو عادل گواہ کے بغیر نکاح نہیں۔ (صحیح ابن حبان: کتاب الحج، باب الہدی، ذکر نفی اجازۃ عقد النکاح بغیر ولی وشاہدی عدل ۴/۱۳۸، سنن ابی داؤد: کتاب النکاح، باب فی الولی ۱۷۹۸، اس میں شاہدی عدل کا تذکرہ نہیں ہے) اس سے صرف ایک شکل مستثنی ہے، وہ یہ کہ دادا اپنی پوتی کا نکاح دوسرے بیٹے کے لڑکے یعنی پوتے سے کرا رہا ہو، اس صورت میں وہ تنہا ایجاب وقبول کر سکتا ہے۔

نکاح پر عورت کا راضی ہونا شرط ہے، اگر باکرہ بیٹی ہو اور اس کا ولی باپ یا دادا ہو تو اس کی رضامندی ضروری نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی باکرہ بیٹی کا نکاح جبراً کر سکتا ہے، لیکن اس

کے لیے مندرجہ ذیل سات شرطیں ہیں:

۱۔ بیٹی اور اس کے والد کے درمیان دشمنی نہ ہو، اگر محلے والے بیٹی اور باپ کے درمیان دشمنی کو جانتے ہوں تو وہ بیٹی کی رضامندی کے بغیر اس کو شادی پر مجبور نہیں کرسکتا ہے۔ (یہی بات شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اپنی کتاب ''اُسنی المطالب'' میں تحریر کی ہے)

۲۔ بیٹی اور اس شخص کے درمیان دشمنی نہ ہو جس کے ساتھ اس کی شادی کرائی جارہی ہو۔

۳۔ شوہر بیٹی کا کفو ہو۔

۴۔ شوہر بیٹی کے مہر کا مالک ہو، چاہے مہر اس کے کام کی تنخواہ ہو یا وقف ہو جو اس پر وقف کیا گیا ہو یا جانور ہو جن کا وہ مالک ہو یا کسی جائداد کا کرایہ ہو جو اس کا مالک ہو۔

۵۔ اس کا مہر، مہرِ مثل سے کم نہ ہو۔

۶۔ مہر اس کے علاقہ میں رائج کرنسی میں ہو جب وہ مہر نقد میں ادا کیا جانے والا ہو۔

۷۔ عقدِ نکاح ہوتے ہی بیٹی کو فوراً مہر ادا کیا جائے یعنی مہر موجل نہ ہو یعنی تاخیر سے دیا جانے والا مہر نہ ہو۔

اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو بیٹی کی طرف سے صریح موافقت سے ہی شادی کرنا واجب ہے ، اگر پہلی والی چار شرطیں نہ پائی جائیں اور لڑکی کی صریح اجازت کے بغیر عقد ہو جائے تو یہ عقد باطل ہے، اگر اخیر والی تین شرطیں نہ پائی جائیں جو بیٹی کے مہر کے ساتھ مخصوص ہیں تو عقدِ نکاح صحیح ہو جاتا ہے اور مقررہ مہر باطل ہو جاتا ہے، اور مہرِ مثل دینا واجب ہو جاتا ہے اور مہر اسی وقت فوراً دینا ضروری ہو جاتا ہے اور اسی ملک کی کرنسی میں جہاں عقدِ نکاح ہوا ہو، اگر شادی بیٹی کی صریح اجازت کے ساتھ ہو تو پھر ان شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، باکرہ لڑکی کی خاموشی اس کی رضامندی کی دلیل ہے جب خاموشی کے ساتھ وہ نہ روئے اور واویلا نہ کرے۔

جب یہ سات شرطیں پائی جائیں تو لڑکی کے ولی کو جب وہ باپ یا دادا ہو تو اس کو شادی پر مجبور کرنا جائز ہے، لیکن سنت یہ ہے کہ لڑکی کی اجازت لی جائے۔

باندی کا مالک اس کو شادی پر مجبور کرسکتا ہے، اس کے باوجود جو اپنے معاملات میں اللہ

کی رضامندی کی امید رکھتا ہے تو اپنی باندی کو اس شخص کے ساتھ شادی پر مجبور نہ کرے جس سے وہ شادی کرنے پر راضی نہ ہو۔

شوہر کی اجازت شرط ہے:

شادی صحیح ہونے کے لیے شوہر کی رضامندی ضروری ہے، ہاں اگر وہ بچہ ہو تو اس کا والد یا دادا اس کی شادی کرا سکتا ہے، اس صورت میں بچے کی رضامندی شرط نہیں ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ یہ بچہ پاگل یا عضوِ تناسل کٹا ہوا نہ ہو، اگر بچہ پاگل ہو یا اس کا عضوِ تناسل کٹا ہوا ہو تو بالغ ہونے سے پہلے اس کی شادی کرانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ بچہ کو بالغ ہونے سے پہلے شادی کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

نکاح لفظ ''تزویج'' یا ''اِنکاح'' کے بغیر نہیں ہوتا ہے یعنی یہ کہنا ضروری ہے: ''زَوَّجْتُکَ'' یا ''أَنْکَحْتُکَ''. یہ دونوں الفاظ قرآن کریم میں آئے ہیں۔ (اس میں اختلاف مشہور ہے: احناف، مالکیہ، اور بعض حنابلہ کسی بھی ایسے لفظ سے نکاح منعقد ہونے کے قائل ہیں جو مقصد تک پہنچانے والا ہو)

غیر عرب کے لیے اپنی قوم میں رائج شادی کا عقد ان دو کلمات کے معنی والے الفاظ سے کرنا جائز ہے، چاہے عقد کرنے والا اچھی عربی جاننے والا کیوں نہ ہو، کیوں کہ اعتبار معنی کا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اولیاء کا بیان

ولایت دوسرے پر اپنی بات نافذ کرنا ہے۔

یہاں اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو لڑکیوں یا عورتوں کی نیابت کرتے ہوئے عقدِ نکاح کرسکتے ہیں، ہم یہاں اس فصل میں اولیاء کی وضاحت کررہے ہیں، ان کی صفات اور عقدِ زواج میں عورت پر ولایت کے حق میں اولیت کی حیثیت سے ترتیب بیان کی جارہی ہے۔

اولیاء کی دو قسمیں ہیں: مکمل شفقت والا مثلاً باپ اور دادا اوپر تک، ناقص شفقت والا مثلاً قریبی رشتہ دار جو نسب میں عصبہ ہونے کی وجہ سے شادی کراتا ہے اور سلطان جو عمومی ولایت کی وجہ سے شادی کراتا ہے۔ (التھذیب۔ بغوی ۲۵۵/۵)

ولایت کے اسباب چار ہیں:

۱۔ باپ اوپر تک، اور عصبہ کی قرابت اقرب فالاقرب ہے یعنی سب سے قریبی رشتہ دار پھر سب سے قریبی رشتہ دار مثلاً حقیقی بھائی اور علاتی بھائی، اور جس کو سیادت کا حق ہو مثلاً وہ شخص جس نے باندی کو آزاد کیا ہو اور اس آزاد کردہ باندی کا اس کے عصبہ میں سے کوئی ولی نہ ہو، اس لیے جو باندی کو آزاد کردے تو وہ اس کی شادی میں اس کا ولی بن سکتا ہے، جس کا کوئی بھی ولی نہ ہو تو حاکم ولی ہونے کی حیثیت سے شادی کراسکتا ہے۔

۲۔ عورت کے لیے نکاح کا ولی اس کے عصبہ میں سے سب سے قریبی رشتہ دار ہے مثلاً باپ اور دادا اوپر تک، ان دونوں کو باپ بننے کا بھی حق ہے اور یہ دونوں عورت کے عصبہ میں بھی شمار ہوتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح حقیقی بھائی، علاتی بھائی، حقیقی بھتیجہ، علاتی بھتیجہ، حقیقی چچا، علاتی چچا، حقیقی چچازاد بھائی اور علاتی چچازاد بھائی؛ ان سبھوں کو عصبہ کا حق ہے۔

۴۔ بیٹا، بیٹا ہونے کی حیثیت سے شادی نہیں کراسکتا: بیٹا صرف بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کی شادی نہیں کراسکتا کیوں کہ بیٹے اور اس کی ماں کے درمیان اس طرح کا نسبی رابطہ نہیں ہے کہ وہ اس نسب سے عار اور رسوائی کو دور کرسکتا ہو، مگر یہ کہ یہ بیٹا اس کے چچازاد بھائی کا بیٹا ہو، وہ چچازاد بھائی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اپنی ماں کی شادی کرسکتا ہے، اسی طرح اس صورت میں بھی کرسکتا ہے جب وہ اس کو آزاد کرنے والے کا بیٹا ہو، اگر وہ صرف اس کا بیٹا ہو تو اپنی ماں کی شادی کرانے کے لیے بیٹا ہونے کا رشتہ کافی نہیں ہے، کیوں کہ بیٹا ہونا نکاح کا ولی ہونے کے اسباب میں سے نہیں ہے۔ (یہ شافعیہ کا مسلک ہے، امام مالک، ابوحنیفہ، احمد، اسحاق بن راہویہ کا مسلک یہ ہے کہ بیٹا اپنی ماں کا نکاح کراسکتا ہے، بلکہ امام مالک، ابویوسف اور اسحاق کے نزدیک باپ کے مقابلے میں بیٹے کی طرف سے شادی کرا کے دینا زیادہ اولی اور بہتر ہے۔ ابوحنیفہ نے کہا ہے: وہ دونوں برابر ہیں، جو بھی اس کی شادی کرائے تو جائز ہے۔ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے دلیل پیش کی ہے جو آپ نے عمر بن ابوسلمہ سے فرمائی: بیٹے! کھڑے ہو جاؤ اور اپنی ماں کی شادی کراؤ۔ جب آپ نے ام سلمہ کو پیغام بھیجا۔ اس وقت ام سلمہ کے اولیاء میں سے کوئی بھی حاضر نہیں تھا۔ مسند امام احمد ۲۶۶۹۔ دیکھا جائے؛ الحاوی الکبیر ماوردی ۹۴/۹) البتہ بیٹا ہونا اپنی ماں کی شادی کرانے کے لیے رکاوٹ نہیں ہے۔

۵۔ پھر آزاد کرنے والا پھر اس کے عصبہ۔ نکاح میں نسب کی ولایت کی ترتیب وراثت کی طرح ہی ہے۔

۶۔ باندی کا نکاح آزاد کرنے والی عورت کا ولی کرائے گا، البتہ آزاد کرنے والی عورت کی رضامندی شرط ہے، اگر آزاد کرنے والی عورت اور اس کا ولی دونوں کافر ہوں اور جو آزاد ہوئی ہے وہ مسلمان ہو تو کافر کو مسلمان مرد اور عورت پر ولایت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ دین میں اختلاف پایا جاتا ہے، مسلمان عورت کا ولی اپنی عورت کی آزاد کردہ باندی کی شادی کراسکتا ہے چاہے وہ آزاد کردہ کافرہ ہی کیوں نہ ہو۔

۷۔ کسی عورت کی طرف سے آزاد کردہ باندی کی شادی آزاد کرنے والی عورت کی وفات

کے بعد وہ شخص کرائے گا جس کو ولایت حاصل ہو، ولایت میں آزاد کرنے والی عورت کے بیٹے کو مقدم کیا جائے گا، آزاد کرنے والی عورت کی زندگی میں اور اس کی موت کے بعد ولی کے درمیان یہ فرق ہے۔

۸۔ پھر سلطان ولی ہوگا: اس کی ولایت اس عورت پر ہوگی جس کا نہ کوئی نسبی عصبہ ہو اور نہ کسی کو سیادت کا حق ہو، اس صورت میں حاکم اس کی شادی کرائے گا، صحیح حدیث میں آیا ہے جس کو ترمذی، حاکم نے بخاری و مسلم کی شرطوں کے مطابق روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سلطان اس کا ولی ہے جس کا کوئی نہ ہو''۔ (ترمذی: ابواب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء لانکاح الا بولی ۱۰۵۷، مستدرک علی الصحیحین۔ حاکم: کتاب النکاح ۲۶۳۶) اس معاملہ میں سلطان وہ ہے جس کے ہاتھوں میں عوام کا معاملہ ہو، وہ حاکم یا قاضی ہے، یا وہ جج ہے جس کے حوالہ ان امور کی ادائیگی کی ذمہ داری ہو، جب کوئی مرد اور عورت کسی ایسی جگہ پائے جائیں جہاں نہ کوئی حاکم ہو اور نہ قاضی تو یہ صحیح ہے کہ وہ دونوں اپنی طرف سے مسلمان عاقل، بالغ اور عادل شخص کو اپنا نکاح کرانے کے لیے وکیل بنائیں۔

۹۔ نکاح صحیح ہونے کے لیے ولی میں مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: آزاد ہو، مرد ہو، عاقل ہو، عادل ہو، اسی وجہ سے نہ غلام کو نکاح کی ولایت کا حق ہے اور نہ عورت کو، بیوقوف کو بھی نکاح کی ولایت کی ذمہ داری ادا کرنے کا حق نہیں ہے، یہ ذمہ داری بچہ، کافر اور پاگل بھی نباہ نہیں سکتے ہیں کیوں کہ ان میں عادل ہونے کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، جو شرط صرف مسلمان عاقل بالغ اور عادل میں ہی پائی جاتی ہے، فاسق کو بھی نکاح کی ولایت کا حق نہیں ہے۔ (احناف نے فاسق کی ولایت اور اس کی گواہی کو جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ نکاح اور گواہی کا مقصد عقدِ نکاح کو انکار سے محفوظ رکھنا ہے۔ دیکھا جائے ''تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق'' فخر زیلعی ۹۹/۲)

گونگے اور کچھ نہ سمجھنے والے بیوقوف کے لیے ولایت کا حق نہیں ہے اور نہ ہمیشہ پاگل رہنے والے کو، ایسے مریضوں کو بھی ولایت کا حق نہیں جس کا اثر اس کی عقل پر پڑتا ہو اور اس کی فکر سلیم چھن جاتی ہو۔

ولی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ حج یا عمرہ کے احرام میں نہ ہو اور اس پر پابندی نہ لگائی گئی ہو۔

سلطان کو ولایتِ نکاح کا حق کب ہے:

عورت کا کوئی بھی ولی نہ ہونے کی صورت میں سلطان نکاح کا ولی بنتا ہے، اسی طرح جب اس کا ولی لاپتہ ہو اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو، یا عورت کا ولی ہی اس کے ساتھ شادی کا خواہش مند ہو مثلاً اس کا چچازاد بھائی، اگر ولی مسافتِ قصر میں غائب ہو (مسافت قصر سولہ فرسخ یعنی ۸۸ کلومیٹر ہے) ولی حج یا عمرہ کے احرام میں ہو یا ولی حاکم اور میاں بیوی کی موجوگی میں شادی مکمل کرانے سے انکار کرے اور وہ تین مرتبہ مکرر انکار کرے تو یہ ولی فاسق شمار کیا جائے گا اور نکاح کی ولایت بعد والے ولی کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ عورت مسلمان ہو اور اس کا ولی کافر ہو، یا عورت کا ولی جیل میں قید ہو اور اس سے ملاقات ممکن نہ ہو، یا عورت پاگل ہو اور وہ بالغ ہوگئی ہو اور اس کا کوئی اجباری ولی یعنی باپ یا دادا نہ ہو تو ان سبھی صورتوں میں سلطان کو شادی کرانے کا حق حاصل ہوتا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ قریبی رشتہ دار ولی عورت کو شادی سے روک دے اور روکنا اسی وقت معتبر ہوگا جب وہ قاضی کے سامنے باز رہے، اس صورت میں پیغام دینے والا مرد حاضر ہوگا اور عورت کو طلب کرے گا اور قاضی اس کو شادی کرانے کا حکم دے گا۔ اس پر اگر وہ کہے: میں نہیں کروں گا۔ یا خاموش رہے تو قاضی لڑکی کی اجازت سے اس کی شادی کرائے گا۔ (''التہذیب'' بغوی ۲۸۴/۵)

۱۱۔ اگر ایک ہی درجہ کے قریبی رشتے دار چند ولی موجود ہوں، مثلاً ایک لڑکی کے کئی بھائی ہوں اور ان میں سے ہر ایک نکاح میں اس کا ولی بننا چاہتا ہو تو اس صورت میں ان کے درمیان قرعہ نکالا جائے گا، جس کے نام قرعہ نکلے گا وہ اپنی بہن کی شادی کرانے کے لیے ولی بنے گا۔

۱۲۔ گواہوں کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں: وہ کامل آزاد ہو، مرد ہو، عادل ہو، سماعت، بصارت اور نطق کی صلاحیت صحیح ہو، اس پر بیوقوفی کی وجہ سے پابندی نہ لگائی گئی ہو، وہ کوئی حقیر پیشہ نہ کرتا ہو جس سے اس کی مروءت میں خلل آجائے، غفلت یا بھولنے کی وجہ

سے اس کے ضبط میں خلل نہ ہوا اور وہ میاں بیوی کی زبان جانتا ہو۔

۱۳۔ بیوی کے بیٹے اور شوہر کے بیٹے کی گواہی سے عقدِ نکاح ہو جاتا ہے، یا بیوی کے والد اور شوہر کے والد کی گواہی سے بھی ہوتا ہے، جب وہ دونوں مسلمان ہوں اور میاں بیوی کافر ہوں تو ان کے والدین گواہ بن سکتے ہیں، گواہوں کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔

اگر بیوی کا والد مسلمان ہو اور میاں بیوی کافر ہوں، اور بیوی کا ایک حقیقی بھائی موجود ہو اور وہ کافر ہو تو یہ کافر بھائی اپنی کافر بہن کی شادی کرائے گا، مسلمان کافرہ کی شادی پر گواہ بن سکتا ہے۔

عورت کے دشمن اور اس کے شوہر کے دشمن کی گواہی سے بھی نکاح ہو جاتا ہے جب وہ فاسق نہ ہوں۔ (بغوی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس گواہی میں کوئی تہمت نہیں ہے، دیکھا جائے: التہذیب ۲۶۴/۵) کیوں کہ فاسق کو گواہی کا حق نہیں ہے۔

اگر دونوں گواہوں کا حال پوشیدہ ہو تو ان کی گواہی سے عقدِ نکاح ہو جاتا ہے، ایسے دو گواہوں کی گواہی سے عقدِ نکاح نہیں ہوتا جن کا اسلام اور آزادی پوشیدہ ہو یعنی ان کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ مسلمان اور آزاد ہیں۔

وہ عقدِ نکاح باطل شمار ہوگا جس کی گواہی ایسے دو گواہ دیں جن کا فسق پہلے یا عقد کے دوران معلوم ہو۔ (یہ مالکیہ کا قول ہے اور احمد کی ایک روایت یہی ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک تعالی کا یہ فرمان ہے: وأشهدوا ذوی عدل منکم۔ فسق عدالت کے منافی ہے، اس لیے فسق کی موجودگی میں عقدِ نکاح نہیں ہوتا ہے) اگر دو ایسے گواہوں کی موجودگی میں عقد نکاح کیا جائے جن کا فسق مشہور نہ ہو، پھر ان کے بارے میں بعد میں معلوم ہو جائے کہ وہ فاسق ہیں تو عقد صحیح ہو جاتا ہے، چاہے وہ عقد کے وقت اپنے فسق کا اعتراف کر لیں، ان کے اعتراف کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ عقد صحیح ہو جاتا ہے۔

باطل نکاحوں کا بیان

اس باب میں باطل نکاحوں کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے، ہم نے اس سے پہلے باطل نکاحوں کا سرسری تذکرہ کیا تھا اور حرام نکاح کے بارے میں بھی بتایا تھا، اب ہم تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ ان کو دوبارہ بیان کر رہے ہیں:

۱۔ نکاح شغار:

مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے؛ میں نے اپنی بہن کا نکاح اس شرط پر کیا کہ تم اپنی بہن کی شادی مجھ سے کرا دو۔ اور ان میں سے ہر ایک کا حقِ جماع دوسرے کا مہر ہے۔ اس کے جواب میں دوسرا کہے: میں نے تمھاری بہن کے ساتھ شادی کی اور میں نے اپنی بہن کی شادی تمھاری کہی ہوئی شرط کے مطابق تمھارے ساتھ کر دی۔ یہ نکاح باطل ہے، کیوں کہ ایک عورت سے جماع کا حق دوسری عورت کا مہر نہیں بنتا ہے۔ اگر یہ دونوں کوئی بات نہ کریں اور مہر کی عدم موجودگی کا تذکرہ عقدِ نکاح میں نہ کریں، بلکہ ذہن میں یہی ہو تو یہ نکاح صحیح ہوتا ہے، اور دونوں پر مہرِ مثل واجب ہو جائے گا۔

۲۔ نکاحِ متعہ:

وہ نکاح جس میں وقت متعین ہو اور اس کا مقصد جیسا کہ واضح ہے صرف لطف اندوزی ہو، جب کہ نکاح کا مقصد استمرارِ نسل اور وراثت رہتا ہے اور ایک دوسرے کے خاندانوں کے قریب کرنا ہے اور یہ امور نکاحِ متعہ میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو میں سے آخری حکم میں نکاحِ متعہ کی ممانعت ثابت ہے۔ بخاری: کتاب النکاح، باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعۃ آخراً ۵۱۱۵۔ ابن حبان ۴۱۴۰، یہ روایت حضرت علیؓ سے ہے)

۳۔احرام میں موجود شخص کا نکاح باطل ہے:

حج یا عمرہ کا احرام یا ان دونوں کا ایک ساتھ احرام کی نیت کرنے والے کو محرم کہا جاتا ہے، چاہے وہ ایسے شخص کو وکیل بنائے جو محرم نہ ہو تو بھی عقد باطل ہو جاتا ہے۔(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: مُحرم نہ نکاح کرے اور نہ نکاح کرائے اور نہ پیغام بھیجے۔ مسلم: کتاب النکاح، باب تحریم نکاح المحرم م ۱۴۰۹۔ ابن حبان ۴۱۲۳۔ یہ روایت حضرت عثمانؓ سے ہے) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک رجعی طلاق دے اور وہ اپنی مطلقہ سے حالتِ احرام میں رجوع کرے تو صحیح ہے، اگر کوئی حج یا عمرہ یا دونوں کے احرام میں ہو اور وہ دوسرے شخص کے عقدِ نکاح کی گواہی دے تو صحیح ہے، لیکن مکروہ ہے جیسا کہ بغوی وغیرہ نے کہا ہے۔

۴۔دو ولی ایک عورت کا نکاح دو الگ الگ مردوں سے کرے اور معلوم نہ ہو کہ کس کے ساتھ پہلے نکاح ہوا ہے تو دونوں نکاح باطل ہو جاتے ہیں، اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں معلوم ہو کہ پہلے نکاح کونسا ہوا ہے تو پہلا عقد صحیح ہوگا اور دوسرا عقد باطل ہو جائے گا، کیوں کہ دو مردوں سے ایک عورت کی شادی باطل ہے، یہ واقعہ اسی وقت رونما ہوتا ہے جب ایک عورت کے ایک سے زائد ولی ہوں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے دور علاقے میں رہتا ہو اور ایک دوسرے کے عقد کے بارے میں معلوم نہ ہو۔

جب ان شوہروں میں سے کوئی ایک عقد کے باطل ہونے کے بارے میں معلوم ہونے سے پہلے جماع کرے تو ان دونوں کے درمیان جدائی کرائی جائے گی اور عورت یا تو مہرِ مثل کی حقدار ہوگی یا عقد میں مقرر کردہ مہر کی۔ اگر وہ لڑکی عقد کے باطل ہونے کے بارے میں جانتے ہوئے جماع کی اجازت دے تو اس کے لیے مہر کا حق نہیں ہے اور اس کو تیسرے مرد سے شادی کا بھی حق نہیں ہے، البتہ ایسی صورت میں جائز ہے جب کہ وہ دونوں اس کو طلاق دیں جن کا عقد باطل ہو گیا ہے، یا دونوں مر جائیں یا ان میں سے کوئی ایک مر جائے اور جس نے جماع کیا ہے وہ اس کو طلاق دے اور اس سے وہ عدت گذارے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی اس عورت کے ساتھ جماع نہ کرے تو اس کے لیے عدت نہیں ہے۔

۵۔استبرائے رحم کرنے والی اور عدت گذارنے والی کا نکاح باطل ہے کیوں کہ عدت یا استبرائے رحم کی مدت میں عورت کا عقد کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر باطل عقد کے بعد عدت میں جماع کیا جائے تو اس پر حدّ زنا لگائی جائے گی، البتہ یہ صورت مستثنی ہے کہ وہ نیا مسلمان ہوا ہو یا ایسے علاقے میں رہتا ہو جہاں علماء نہ ہوں تو حکم شرعی سے ناواقف رہنے کے وجہ سے اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔

۶۔حمل ہونے کے شک میں مبتلا عورت کے ساتھ نکاح باطل ہے، چاہے اس کے طلاق پر تین طہر گزر چکے ہوں، اس کے ساتھ عقدِ نکاح اس وقت تک باطل ہوگا جب تک اس کو شک ہو کہ وہ حاملہ ہے، کیوں کہ نکاح کے معاملہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط ضروری ہے، اس لیے اس وقت تک عقدِ نکاح نہ کرنا ضروری ہے جب تک کہ رحم کے حمل سے خالی ہونے کا مکمل یقین نہ ہو، اگر عدت یا استبراء یا احرام باقی رہنے کا گمان ہو تو بھی ان تمام صورتوں میں عقدِ نکاح باطل ہے، چاہے بعد میں معلوم ہو جائے کہ عقد عدت، استبراء اور احرام کے نہ ہونے کی حالت میں ہوا ہے، کیوں کہ نکاح رحم کے حمل سے خالی ہونے اور احرام میں نہ ہونے کے یقین کی حالت میں ہی ہونا ضروری ہے۔

۷۔غیر خالص اہل کتاب عورت سے مسلمان کا نکاح باطل ہے مثلاً مجوسی ہو یا بت پرست ہو یا سورج، چاند یا پانی کی پوجا کرنے والی ہو، مسلمان کو اس سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، مسلمان اس سے شادی کرے تو باطل ہے، اسی طرح غیر خالص اہل کتاب لڑکی سے بھی نکاح باطل ہے، مثلاً اس کا باپ یہودی ہو اور اس کی ماں مجوسی یا بت پرست ہو۔

مسلمان کے لیے اس اہل کتاب لڑکی سے شادی کرنا بھی جائز نہیں ہے جو نئی یہودی یا نصرانی ہوئی ہو، یعنی وہ یا اس کے گھر والے اسلام آنے کے بعد عیسائی ہوئے ہوں مثلاً ہندوستانی اور افریقی اور امریکہ کی قومیں، یہ سب لوگ اسلام کے آنے کے بعد نصرانی ہوئے ہیں، اسی وجہ سے مسلمان کے لیے ان کی عورتوں سے نکاح کرنا صحیح نہیں ہے اور اگر ان سے عقد کیا جائے تو باطل ہے، اگر مسلمان کسی اہل کتاب لڑکی سے شادی کرنا چاہے تو شرط یہ

ہے کہ اس کے گھر والے ان اہل کتاب میں سے ہوں جنہوں نے یہودیت یا عیسائیت کو اسلام سے پہلے اپنایا ہو مثلاً یورپی قومیں، اور وہ قومیں جو آج تک اپنے دین پر باقی ہوں۔

۸۔ سامرہ (سامرہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے جن کی نسبت سامری کی طرف ہے جس نے بچھڑے کی پوجا کی تھی) اور صائبہ (جن کا تذکرہ قرآن مجید میں یہودیوں کے بعد ہے، فرمان الٰہی ہے: ''إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى'' (حج ۱۷) ان کا تذکرہ دوسری آیات میں بھی ہے: ''إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ'' (بقرہ ۶۲) صائبہ بھی یہود کا ایک فرقہ ہے، صبا کے معنی اپنی قوم کے دین کو چھوڑنا ہے۔ کفار قریش بتوں کی پوجا چھوڑ کر دین اسلام اختیار کرنے والوں کو صابی کہا کرتے تھے) کی عورتوں سے نکاح کرنا مسلمان کے لیے جائز ہے جب وہ اپنے اصل دین میں یہود اور نصاری کے موافق ہوں۔ یہ دونوں فرقے یہود اور نصاری سے الگ ہونے والے ہیں، اگر یہ اپنے اصلی دین میں یہود اور نصاری کے موافق نہ ہوں تو مسلمان کے لیے ان فرقوں کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور ان میں سے کسی بھی عورت سے نکاح باطل ہو جائے گا۔

ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہونے والے سے اسلام کے علاوہ دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا:

اس کی وضاحت اور تشریح یہ ہے کہ جو یہودیت کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائے یا مجوسیت کو چھوڑ کر عیسائی بن جائے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، مگر یہ کہ وہ مسلمان ہو جائے، کیوں کہ یہودی یا مجوسی جب اپنے دین پر ہو تو وہ اس کو حق مانتا ہے، جب وہ دوسرے دین میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے سابقہ دین کے باطل ہونے کا اعتراف کرتا ہے، اس کے برعکس بھی صحیح ہے یعنی جو عیسائی ہو پھر یہودی بن جائے تو اس کا یہودی بننا عیسائیت کے باطل ہونے کا اعتراف ہے، اسی وجہ سے جو اپنا دین چھوڑ دے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، سوائے اسلام کے یعنی وہ مسلمان ہو تو قبول کیا جائے گا اور اس کو اپنے علاوہ کسی دوسرے دین میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے، اسی طرح اس کو اپنے پہلے والے دین کی طرف لوٹ جانے کا بھی حق نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے

جس میں آپ نے فرمایا: جو اپنا دین تبدیل کر دے تو اس کو قتل کر دو۔ (مسند امام احمد ۱۸۷۱، ابوداؤد: کتاب الحدود، باب الحکم فیمن ارتد ۴۳۵۱، ترمذی: کتاب الحدود، باب ماجاء فی المرتد ۱۴۵۸۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: ۴۴۷۵، یہ روایت ابن عباسؓ سے ہے) یعنی جو اپنا دین تبدیل کرے گا تو وہ یا تو مسلمان ہو جائے گا یا اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ انسانی طبیعت بڑی عجیب وغریب ہے، اگر دنیا کے کسی علاقے میں وبا پھیل جائے تو اس علاقے کو ممنوع علاقہ اعلان کیا جاتا ہے، وہاں نہ کوئی داخل ہوتا ہے اور نہ وہاں سے کوئی نکلتا ہے اور وہاں رہنے والوں کو اس وبا پر قابو پانے والی دوائیں اجباری طور پر پلائی جاتی ہیں، جب کہ یہ وبا لوگوں کی زندگیوں کو ختم کرتی ہے، اگر کوئی حالتِ کفر میں مر جائے تو اس کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان ہوتا ہے، اس کے باوجود اس وبا یعنی کفر کے کسی جگہ پھیلنے کی صورت میں وہاں والوں کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، جس میں پوری انسانیت کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی پنہاں ہے۔ اگر کسی بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے مجبور کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ ہر بیماری کی دوا ہے، تو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا زیادہ ضروری ہے، کیوں کہ اسلام میں انسان کی دونوں جہاں کی کامیابی ہے، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری نے ہی ان کو اپنے دین کا صحیح تعارف اور اس کو عمدہ اور لائق شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنے سے روک دیا ہے، اسی وجہ سے اسلام کی مدافعت کرنے والا نہیں ہے، البتہ باطل عقائد اور فاسد اخلاق کے داعی بہت زیادہ ہیں۔

مرتدہ کسی کے لیے بھی حلال نہیں ہے:

دینِ اسلام سے مرتد ہونے والی عورت کسی کے لیے بھی حلال نہیں ہے، نہ کافروں کے لیے حلال ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے، مسلمان کے لیے اس لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کافرہ ہے اور کافر کے لیے اسلام سے مرتد ہونے والی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ ابھی اسلام کا تعلق منقطع نہیں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے یا دونوں مرتد ہو جائیں اور ابھی جماع نہ ہوا ہو تو نکاح باطل ہو جاتا ہے،

اگر جماع کے بعد مرتد ہوجائیں تو نکاح کو موقوف رکھا جائے گا، اگر عدت کے دوران دونوں پھر اسلام میں جمع ہوجائیں تو نکاح باقی رہے گا، اگر عدت کے دوران دونوں مسلمان نہ ہوں تو نکاح باطل ہوجائے گا۔

تمام صورتوں میں مرتد کو توبہ کرنے کی مہلت دی جائے گی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ (توبہ کرانا واجب ہونے کا قول شوافع کے نزدیک قولِ اصح ہے۔ یہی بات ماوردی نے الحاوی الکبیر ١٣/١٥٩ میں اور شیخ الاسلام زکریا نے ''اسنی المطالب'' ٤/١٢٢ میں کہی ہے۔ ابوعلی بن ابوہریرہ جو شوافع کے بڑے علماء میں سے ہیں نے اس کو ابوحنیفہؒ کی طرح مستحب کہا ہے۔ البتہ راجح قول پہلا ہی ہے، کیوں کہ مرتد کو قتل کرنے کا مقصد اس کو ارتداد سے باز رکھنا ہے) اور اس کو اسلام کی طرف رجوع ہونے کا موقع دیا جائے گا، اگر وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے تو بہتر ہے ورنہ اس کو قتل کیا جائے گا اور اس کا مال وراثت میں تقسیم نہیں کیا جائے گا بلکہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

باندی کے ساتھ نکاح حلال نہیں ہے:

آقا اپنی باندی کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتا ہے، چاہے وہ اس کا مکمل مالک ہو یا بعض حصہ کا مالک ہو، اس کا سبب یہ ہے کہ نکاح اور غلامیت ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کا تقاضا یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان انصاف کیا جائے اور عقد نکاح میں طلاق اور ظہار رہوتا ہے، البتہ باندیوں کے درمیان انصاف کرنا شرط نہیں ہے اور ان میں نہ طلاق ہوتا ہے اور نہ ظہار، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص اپنی باندی کے ساتھ عقد کرے تو یہ باطل ہوجاتا ہے، کیوں کہ عقدِ نکاح اور غلامیت ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

عورت اپنے غلام سے نکاح نہیں کرے گی کیوں کہ وہ اس کی مالک ہے:

چاہے آزاد عورت پورے غلام کی مالک ہو یا بعض حصے کی، اس سے عقدِ نکاح جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس کی آقا ہے، اور عورت کو حقِ ملکیت اور حقِ اطاعت حاصل ہے، اگر وہ اس کے ساتھ عقد نکاح میں داخل ہوجائے تو عقدِ نکاح عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت واجب کردیتا ہے۔ جب کہ یہ اپنے غلام پر اپنی ملکیت کے خلاف اور متضاد ہے۔

اگر نکاح کے بعد مالک بن جائے تو نکاح باطل ہوجاتا ہے:

مثلاً کوئی غلام کسی باندی سے نکاح کرے، پھر غلام کو اس کا آقا آزاد کردے اور یہی مال دے کر اپنی بیوی کو اس کے آقا سے خرید لے تو اس صورت میں عقدِ نکاح باطل ہوجاتا ہے، اور اس کی بیوی اس کی باندی بن جاتی ہے، کیوں کہ عقدِ غلامیت عقدِ نکاح سے زیادہ طاقتور ہے کیوں کہ باندی کا مالک اس کا بھی مالک رہتا ہے اور اس کی منفعت کا بھی، البتہ عقدِ نکاح سے شوہر کے لیے اپنی بیوی سے صرف اس کی بعض منفعت ہی حلال ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے طاقت ور تعلق ملکِ یمین کا تعلق ہے، جو کمزور تعلق کو ختم کردیتا ہے۔ ہاں! اگر آزاد بیوی اپنے شوہر کو مہر کے ساتھ جماع سے پہلے خرید لے تو یہ خریداری باطل ہوجاتی ہے اور نکاح باقی رہتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کوئی آزاد عورت کسی غلام سے مہر کے بدلے شادی کرلے جس کی مقدار دس ہزار درہم ہو اور وہ غلام کے مالک کے ذمے ہو اور یہ مالک اپنے غلام کو شادی کی اجازت دے، پھر آزاد عورت اپنے شوہر کو اس مہر سے خرید لے جو مالک کے ذمے میں ہو اور یہ خریداری بیوی کا اپنے شوہر کے پاس جانے سے پہلے ہو تو اس صورت میں یہ خریداری باطل ہوجائے گی اور شادی صحیح ہوجائے گی۔ کیوں کہ اگر ہم اس کے برعکس بات کہیں گے تو خریداری صحیح ہوجائے گی اور نکاح باطل ہوجائے گا، کیوں کہ ملکیت اور نکاح دونوں جمع نہیں ہوسکتے، اگر ہم نکاح کو باطل کہیں گے تو مہر میں عورت کا حق ساقط ہوجائے گا جس مہر سے اس نے شوہر کو خریدا ہے، اس صورت میں عورت کے پاس وہ مال نہیں رہتا ہے جس سے وہ غلام خریدے۔

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کی نکاح صحیح ہوجاتا ہے اور خریداری باطل ہوجاتی ہے، ثابت کرنے میں یہ طریقہ علمِ منطق سے ماخوذ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مکروہ نکاحوں کا بیان

اس فصل میں مکروہ نکاحوں کو بیان کیا گیا ہے، مکروہ اس وجہ سے ہے کہ اس سے دوسرے شخص کو نقصان پہنچتا ہے، یہ نکاح مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔کوئی شخص کسی عورت کو پیغام بھیجے اور عورت کے اولیاء کی طرف سے قبول کیا جائے پھر کوئی دوسرا شخص اس عورت سے شادی کرے تو یہ نکاح مکروہ ہے۔ چاہے قبول کرنے والا ولی مجبر ہو مثلاً باپ یا دادا، یا خود عورت ہو جس کا کوئی ولی مجبر نہ ہو یا سلطان ہو یا باندی کا آقا ہو۔

۲۔ پیغام بھیجنے والے سے کنایۃً پیغام قبول کرلیں مثلاً کہا جائے: خیر ہوگا۔

۳۔یا پیغام بھیجنے والا اجازت نہ دے اور نہ چھوڑے اور جواب دینے والا کنایۃً قبول نہ کرے، اسی طرح مخطوبہ عورت کا نکاح مکروہ ہے جب تک پہلے پیغام بھیجنے والا دوسرے پیغام بھیجنے والے کو اس بات کی اجازت نہ دے کہ وہ اپنی مخطوبہ کے پاس جائے اور اس کو بتائے کہ اس نے پیغام سے رجوع کرلیا ہے۔ یا عورت کا ولی پہلے والے کا پیغام ٹھکرا نہ دے، اگر پیغام قبول کیا جائے اور جاری ہو تو اس مخطوبہ کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا نکاح کرنا حرام بن جاتا ہے۔

۴۔عدت گزانے والی عورت کو صراحۃً اور کنایۃً پیغام بھیجنا اس شخص کے علاوہ کے لیے حرام ہے جس کی وہ عدت گزار رہی ہو: طلاق یا خلع کی عدت گزارنے والی کو عدت کے دوران پیغام بھیجنا حرام ہے، اسی طرح متوفی عنہا زوجہا (وہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو) کو عدت میں صراحۃً پیغام بھیجنا حرام ہے، البتہ کنایۃً پیغام دینا جائز ہے، مثلاً عدت گذارنے والی عورت سے کہے: تمھاری جیسی عورت کہاں ملتی ہے؟ فرمان الٰہی ہے:
’’وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا

مَّعْرُوفًا ‘‘(بقرہ ۲۳۵) (اور اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں جو تم ان عورتوں سے پیغام کے سلسلہ میں اشارہ کنایہ سے کام لو یا اپنے ہی میں اس کو چھپا رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا دھیان ضرور لاؤ گے لیکن تم ان سے چپکے سے کوئی پیمان مت لو سوائے اس کے کہ تم کوئی بھلی بات کہہ دو) ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہا ہے ۶۳۹/۱: اللہ تعالی فرماتا ہے: تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد عدت گذارنے والی کو کنایۃً پیغام بھیجا جائے، صراحۃً نہیں، پھر ابن عباس کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے؛ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ایسی ایسی عورت پسند ہے۔ لیکن جس شوہر کے طلاق یا خلع دینے کی وجہ سے عدت گذار رہی ہے اس کی طرف سے پیغام دینا صحیح ہے۔ یعنی جس شخص کی طرف سے بطور خلع ایک ہزار درہم کے بدلے طلاق دیا گیا ہو، اس کے لیے عدت کے دوران پیغام بھیجنا جائز ہے، یا جب جنون کی وجہ سے عقد فسخ کیا جائے پھر وہ شخص عدت گذرنے سے پہلے صحیح ہو جائے تو اس کے لیے عدت کے دوران ہی اس کو پیغام بھیجنا جائز ہے۔

۵۔طلاقِ رجعی کی عدت گذارنے والی عورت کو نہ صراحتاً پیغام بھیجنا جائز ہے اور نہ کنایتاً، کیوں کہ عدت گذرنے سے پہلے طلاق دینے والے شوہر کو اس سے رجوع کرنے کا حق ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ طلاقِ رجعی کی عدت گذارنے والی کو عدت کے دوران بیوی کے حکم میں مانا جاتا ہے، اگر کوئی ایسا شخص اس عورت کو پیغام دے گا جس کو وہ اپنے شوہر سے افضل اور بہتر سمجھتی ہو تو یہ شخص عورت کو کبھی جھوٹ بولنے اور عدت کی مدت ختم ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور کرسکتا ہے اور اس طرح وہ عدت کے دوران اپنے شوہر کے رجوع کرنے کا حق چھیننے والی بن جائے گی۔

۶۔محلّل (حلالہ کرنے والے) کا نکاح مکروہ ہے یعنی مطلقہ کے ساتھ کوئی شخص اس وجہ سے نکاح کرے کہ وہ اپنے پہلے والے شوہر کے لیے حلال ہو جائے، اگر وہ اس شرط کے ساتھ نکاح کرے کہ اس کے ساتھ جماع کرنے کے بعد طلاق دے گا تو یہ نکاح باطل ہو جائے گا۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ’’التہذیب‘‘ بغوی ۴۴۴/۵) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ محلل کے مکروہ نکاح میں نکاح کی تمام شرعی شرطیں پائی جاتی ہیں یعنی تین طلاق دی ہوئی عورت کا نکاح عدت گذرنے

کے بعد ہوتا ہے اور پہلے شوہر کے ساتھ بھی دوبارہ شادی دوسرے شوہر کی طرف سے طلاق دینے اور عدت گذرنے کے بعد ہوتی ہے، لیکن یہ نکاح مکروہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں استمرار یعنی ہمیشہ ساتھ رہنے کی نیت نہیں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عقدِ نکاح کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے، شریعتِ اسلام نے تمام اعمال اور طاعات کے قبول ہونے کے لیے نیت کو معیار بنایا ہے، ہم نے بگاڑ کے بہت سے قصے سنے ہیں جو شوہروں کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سبب بنتے ہیں، جو کسی بھی عائلی نزاع کی صورت میں اپنی بیویوں کو طلاق دینے میں جلدی کرتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ خود کو اور اپنی بیویوں، بیٹوں اور بیٹیوں کو اور اپنے گھر والوں کو سخت ترین پریشانیوں میں ڈالتے ہیں، جب کہ اللہ سبحانہ تعالی نے عقدِ نکاح کو عورت اور مرد کے درمیان مضبوط معاہدہ کا نام دیا ہے۔ (اللہ کا فرمان ہے: ''وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضٰى بَعْضُكُمْ إِلٰى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا'' (نساء۲۱) (اور تم اس کو کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم ایک دوسرے کے دخیل رہ چکے ہو اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے) امام بغوی نے اپنی تفسیر ''معالم التنزیل'' (۱۸۷/۲) میں تحریر کیا ہے: حسن بصری اور ابن سیرین وغیرہ سے روایت ہے کہ ''المیثاق الغلیظ'' سے مراد عقد کے وقت ولی کا یہ کہنا ہے: میں نے اس کی شادی تمھارے ساتھ اس شرط کے ساتھ کی جو اللہ نے عورتوں کے لیے مردوں پر رکھی ہے کہ معروف طریقہ پر روکا جائے یا بھلے طریقہ سے چھوڑ دیا جائے) اس وجہ سے شوہروں پر اس معاہدہ کا احترام کرنا اور طلاق کی طرف رجوع نہ ہونا ضروری ہے، مگر یہ کہ اصلاح کی سبھی راہیں بند ہوجائیں اور جدائی ہی تنہا حل باقی رہے۔

(مصنف نے یہاں ایک تاجر کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی پھر اس نے چاہا کہ یہ عورت اس کے لیے حلال ہوجائے۔ اس نے اپنے غلام کے ساتھ اتفاق کرلیا کہ وہ اس عورت کے ساتھ شادی کرے پھر اس کو طلاق دے، لیکن اس غلام نے شادی کرنے کے بعد طلاق نہیں دیا حالانکہ آقا نے بڑی کوششیں کی، اور آقا کی بیوی بھی غلام کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوگئی) اگر محلل اس شرط کے ساتھ نکاح کرے کہ جب وہ عورت کے ساتھ جماع کرے گا تو اس کو طلاق دے گا تو اس صورت میں نکاح باطل ہوجائے گا، کیوں کہ یہ نکاح ''نکاح متعہ'' کی قسم میں شمار ہوتا ہے اور اس میں مرد اور عورت کے درمیان تعلقات صرف ایک رات کے لیے ہوتے ہیں جس میں بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں۔

۷۔ عورت کی آزادی یا اس کے نسب کے تعلق سے دھوکہ کھانے والے کا نکاح بھی مکروہ

ہے، اگر وہ عقد میں عورت کے آزاد ہونے کی شرط لگائے پھر اس عورت کا باندی ہونا معلوم ہوجائے اور یہ شخص ایسے لوگوں میں سے ہو جس کے لیے باندی سے نکاح کرنا حلال نہ ہو تو یہ نکاح باطل ہے، کیوں کہ وہ آزاد جس کے پاس لطف اندوزی کے قابل باندی ہو تو اس کے لیے باندی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح جس شخص کے پاس آزاد عورت کا مہر اور نفقہ (اخراجات) ہو تو اس کے لیے باندی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

۸۔ ورنہ نکاح صحیح ہے۔ یعنی جس کو لوگوں نے دھوکہ دے کر باندی سے شادی کرائی ہو، وہ ایسا شخص ہو جس کے لیے باندی سے شادی کرنا حلال ہو تو اس کا نکاح صحیح ہے، اور غلطی خود اس کی ہے کہ اس نے اس عورت کے بارے میں اچھی طرح چھان بین نہیں کی اور اس کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کی۔

۹۔ آزاد کو اختیار رہے: جس آزاد شخص کی شادی دھوکہ سے باندی کے ساتھ کرائی جائے تو اس کو اختیار رہے کہ وہ باندی کو اپنی بیوی باقی رکھے یا عقد فسخ کردے۔ اگر معلوم ہونے کے فوراً بعد ہی عقد فسخ کردے اور ابھی اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو تو اس پر مہر لازم نہیں ہے، اگر اس کے ساتھ جماع کرچکا ہو تو مہرِ مثل واجب ہے۔

اگر غلام ہو اور وہ آزاد عورت کے ساتھ شادی کرانے کی شرط رکھے، لیکن اس کی شادی باندی سے کرائی جائے تو اس کو نکاح فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ وہ دونوں برابر اور یکساں ہیں۔ جب شوہر عقدِ نکاح میں کوئی شرط لگائے اور یہ شرط عقد کو فاسد کرنے والی نہ ہو تو اس شرط کو پورا نہ کرنے سے اس کو عقد فسخ کرنے کا حق ملتا ہے، مثلاً کوئی لڑکی میں یہ شرط رکھے کہ وہ باکرہ ہونی چاہیے، پھر معلوم ہوجائے کہ وہ ثیبہ ہے، یا شرط رکھے کہ لڑکی گوری رہنی چاہیے پھر معلوم ہوجائے کہ وہ کالی ہے تو اس صورت میں عقد فسخ کرنے کا حق حاصل رہتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ فسخ فوراً کیا جائے، تاخیر نہ کی جائے، اگر عقد میں کوئی ایسی شرط نہ پائی جائے جو نکاح صحیح ہونے میں رکاوٹ ہو مثلاً وہ زید کی بیٹی سے شادی کی شرط رکھے پھر عقد کے بعد معلوم ہوجائے کہ عمر کی بیٹے کے ساتھ شادی کرائی ہے تو اس صورت میں عقد باطل ہوجائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے یہ سمجھ کر شادی کرلے کہ وہ آزاد ہے اور اس کے ساتھ جماع کرلے، وہ حاملہ ہوجائے اور اس کو بچہ بھی ہوجائے پھر معلوم ہوجائے کہ وہ باندی ہے تو اس کا بیٹا آزاد ہوگا اور شوہر پر ضروری ہے کہ وہ باندی کے آقا کو پیدائش کے دن کے اعتبار سے بچے کی قیمت ادا کرے۔

جب وہ اپنی بیوی کے آقا کو بچے کی قیمت ادا کردے تو جس نے اس کو دھوکہ دیا ہے اس سے اپنی دی ہوئی قیمت لینے کے لیے رجوع ہوگا، البتہ وہ اپنی بیوی کا مہر واپس نہیں مانگ سکتا ہے، کیوں کہ مہر جماع کے مقابلے میں ضروری ہوجاتا ہے، اسی طرح اس کی بیوی ہونے کے اعتبار سے اس باندی کا کھانا پینا اور پہننا وغیرہ نفقہ لازم ہوجاتا ہے، اگر دھوکہ دینے والا غلام کا آقا ہی ہو مثلاً وہ اپنے وکیل سے کہے کہ میری باندی زعفران کا نکاح اس کے غلام مبروک سے کردے، اور مبروک آزاد عورت کے ساتھ شادی کرانے کی شرط رکھے تو اس صورت میں جب غلام باندی کے ساتھ جماع کرے تو اس پر مہر لازم نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ آقا کے لیے اس کے غلام کی ذمے کچھ بھی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

۱۰۔اگر عورت کا نسب شرط رکھے ہوئے نسب سے کم درجہ کا ہو تو نکاح صحیح ہوجاتا ہے، البتہ اس کے لیے اس صورت میں اختیار ہے جب عورت کا نسب اس شخص کے نسب سے کم تر ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر اہل بیت میں سے ہو اور وہ اہلِ بیت کی لڑکی کے ساتھ ہی شادی کرنے کی شرط رکھے۔ پھر واضح ہوجائے کہ لڑکی اہل بیت میں سے نہیں ہے تو شوہر کو عقدِ نکاح فسخ کرنے یا اس کو باقی رکھنے کا حق ہے، اگر شوہر اہل بیت میں سے نہ ہو اور وہ شرط رکھے کہ بیوی اہل بیت میں سے ہو پھر شادی کے بعد معلوم ہوجائے کہ وہ اہل بیت میں سے نہیں ہے تو شوہر کو عقد فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، کیوں کہ وہ اپنی بیوی سے اعلیٰ نسب والا نہیں ہے۔

۱۱۔اس شخص کے لیے نکاح کرنا مکروہ ہے جس کو نکاح کی ضرورت نہ ہو اور اس کے پاس بیوی کا نفقہ نہ ہو، کیوں کہ وہ اپنی بیوی کو پاکدامن نہیں بنا سکتا ہے اور عام طور پر اس کو بگاڑ کے حوالہ کرتا ہے، یہی حکم اس شخص پر بھی منطبق ہوتا ہے جس کے پاس نفقہ تو موجود ہو لیکن وہ بیمار

ہو یا زیادہ عمر رسیدہ ہو یا عضو تناسل کٹا ہوا ہو یعنی وہ جماع سے عاجز ہو، کیوں کہ وہ اپنی بیوی کو پاکدامن نہیں رکھ سکتا ہے اور عام طور پر اس صورت میں بگاڑ وجود میں آتا ہے۔

۱۲۔مسلمان کا غیر مسلم کافرہ سے نکاح کرنا مکروہ ہے چاہے وہ ذمی ہو یا حربی، کیوں کہ اولاد کا مستقبل خطرہ میں رہتا ہے اور وہ کفر کے خطرات کے چیلنج میں رہتا ہے، اسی طرح ایسی مسلم عورت سے نکاح کرنا مکروہ ہے جو دیارِ کفر میں رہتی ہو اور اس کی عادتیں کافروں جیسی ہوں۔

اس عورت کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے جس کی عدت ختم ہوگئی ہو، لیکن اس کو ابھی حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا شک ہو، اسی طرح فاسقہ عورت سے شادی کرنا بھی مکروہ ہے، کیوں کہ فاسقہ کے پاکدامن ہونے کا کوئی بھروسہ نہیں رہتا ہے، وہ پاکدامن کافرہ سے بدتر ہے، کیوں کہ شادی میں اصل بیوی کی پاکدامنی ہے، کیوں کہ اس سے اولاد کے نسب پر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

فاسق کی بیٹی سے بھی نکاح کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ وہ اپنی بچیوں کو صحیح دینی تربیت نہیں دے سکتا ہے، جس کی تربیت فاسق گھرانے میں ہوئی ہو تو اس کی نگاہوں سے فسق کی قباحت اور برائی کی شناعت ختم ہوجاتی ہے اور اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتی ہے۔

نامعلوم باپ کی بیٹی سے اور لقیطہ (یعنی راستے میں ملی ہوئی بچی) کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ عام طور پر اس کی اولاد کو طعنے دیے جاتے ہیں، اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کی اولاد بھی اسی طرح بن جائیں۔

مکروہ نکاح کی یہ متعدد شکلیں اور اس کے اسباب ونتائج ہیں، عقل مند وہ ہے جو اپنے رب کے اوامر اور اپنی نبی کی سنت کی پیروی کرے اور اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے پاکیزگی و طہارت کے لیے کوشاں رہے تا کہ اس کی اولاد کی نشوونما طہارت اور تقویٰ پر ہو اور ان کا شمار صالح ذریت میں ہو، جس سے معاشرہ طاقت ور بنتا ہے اور اس کے ذریعہ زندگی صالح بن جاتی ہے۔

غلام کے لیے کتنی شادی جائز ہے اور وہ کتنی طلاق دے سکتا ہے؟

غلام کے لیے دو عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے چاہے وہ مکمل غلام ہو یا مبعّض (یعنی وہ جس کا ایک حصہ غلام اور ایک حصہ آزاد ہو) یا وہ مکاتب (یعنی جس نے اپنے آقا کے ساتھ

معاہدہ کیا ہو اور اس سے خود کو خرید لیا ہو) صحابہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ غلام کے لیے آزاد کے نصف حقوق ہیں: آزاد کو چار بیویاں رکھنے کا اختیار ہے اور غلام کو دو بیویاں رکھنے کا۔

۔غلام کو آزاد بیوی رہتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا جائز ہے، لیکن آزاد کے لیے آزاد بیوی رہتے ہوئے باندی سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

۔غلام کو صرف دو طلاق دینے کا اختیار ہے چاہے اس کی بیوی آزاد ہو، کیوں کہ تین مسالک میں طلاق کا اعتبار مرد کے حقوق میں ہوتا ہے، لیکن امام ابوحنیفہ، ابوالعباس بن شریح (آپ اکابر علمائے شوافع میں سے ہیں) کی رائے یہ ہے کہ طلاق میں اعتبار عورت کا ہے، اس وجہ سے ان دونوں کی رائے یہ ہے کہ اگر غلام کی بیوی آزاد ہو تو وہ اس کو تین طلاق دے گا۔ البتہ امام شافعیؒ نے زید بن ثابت اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: غلام کو صرف دو طلاق دینے کا حق ہے۔ (دیکھا جائے ''الام'' شافعی ۲۵۸/۵) کسی بھی صحابی نے ان دونوں کی مخالفت نہیں کی ہے، اسی وجہ سے یہ رائے صحابہ کے اجماع میں شمار کی جائے گی۔

۔اگر غلام اپنے آقا کی اجازت سے شادی کرے تو مہر اس کے آقا کے ذمہ ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے اگر وہ اپنے آقا کی اجازت سے قرض لے تو اس کا آقا قرض کا ضامن بنتا ہے۔

۔اگر وہ کمانے والا ہو یا اس کو تجارت کرنے کی اجازت دی گئی ہو اور وہ آقا کے ذمے رہنے کے باوجود اپنی کمائی میں رہتا ہے مثلاً غلام اپنے آقا کی اجازت سے تجارت کر رہا ہو یا کوئی کام کر رہا ہو، تو مہر اس کی کمائی سے دیا جائے گا کیوں کہ مہر اس کے ذمہ قرض کی طرح ہو جاتا ہے، غلام کی طرف سے اپنی بیوی کو مہر کی ادائیگی واجب ہونا مفوضہ (خود کو شوہر کے حوالے لطف اندوزی کے لیے کرنے والی) کی طرح ہوگا، اس لیے وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہوگی کہ وہ دونوں جماع سے پہلے مہر کی متعین مقدار پر متفق ہو جائیں یا شوہر اس کے ساتھ جماع کرے اور اس پر مہر مثل ضروری ہو جائے، غیر مفوضہ کے ساتھ ایسے نکاح میں جس میں مہر کی ادائیگی متعین نہ ہو تو عقدِ نکاح کے وقت مہر ثابت ہو جاتا ہے اور مہر موجل (بعد میں مہر دینے کی شرط) کی صورت میں عدت آنے پر مہر ثابت ہو جاتا ہے۔

۔جب غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی کرے یا اس کی اجازت سے لیکن اجازت دیے ہوئے معاملہ میں اس کی مخالفت کرے، مثلاً آقا کہے: فائزہ کے ساتھ شادی کرو۔ اور وہ رابعہ کے ساتھ شادی کرے تو اس کی شادی صحیح نہیں ہے، اگر وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو عقدِ نکاح باطل ہو جاتا ہے اور وہ زانی شمار ہوگا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو بھی غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو عقدِ نکاح باطل ہے، اس لیے وہ زانی ہے''۔ ترمذی نے یہ روایت کی ہے اور اس کو حسن کہا ہے، حاکم نے یہ روایت کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے، ابوداؤد نے یہ روایت کی ہے۔ (سنن ابوداود: کتاب النکاح، باب فی نکاح العبد بغیر اذن سیدہ ۱۷۹۲، ترمذی: ابواب النکاح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی نکاح العبد بغیر اذن سیدہ ۱۰۶۵، السنن الکبری للبیہقی: کتاب النکاح، جماع ابواب ماعلی الأولیاء وانکاح الآباء البکر بغیر اذنہا وجہ باب نکاح العبد بغیر اذن مالکہ ۱۲۸۲۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر غلام کا نکاح باطل ہے۔

۔اگر غلام اس کے اور لڑکی کے درمیان جدائی کرائے جانے سے پہلے جماع کر لے تو اس کے ذمہ میں مہر مثل واجب ہو جاتا ہے۔

۔آزاد کے لیے باندی کے ساتھ مندرجہ ذیل چار شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں نکاح جائز ہو جاتا ہے:

۔وہ باندی مسلمان ہو، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''فَمِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ'' (نساء۲۵) پس جس کے تم مالک ہو تمہاری مومن باندیوں میں سے۔

۔وہ مرد آزاد عورت کے ساتھ شادی کرنے سے عاجز ہو، چاہے وہ عورت اہل کتاب میں سے ہی کیوں نہ ہو۔ یا اس کی کوئی آزاد بیوی ہو، لیکن وہ گھن والی بیماری مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو، یا وہ پاگل ہو یا وہ بہت بوڑھی ہو یا وہ گمشدہ ہو یا اس کی اگلی شرمگاہ میں گوشت یا ہڈی ہو جس سے جماع کرنا ممکن نہ ہو، یا وہ بہت کمزور ہو کہ جماع کو برداشت نہ کر سکتی ہو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کی موجوگی میں باندی سے نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (السنن الکبری للبیہقی: کتاب النکاح، جماع ابواب النکاح حرائر اہل الکتاب، باب لا تنکح أمۃ علی حرۃ وتنکح الحرۃ علی الامۃ ۱۳۰۸۹، ''المطالب العالیۃ'' حافظ ابن حجر عسقلانی: کتاب النکاح، باب ما یحرم من النساء ۱۶۰۰) علماء نے اس

روایت کی تشریح یہ کی ہے کہ یہاں مقصود وہ آزاد عورت ہے جو لطف اندوزی کے لائق ہو،اسلام نے باندیوں کے ساتھ شادی میں اس لیے سختی برتی ہے کہ ان کے بچے غلام بن جاتے ہیں، مسلمانوں میں سے کون اپنی اولاد کو اللہ کے علاوہ دوسروں کا غلام بنانا چاہتا ہے؟ اسی وجہ سے اسلام نے آزاد مسلمان عورت کا مہر ادا کرنے کی طاقت نہ رکھنے والے کو مسلمان باندی خریدنے کی ترغیب دی ہے جس سے وہ لطف اندوز ہو سکے،جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:''وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً اَن يَّنكِحَ الْمُحْصِنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ '' (نساء۲۵)(اور تم میں سے جس میں آزاد مومن عورتوں سے شادی کرنے کی طاقت نہیں ہے تو تمہاری مومن ملکیت والی باندیوں سے شادی کرو) آیت میں لفظ''**الطول**'' کے معنی مہر کی ادائیگی کی قدرت ہے اور''**المحصنات**'' کے معنی آزاد عورتوں کے ہیں۔

۔باندی سے نکاح کے جائز ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کو اپنی شہوت کی زیادتی اور تقوی کی کمی کی وجہ سے زنا اور گناہ میں پڑنے کا خطرہ اور اندیشہ ہو،اگر اس کی شہوت اس کے تقوی سے زیادہ طاقت ور نہ ہو اور زنا میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ باندی سے شادی نہ کرے،اللہ تعالی کا فرمان ہے:''ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ''(نساء ۲۵)(یہ اس کے لیے ہے جس کو تم میں سے زنا کا اندیشہ ہو) یہاں''**عنت**'' سے مراد زنا ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی مشقت کے ہیں۔یعنی اگر وہ زنا میں مبتلا ہو جائے تو دنیا میں حدّ زنا کی مشقت لاحق ہوگی اور آخرت میں برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔آزاد مسلمان کے لیے جو باندی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کا مسلمان ہونا شرط ہے،اگر کسی کو ایسی باندی سے شادی کرنے کا موقع ہو جو بعض آزاد ہو اور اس کا بعض حصہ غلام تو پھر اس کے لیے مکمل باندی سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، یہ بھی شرط ہے کہ وہ آزاد مسلمان عورت یا کتابیہ سے بھی شادی کرنے سے عاجز ہو اور وہ باندی خریدنے سے عاجز ہو کہ اس کو باندی سے شادی نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔اگر یہ سبھی شرطیں پائی جائیں تو اس کے لیے صرف ایک باندی سے نکاح کرنا جائز ہے،وہ اپنے نکاح میں دو باندیوں کو نہیں رکھ سکتا ہے۔

وہ عیوب جن کی موجودگی میں مرد یا عورت یا دونوں کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا حق رہتا ہے

بعض عیوب ایسے ہیں جن کی موجودگی میں شوہر کو نکاح فسخ کرنے کا حق رہتا ہے اور بعض عیوب ایسے ہیں جن کی موجودگی میں بیوی کے لیے نکاح فسخ کرنے کی اجازت رہتی ہے یا دونوں کو بھی،اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔وہ عیوب جو مرد اور عورت کے درمیان مشترک رہتے ہیں مثلاً جنون، برص اور جذام۔

۲۔وہ عیوب جو مردوں ہی میں پائے جاتے ہیں مثلاً عضو تناسل کٹا ہوا ہو، یا وہ مکمل جنسی لطف اندوزی سے عاجز ہو۔

۳۔وہ عیوب جو مخصوص عورتوں ہی میں پائے جاتے ہیں مثلاً جماع کی جگہ گوشت پایا جائے یا ہڈی رکاوٹ بنتی ہو۔

نکاح فسخ کرنے کا اختیار دینے والے عیوب سات ہیں: (ان عیوب کی تفصیلات جاننے کے لیے دیکھا جائے''التہذیب''بغوی ۵/۴۵۱)

۱۔پاگل پن؛ چاہے دائمی جنون نہ ہو،علماء نے جنون کی یہ تشریح کی ہے کہ دل سے شعور اور ادراک کی صلاحیت تو ختم ہو جائے البتہ اعضائے بدن میں حرکت ہو اور جسمانی قوت باقی ہو، اگر میاں بیوی میں سے کسی کو جنون لاحق ہو تو دوسرے کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے، ایسی بیہوشی اور غنودگی جس سے شفایابی کی امید نہ ہو تو اس پر بھی جنون کا حکم لگایا جاتا ہے۔

۲۔جذام؛ یہ مرض اعضائے جسمانی کو لاحق ہوتا ہے،جس عضو کو یہ بیماری لگتی ہے وہ پہلے لال ہو جاتا ہے پھر کالا ہو جاتا ہے پھر سڑتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتا ہے، عام طور پر یہ بیماری چہرہ، ہاتھ اور پیروں میں آتی ہے، یہ متعدی بیماری ہے جس کا ابھی تک علاج

دریافت نہیں ہوا ہے، اگر یہ بیماری شوہر میں ہو یا بیوی میں، چاہے ابتدائی مرحلہ ہی میں کیوں نہ ہو تو دوسرے کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے، جب جسم کا رنگ کالا ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لاعلاج ہو گیا ہے۔

۳۔ برص کی بیماری؛ چاہے کم ہی کیوں نہ ہو، اس بیماری کی کوئی دوا نہیں ہے، جس عضو میں یہ بیماری لگتی ہے تو اس کا رنگ پہلے کالا ہو جاتا ہے پھر سفیدی میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب یہ بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے تو اعضاء بہت ہی سفید ہو جاتے ہیں اور اعضاء پر سخت دباؤ ڈالنے کے باوجود لالی اور سرخی نہیں آتی ہے، یہ خون وہاں تک نہ پہنچنے کی دلیل ہے۔ اگر یہ بیماری میاں بیوی میں سے کسی کو لاحق ہو جائے تو دوسرے کو عقد نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے، عقد کے وقت یا اس سے پہلے اس بیماری کے بارے میں معلوم نہ ہونے کی صورت میں فسخ کا اختیار رہتا ہے، اگر عقد سے پہلے یا اس کے دوران بیماری کے بارے میں معلوم ہوا اور اس کے باوجود عقدِ نکاح کیا جائے تو عقد فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، یہ تین اسباب مرد اور عورت میں مشترک ہیں۔

دو ایسے عیب ہیں جو صرف عورتوں میں پائے جاتے ہیں:

۴۔ جماع کی جگہ میں گوشت پایا جائے جس کی وجہ سے یہ جگہ ہی بند ہو۔

۵۔ جماع کی جگہ ہڈی پائی جائے جس کی وجہ سے یہ جگہ بند ہو، اگر ان میں سے کوئی عیب عورت میں پایا جائے تو شوہر کو فسخ کرنے کا حق ہے جب یہ عیب جماع میں رکاوٹ بنے۔

دو عیب ایسے ہیں جو صرف مردوں میں پائے جاتے ہیں:

۶۔ مرد کا عضوِ تناسل کٹا ہوا ہو کہ حشفہ کی مقدار میں بھی باقی نہ ہو۔

۷۔ کامل جنسی قوت نہ پائی جائے اور اس کی شفایابی سے مایوسی ہو۔

ان میں سے کوئی عیب مرد میں پایا جائے تو عورت کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

اگر عضوِ تناسل میں سے حشفہ کے بقدر حصہ باقی ہو تو پھر بیوی کو فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔ (یہ مسلک شافعی کا قولِ اصح ہے۔ البتہ بغوی نے ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے کہ اس صورت میں بھی عقد فسخ کرنے کا

اختیار ہے کیوں کہ وہ ناقص مرد ہے اور اس کے عضوِ تناسل میں عار ہے، دیکھا جائے: "التہذیب" ۵/۴۵۲)۔

اگر عقد کے بعد ثابت ہو جائے کہ اس کا شوہر مخنث ہے اور اس کے دو عضوِ تناسل ہیں: مرد کا بھی اور عورت کا بھی، لیکن وہ مردانہ عضوِ تناسل کو استعمال کر سکتا ہے (یعنی وہ واضح مخنث ہے) تو اس کو فسخ کا حق نہیں ہے، اگر خنثی مشکل ہے (یعنی مرد یا عورت ہونا واضح نہ ہو) تو اس کے لیے اس وقت تک شادی کرنا ہی جائز نہیں ہے جب تک کہ اس کی حقیقت واضح نہ ہو جائے، جب یہ ثابت اور واضح ہو جائے تو اختیار ثابت ہونے کے سلسلہ میں دو اقوال ہیں۔

اگر عقدِ نکاح کے بعد واضح ہو جائے کہ مرد خصی ہے یعنی اس کے دونوں خصیے نہیں ہیں تو بیوی کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، کیوں کہ وہ جماع پر قدرت رکھتا ہے، اگر نکاح کے بعد ظاہر ہو جائے کہ ہمیشہ حیض آتا ہے یعنی استحاضہ کا خون اس کو ہمیشہ آتا ہے تو شوہر کو نکاح فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔

حاکم کے پاس معاملہ لے جانے اور قاضی کے پاس فسخ کے لیے ثبوت پیش کیے جانے کے بعد فوراً نکاح فسخ کیا جائے گا، صرف نامردی کی صورت میں حاکم کے پاس مقدمہ پیش کیے جانے اور یہ ثابت ہونے کے بعد ایک سال تک مہلت دی جائے گی، اگر نامردی ختم ہو جائے تو نکاح فسخ نہیں کیا جائے گا ورنہ عقد فسخ ہوگا اور میاں بیوی کو الگ کیا جائے گا، اگر بیوی نامردی کے ختم ہونے کا انکار کر دے اور وہ ثیبہ ہو تو اس شرط کے ساتھ شوہر کی بات کی تصدیق کی جائے گی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنے کی قسم کھائے۔ اس صورت میں بیوی کو فسخ کرنے کا حق نہیں دیا جائے گا، اگر لڑکی باکرہ ہو اور پردہ بکارت کی موجودگی ثابت ہو تو عورت قسم کھائے گی کہ اس شوہر نے پورے سال میں اس کے ساتھ جماع نہیں کیا ہے اور نہ اس کے بعد، اس پر حاکم اس کی نامردی کو ثابت کرے گا اور بیوی کے اختیار سے ان دونوں کو الگ کیا جائے گا۔ اگر قاضی کے مطالبے پر شوہر قسم کھانے سے باز رہے تو بیوی قسم کھائے گی کہ اس نے جماع نہیں کیا ہے۔ اس صورت میں قاضی کے پاس شوہر کی نامردی ثابت ہو جائے گی، اس وقت بیوی اپنے شوہر سے کہے گی: میں نے اپنا نکاح فسخ کیا۔ اس

طرح وہ شوہر کے ذمہ سے نکل جائے گی۔ اگر بیوی ایک مرتبہ شوہر کی طرف سے جماع کرنے کا اعتراف کرتی ہے تو فسخِ نکاح میں بیوی کا حق ختم ہوجاتا ہے، اگر جماع سے پہلے فسخِ نکاح ہوجائے تو بیوی کو مہر میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا کیوں کہ ان دونوں کو بیوی کی خواہش پر الگ کیا گیا ہے، اگر نامردی کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فسخ عمل میں آئے اور جماع کے بعد ہوتو شوہر کے ذمہ عقدِ نکاح میں طے شدہ مہر لازم آجاتا ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنے زمانے کے اطباء سے نقل کیا ہے کہ جذام اور برص کی بیماری بیوی سے شوہر اور بچوں میں منتقل ہوجاتی ہے۔ (''الام'' ۸۵/۵ میں امام شافعی نے تحریر کیا ہے: طب کے ماہرین اور تجربہ کاروں کے دعوی کے مطابق جذام اور برص بہت سے موقع پر شوہر میں سرایت کر گئے اور یہ بیماری جماع میں بھی رکاوٹ بنتی ہے، کوئی بھی اس بیماری والے سے طیب خاطر کے ساتھ جماع نہیں کرسکتا ہے) آج کے اطباء کہتے ہیں: یہ دونوں بیماریاں وراثتی بیماریوں میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جذامی سے اسی طرح بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو''۔ (صحیح بخاری: کتاب الطب، باب الجذام ۵۷۰۷، السنن الکبری للبیہقی: کتاب النکاح، جماع ابواب اجتماع الولاۃ، باب اعتبار السلامۃ فی الکفاءۃ ۱۲۸۶۴، مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الاطعمۃ من کان یتقی المجذوم ۲۴۰۲۶) جرمنی کی تجربہ گاہوں میں اس حدیث کے اسرار اور رموز پر تحقیقات کی گئی ہیں، جس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جذام کا وائرس عملی طور پر شیر کے مشابہ ہے، حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے جذامی کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ (جامع الترمذی: کتاب الطب، باب ماجاء فی الاکل مع المجذوم ۱۹۳۰) کبھی آپ نے اس کے ساتھ مصافحہ کرنے سے بھی منع کیا تاکہ جذامی سے دور رہنے اور اللہ سبحانہ تعالیٰ پر بھروسہ وتوکل کرنے؛ دونوں کی گنجائش ہو۔ (ابن ماجہ: کتاب الطب، باب الجذام ۳۵۴۲، ترمذی: کتاب الاطعمۃ، باب ماجاء فی الاکل مع المجذوم ۱۸۱۷، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۶۱۲۰، یہ روایت جابر بن عبداللہؓ سے ہے)

میاں بیوی میں سے کوئی مسلمان ہوجائے

(مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے: اسنی المطالب شیخ الاسلام زکریا ۱۶۳/۳۔ حاشیۃ البجیر ی علی منہج الطلاب ۳۷۶/۳)

۱۔ اگر کوئی کافر مسلمان ہوجائے چاہے وہ تابع بن کر ہی کیوں نہ ہو اور اس کی بیوی اہل کتاب میں سے ہو جو اس کے لیے شروع ہی سے حلال ہو تو یہ نکاح باقی رہے گا مثلاً کوئی کافر مسلمان ہوجائے اور کلمہ شہادت کا اقرار کرے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور اس کے اسلام میں داخل ہونے کو اس صورت میں مستقل اپنی مرضی سے داخلہ مانا جائے۔ یا کوئی بچہ ہو اور اس کے والد مسلمان ہوجائے تو اس کے والد کے اسلام کے تابع مان کر اس کو بھی مسلمان مانا جائے گا، ان دونوں صورتوں میں اگر یہ شخص جو اسلام لے آیا ہے کسی اصل کتابیہ کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کیوں کہ اس شرط کے ساتھ مسلمان کے لیے کتابیہ کے ساتھ نکاح جائز ہے کہ اس عورت کے گھر والے اسلام سے پہلے ہی سے مسیحی یا یہودی رہے ہوں۔

۲۔ یا عورت غیر کتابیہ ہو اور وہ اسلام نہ لائے، یا یہ عورت اسلام لے آئے اور شوہر مسلمان نہ بنے تو جماع سے پہلے یہ واقعہ پیش آئے تو نکاح باطل ہوجائے گا، یعنی اگر مرد غیر کتابیہ مثلاً مجوسی عورت کے ساتھ شادی کرے یا شوہر بت پرست ہو پھر وہ اسلام لائے اور بیوی اسلام نہ لائے تو اگر اسلام لانے والے شوہر نے اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو تو اس کا نکاح باطل ہوجاتا ہے، کیوں کہ جماع سے پہلے جدائی کی صورت میں عدت نہیں رہتی ہے، اگر مجوسی یا بت پرست بیوی اسلام لے آئے اور اس کا شوہر اسلام قبول نہ کرے تو نکاح باطل ہوجاتا ہے، اگر شوہر کے مسلمان ہونے کی وجہ سے نکاح باطل ہوجائے تو اس صورت میں شوہر کی وجہ سے جدائی ہوگی، اس لیے شوہر کے ذمے واجب ہے کہ وہ بیوی کا نصف مہر ادا کرے، اگر نکاح بیوی کے اسلام

لانے کی وجہ سے باطل ہوجائے تو بیوی کا مہر میں کوئی حق نہیں ہے، کیوں کہ جدائی اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔(دیکھا جائے ''التہذیب''بغوی ۵/۴۱۰) ان دونوں حالتوں میں جدائی کو فسخ نکاح کا حکم ہوگا، کیوں کہ یہ جدائی جماع سے پہلے ہوئی ہے، یعنی اس کو دونوں کے درمیان ایک طلاق نہیں مانا جائے گا، اگر دونوں بعد میں اسلام لے آئیں اور دونوں کے ولی اور گواہوں کی موجودگی میں شادی ہوجائے تو شوہر کو تین طلاق کا حق رہتا ہے۔

۳۔یا جماع کے بعد اسلام لے آئے، اگر عدت کے دوران دونوں اسلام لے آئیں تو نکاح باقی رہتا ہے، ورنہ میاں بیوی میں سے پہلے اسلام لانے والے کی وجہ سے تفریق ہوگی، اس پر اجماع ہے، یا جماع کے بعد ان میں سے کوئی اسلام لے آئے اور دوسرا اسلام نہ لائے تو اس صورت میں ان دونوں کے درمیان تفریق کے لیے بیوی کی عدت گذرنی ضروری ہے، اگر دوسرا بھی عدت کے دوران اسلام لے آئے تو ان کا نکاح باقی رہے گا، اگر میاں بیوی میں سے ایک اسلام لے آئے اور دوسرا اسلام نہ لائے اور عدت ختم ہوجائے تو میاں بیوی میں سے کسی کے اسلام لانے کے وقت سے ہی ان دونوں کے درمیان تفریق ہوگی، اور ان دونوں کے درمیان اس جدائی کو فسخ کا حکم ہوگا اور اس کا شمار طلاق کی تعداد میں نہیں ہوگا، ان دونوں کو الگ کرنے پر علماء کا اتفاق اور اجماع ہے۔

۴۔اگر کافر میاں بیوی ایک ساتھ اسلام لے آئیں، چاہے جماع کے بعد ہو یا جماع سے پہلے تو ان دونوں کا نکاح باقی رہے گا، اس پر علماء کا اجماع ہے جیسا کہ ابن المنذر وغیرہ نے واضح کیا ہے۔ان دونوں کا اسلام ایک ساتھ اسی وقت مانا جائے گا جب وہ شہادتین کے آخری الفاظ ایک ساتھ ادا کریں۔

۵۔اگر ایک ساتھ ادا کرنے میں شک ہو اور یہ جماع کے بعد ہو اور عدت کے دوران دونوں مسلمان ہوجائیں تو نکاح باقی رہے گا۔

۶۔یا جماع سے پہلے ہو؛ اگر دونوں ایک ساتھ شہادتین ادا کریں یا ایک کے ختم ہونے کے بعد دوسرا تو اس پر عمل کیا جائے گا۔یعنی اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ مسلمان ہونے

پر متفق ہوں تو اس اتفاق پر عمل کیا جائے گا اور ان دونوں کا نکاح باقی رہے گا، اگر دونوں اس بات پر متفق ہوں کہ وہ دونوں ایک ساتھ اسلام نہیں لائیں گے اور شوہر کا اسلام پہلے ہوگا یا بیوی کا اسلام پہلے ہوگا تو ان دونوں میں سے ایک کے پہلے اسلام لانے کے وقت سے ہی جدائی عمل میں آئے گی، اگر جماع سے پہلے یہ واقعہ پیش آئے تو بیوی پر عدت نہیں ہوگی، اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان فوراً تفریق عمل میں آئے گی، اگر جماع کے بعد ہوا اور دونوں کے درمیان جدائی عمل میں آئے اور شوہر کا اسلام پہلے ہو تو بیوی نصف مہر کی مستحق بنے گی، کیوں کہ ان کے درمیان جدائی شوہر کی وجہ سے ہوئی ہے، اگر بیوی پہلے اسلام لے آئے تو مہر میں اس کا کوئی حق نہیں ہے، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔(دیکھا جائے ''التہذیب''بغوی ۵/۴۱۰)

۷۔اگر شوہر کہے کہ یکے بعد دیگرے اسلام لائے ہیں تو اس کی بات قبول کی جائے گی، اگر بیوی کہے: ہم دونوں ایک ساتھ مسلمان ہوئے ہیں تو شوہر کی بات قسم لے کر قبول کی جائے گی، کیوں کہ اس صورت میں شوہر مدعی علیہ ہے اور بیوی مدعی، جب کہ فقہاء نے کہا ہے: مدعی وہ ہے جس کی بات ظاہر کے خلاف ہو اور مدعی علیہ وہ ہے جس کی بات ظاہر کے مطابق ہو۔اس معاملہ میں ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں کا اسلام ایک ساتھ نہیں ہے، اسی وجہ سے شوہر کی بات اس شرط کے ساتھ قبول کی جائے گی کہ وہ اپنی بات صحیح ہونے پر قسم کھائے۔

جب شوہر قسم کھائے اور یہ جماع سے پہلے ہو تو نکاح فسخ ہوجائے گا، اگر جماع کے بعد ہو؛ تو اس صورت میں عدت کے دوران دونوں مسلمان ہوجائیں تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ فسخ ہوجائے گا۔اگر بیوی کہے: ہم یکے بعد دیگرے مسلمان ہوئے ہیں۔اور شوہر کہے: بلکہ ہم ایک ساتھ مسلمان ہوئے ہیں تو اس وقت بھی شوہر کی بات قسم لے کر مانی جائے گی، کیوں کہ عصمتِ نکاح شوہر کے ہاتھ میں رہتا ہے اور عصمتِ نکاح جب موکد رہتا ہے تو صرف شک کی بنیاد پر ختم نہیں ہوتا ہے، اگر شوہر قسم کھائے تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔اگر شوہر کہے: ہم یکے بعد دیگرے مسلمان ہوئے ہیں۔اور شوہر اپنی بات صحیح ہونے پر قسم بھی کھائے۔اگر یہ جماع سے پہلے ہو تو

جدائی کی جائے گی ،کیوں کہ اس صورت میں نکاح فسخ اور باطل ہوجاتا ہے، اگر جماع کے بعد ہوا اور عدت کے دوران دونوں اسلام لے آئیں تو نکاح باقی رہتا ہے، ورنہ دو میں سے سب سے پہلے اسلام لانے والے کے اسلام لانے کے بعد سے ہی نکاح باطل ہوجاتا ہے۔

۸۔اگر کوئی شخص اسلام لے آئے اور اس کی دو بیویاں ایسی ہوں جن کو ایک ساتھ اسلام میں رکھنا حرام ہو مثلاً دو بہنیں تو دو میں سے ایک کا انتخاب کرے گا جب وہ خود سے انتخاب کرنے کا اہل ہو اور ان دونوں کے ساتھ عقد یکے بعد دیگرے ہوا ہو۔ مثلاً کوئی شخص ایسی دو عورتوں سے شادی کرلے جن کو اسلام میں ایک ساتھ رکھنا حرام ہو مثلاً دو بہنیں، پھر وہ اسلام لے آئے تو اس صورت میں اس پر ضروری ہے کہ وہ ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرے اور دوسری کو طلاق دے تا کہ وہ عدت گذار کر دوسرے ایسے شخص سے شادی کرلے جو اس کے لیے حلال ہو۔

اگر وہ بچہ ہو اور اس کا باپ اس کی شادی کرائے، اس صورت میں وہ انتخاب کے حق کا مالک نہیں رہتا ہے، اس صورت میں اس کے لیے بالغ ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے، پھر وہ ان دونوں میں سے کسی کا انتخاب کرے گا، بالغ ہونے تک اس پر دونوں کا نفقہ لازم ہے، بعد میں وہ ان میں سے ایک کو طلاق دے گا، اگر دونوں بیویاں اس کے ساتھ اسلام لے آئیں، اور کسی کا انتخاب کرے تو دوسرے کا نکاح فسخ ہوجائے گا۔ اگر دونوں میں سے ایک مسلمان ہوجائے اور دوسری کفر ہی پر رہے تو مسلمان بیوی کا نکاح باقی رہے گا اور کافر بیوی کا فسخ ہوجائے گا۔

۹۔اگر شوہر آزاد ہو اور اس کی چار سے زیادہ بیویاں ہوں، اگر وہ انتخاب کرنے کا اہل ہو (یعنی بچہ نہ ہو) تو چار بیویوں کو اپنے ساتھ رکھے گا اور باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہوجائے گا۔

اگر شوہر چھوٹا بچہ ہو اور اس کا باپ اس کی شادی ایک سو عورتوں سے کرائے اور وہ سبھی اسلام لے آئیں تو نہ اس چھوٹے بچے شوہر کو اختیار ہے اور نہ اس کے ولی کو، شوہر کے بالغ ہونے اور اس کی طرف سے انتخاب کیے جانے تک انتظار کرنا ضروری ہے، اور ان سو بیویوں کا نفقہ بالغ ہونے تک اور انتخاب کرنے تک اس پر ہوگا، خلاصہ کلام یہ کہ اگر شوہر بچہ

ہو تو یہ سو بیویاں اس کے بالغ ہونے اور ان میں سے چار کا انتخاب کرنے تک انتظار کریں گی، بچہ کے ولی کو چار کے انتخاب کا اختیار نہیں ہے، جب شوہر بالغ ہوجائے اور ان میں سے چار کا انتخاب کرلے تو باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہوجائے گا اور بالغ ہونے تک ان سبھوں کا نفقہ اس کے ذمے رہے گا، جب وہ ان میں چار کا انتخاب کرے گا تو سو میں سے باقی بیویوں کے عقود فسخ ہوجائیں گے۔

۱۰۔اگر شوہر آزاد نہ ہو اور اس کی دو سے زائد بیویاں ہوں تو دو کا انتخاب کرے گا، جب وہ دونوں اس کے ساتھ مسلمان ہوئی ہوں مثلاً کوئی غلام اسلام لے آئے اور اس کے پاس اسلام قبول کرنے سے پہلے دو سے زائد بیویاں ہوں تو اس صورت میں وہ ان میں سے دو کا انتخاب کرے گا، دو کے انتخاب کی صورت میں باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہوجائے گا، جب وہ سب اس کے ساتھ اسلام لے آئیں یا عدت کے دوران اسلام لے آئیں۔

۱۱۔اگر غلام اسلام لے آئے اور اس کی دو سے زائد اہل کتاب بیویاں ہوں تو وہ دو کا انتخاب کرے گا اور باقی کا نکاح فسخ ہوجائے گا، اگر غلام اسلام لے آئے اور اس کی کافر بیویاں ہوں جن میں سے دو اہل کتاب میں سے ہوں تو وہ دونوں اسلام کے بعد اس کے لیے حلال رہیں گی اور غیر اہل کتاب باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہوجائے گا، کیوں کہ اس کو دو اہل کتاب بیویوں کو چھوڑ کر کسی پر بھی حق نہیں ہے۔

اگر اسلام لانے والا آزاد ہو اور اس کے پاس یہود ونصاری میں سے اہل کتاب بیویاں ہوں جن کے ساتھ اس کے لیے اسلام لانے کے بعد بھی نکاح حلال ہو تو اس کو اپنے نکاح میں چار سے زائد بیویوں کو رکھنے کا حق نہیں ہے، جب ان میں سے چار بیویوں کا انتخاب کرے گا تو باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہوجائے گا۔

اگر غلام دو بہنوں کے ساتھ عقد ایک ہی مجلس میں کرے تو دونوں کے ساتھ عقد باطل ہوجائے گا، اگر یکے بعد دیگرے کرے تو دوسرا نکاح باطل ہوجائے گا، اگر وہ الگ الگ عورتوں سے نکاح کرے تو اس کو اپنی بیویوں میں سے دو کو باقی رکھنے کا حق ہے، چاہے ان

کے ساتھ ایک ہی مجلس میں عقد کیا ہو یا یکے بعد دیگرے، یہ حکم غلام کے لیے ہے جس کو مسلمان ہونے کی صورت میں دو سے زیادہ شادی کرنا حلال نہیں ہے، اگر آزاد ہے تو اس کو اپنی بیویوں میں سے چار کا انتخاب کرنے کا حق ہے چاہے ان کے ساتھ ایک ہی مجلس میں نکاح کیا ہو یا یکے بعد دیگرے۔

۱۲۔ اگر وہ انتخاب کرنے سے انکار کرے تو انتخاب کرنے تک اس کو قید کیا جائے گا اور اس کی بیویوں پر اس کے مال میں سے نفقہ دیا جائے گا، اگر وہ اپنے انکار پر مصر رہے تو حاکم اس کی تادیب کرے گا اور اس کو سزا دے گا اور اس کو منتخب کرنے کے لیے کہا جائے گا، اگر اس پر بھی وہ انکار کرے تو اس کو مارا جائے گا یہاں تک کہ وہ انتخاب کر لے، اس کو وقفہ وقفہ سے مارا جائے گا تا کہ پہلی مار کی تکلیف ختم ہو جائے۔

۱۳۔ اگر آزاد کی بیویاں باندی ہوں اور وہ سب اس کے ساتھ ہی یا عدت کے دوران اسلام لے آئیں تو ان کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے کیوں کہ آزاد کے لیے باندی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اس کے جائز ہونے کے لیے چند شرطیں ہیں۔

۱۴۔ اگر اس کے لیے باندی سے نکاح جائز ہو اور وہ سب اس کے ساتھ ہی اسلام لے آئیں تو اس کو ان میں سے صرف ایک کو منتخب کرنے کا اختیار رہے، جو اس کے لیے حلال ہو، یعنی شوہر اس وقت اسلام لے آئے جب اس پر باندی سے شادی کرنے کی سبھی شرطیں منطبق ہوتی ہوں یعنی وہ آزاد عورت کا مہر دینے اور نفقہ دینے سے عاجز ہو اور اس کو باندی سے شادی نہ کرنے کی صورت میں زنا میں پڑنے کا خطرہ ہو، اگر اس کے ساتھ اس کی باندی بیویاں اسلام لے آئیں تو اس کو ان میں صرف ایک ہی کے انتخاب کا حق ہے اور باقی باندیوں کا عقد فسخ ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ اگر کوئی مسلمان ہو اور اس کی بیویوں میں سے ایک آزاد اور ایک باندی ہو، اگر وہ سب اس کے ساتھ ہی یا عدت کے دوران اسلام لے آئیں تو آزاد بیوی ہی کا نکاح باقی رہے گا، یا شوہر کافر ہو اور وہ ایک آزاد عورت اور متعدد باندیوں سے شادی کرے پھر وہ

اسلام لے آئیں، یا اپنی عدت کے دوران اسلام لے آئیں تو اس صورت میں آزاد کا نکاح باقی رہتا ہے اور باندیوں کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

۱۶۔ اگر آزاد عورت عدت گذرنے تک کفر پر اصرار کرے تو وہ باندی کا انتخاب کرے گا، یہ اس وقت ہے جب اس کے لیے باندی حلال ہو یعنی اگر وہ اسلام لے آئے۔

۱۷۔ اگر شوہر اسلام لے آئے اور اس کی بیویوں میں اہل کتاب عورت اور اس کی بیٹی بھی ہو اور وہ دونوں بھی اسلام لے آئیں؛ اگر ان دونوں کے ساتھ جماع نہ کیا ہو یا بیٹی کے ساتھ جماع کیا ہو تو بیٹی ہی کا نکاح باقی رہے گا اور ماں کا نکاح فسخ ہو جائے گا کیوں کہ اسلام میں ماں اور بیٹی کا نکاح ایک ہی شخص کے ساتھ حلال نہیں ہے۔

۱۸۔ اگر ان دونوں کے ساتھ جماع کرے یا ماں کے ساتھ تو دونوں ہمیشہ کے لیے اس کے لیے حرام ہو جاتی ہیں، کیوں کہ ماں کے ساتھ جماع کرنے سے بیٹی حرام ہو جاتی ہے، اور بیٹی کے ساتھ عقدِ نکاح کرنے سے ماں کے ساتھ نکاح حرام ہو جاتا ہے، اگر ان دونوں کے ساتھ جماع کرنے یا نہ کرنے میں شک ہو جائے تو بیٹی کا نکاح باقی رہ جاتا ہے، کیوں کہ اصل جماع نہ کرنا ہے، اگر یہ بات یقینی ہو کہ جماع تو کیا ہے لیکن کس کے ساتھ کیا ہے معلوم نہ ہو تو واضح ہونے اور یقین ہونے تک دونوں اس پر حرام رہیں گی۔

آزاد ہونے والی باندی کے لیے اختیار

(خیار کا مطلب نکاح فسخ کرنے یا اس کو باقی رکھنے کا حق ہے، اس کی تین قسمیں ہیں: أ۔خیار غرور؛ مثلاً کوئی شخص اس شرط کے ساتھ کسی عورت کے ساتھ نکاح کرے کہ وہ آزاد ہو، عقد کے بعد معلوم ہوجائے کہ وہ باندی ہے تو اس صورت میں شوہر کو نکاح فسخ کرنے یا اس کو باقی رکھنے کا اختیار ہے۔ب۔خیار عیب؛ مثلاً کوئی شخص عورت کے ساتھ نکاح کرے اور عقد کے بعد معلوم ہوجائے کہ شوہر پاگل ہے تو اس صورت میں شوہر یا بیوی کو نکاح فسخ کرنے یا اس کو باقی رکھنے کا اختیار ہے۔ ج۔خیار عتق: مثلاً کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ اس شرط پر عقدِ نکاح کرے کہ وہ آزاد ہو، پھر معلوم ہوجائے کہ وہ باندی ہے تو اس کو فسخ کرنے یا جاری رکھنے کا اختیار ہے، یا کسی باندی سے عقد کرے پھر اس کا آقا اس کو آزاد کرے جس کے نتیجہ میں وہ آزاد ہوجائے اور اس کا شوہر غلام ہی ہو تو اس صورت میں بیوی کو عقدِ نکاح فسخ کرنے کا حق ہے)

اس باب میں غلام سے شادی شدہ باندی کے احکام بیان کیے گیے ہیں جب وہ آزاد ہوجائے اور وہ کسی غلام کی بیوی بنے رہنے پر راضی نہ ہو، اس صورت میں بیوی کو فسخِ نکاح کا اختیار ہے تاکہ وہ غلام کے نکاح سے نکل جائے اور چاہے تو آزاد کے ساتھ شادی کرے:

ا۔اگر وہ اپنے آقا کی غلامی سے آزاد ہوجائے تو اس کو اختیار حاصل ہوجاتا ہے چاہے شوہر نے اس کے ساتھ جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو، کیوں کہ اس نکاح سے نقصان اس کا ہوتا ہے؛ نفقہ اور مہر کے اعتبار سے وہ نقصان میں رہتی ہے، اور معاشرتی طور پر بھی اور اولاد کے اعتبار سے بھی نقصان ہوتا ہے کیوں کہ بچوں کو آزاد باپ کی زیادہ ضرورت رہتی ہے جو ان کی دیکھ ریکھ کرے، نہ کہ غلام باپ کی جو ہر وقت اپنے آقا کی خدمت میں رہتا ہے۔

اس مسئلہ کی دلیل یہ ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک باندی تھی جس کا نام بریرہ تھا، یہ باندی ایک حبشی غلام کی بیوی تھی جس کا نام مغیث تھا، سیدہ عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہ کو اس شرط کے ساتھ آزاد کردیا کہ اس کو باندی پر حق ولاء حاصل رہے گا۔

مُغیث اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی سے درخواست کی کہ آزاد ہونے کے بعد وہ نکاح فسخ نہ کرے، لیکن اس نے انکار کیا، پھر مغیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور آپ سے درخواست کی کہ بریرہ سے ان کو نہ چھوڑنے کی سفارش کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے درخواست کی تو اس نے آپ سے دریافت کیا !اللہ کے رسول ! آپ سفارشی ہیں یا حکم دینے والے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ میں سفارشی ہوں''۔اس پر بریرہ نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔(صحیح بخاری: کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرة ٤٩٨١) پھر رسول اللہ نے مغیث کے لیے دعا کی کہ اللہ ان کے دل سے بریرہ کی محبت نکال دے تو انہوں نے بریرہ کو ناپسند کرنا شروع کیا، بریرہ میں مغیث کی محبت لوٹ آئی، لیکن وہ بریرہ سے راضی نہیں ہوئے، جب کہ اس نے مغیث کی درخواست اور رسول اللہ کی سفارش ٹھکرادی تھی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو رسول اللہ کی سفارش کو نہ مانے تو وہ کافر نہیں ہوتا ہے اور مال، بیوی اور خاندان کے مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف نصیحت کی قبیل سے جو رائے ہوتی ہے وہ حکم میں شامل نہیں ہے، بریرہ کے واقعہ میں جب وہ آزاد ہوگئی تو اس نے مغیث کے ساتھ اپنا عقد فسخ کیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش اور سیدہ عائشہؓ کی اس درخواست پر راضی نہیں ہوئی کہ وہ مغیث کی عصمتِ نکاح ہی میں رہے، پھر اس کے بعد بریرہ کو بڑی ندامت ہوئی۔

اس واقعہ میں فقہی حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی غلام سے شادی شدہ باندی اگر آزاد ہوجائے تو اس کو اپنا نکاح فسخ کرنے یا باقی رکھنے کا اختیار رہتا ہے۔(اس کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ٥/٤٦٢)

٢۔اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ جماع سے پہلے باندی کو آزاد کیا جائے اور آقا مرض الموت کا شکار ہوجائے اور ایک تہائی میں باندی کی قیمت کے ساتھ مہر کے ساقط ہونے کی گنجائش نہ ہو، یعنی اگر باندی اپنے شوہر کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے آزاد ہوجائے اور اس کا آقا مرض الموت میں اس کو آزاد کردے اور اس کی وراثت کا ایک تہائی اس باندی کی

قیمت سے باندی کا مہر شامل کیے جانے کے بعد کم ہو، کیوں کہ جو مرض الموت میں ہو تو اس کو اپنے مال میں ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف کا حق اور اختیار نہیں ہے، اس صورت میں باندی آزاد نہیں ہوتی ہے اور اس کو نکاح فسخ کرنے کا بھی اختیار نہیں رہتا ہے۔

جب باندی آزاد ہو جائے تو اس کو فسخ کا حق فوراً ملتا ہے، یعنی وہ اگر نکاح فسخ کرنا چاہے تو آزاد ہونے کے فوراً بعد یا اپنی آزادی کے بارے میں معلوم ہونے کے فوراً بعد فسخ کی اپنی خواہش کا اظہار کرے۔

۳۔اگر اس کا غلام شوہر آزاد ہو جائے: یعنی اگر باندی کی طرف سے فسخ کیے جانے سے پہلے غلام شوہر آزاد ہو جائے، یا اس کے ساتھ ہی آزاد ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے، اگر بیوی کے ارادہ سے خارج کسی سبب کی وجہ سے مثلاً آزادی کے بارے میں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے فسخ میں تاخیر ہو جائے اور وہ فسخ کرنا چاہتی ہو تو اس کی بات قسم لے کر مانی جائے گی، اگر اس کا شوہر فسخ سے پہلے آزاد ہو جائے یا اس کے ساتھ ہی آزاد ہو جائے تو فسخ کا اس کو اختیار نہیں رہتا ہے، اگر باندی کا ایک حصہ آزاد ہو جائے، مکمل آزاد نہ ہو تو اس کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی باندی آزاد ہو جائے اور اس کا شوہر پہلے ہی سے آزاد ہو تو اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں ہے۔

۴۔اس فسخ میں معاملہ حاکم کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے: میں نے اپنے شوہر فلاں سے اپنا نکاح فسخ کیا۔اس سے یہ مطالبہ بھی نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرے۔

حائضہ کے ساتھ اگلی شرمگاہ میں جماع کرنے کے مسائل

اس فصل میں حائضہ بیوی کے ساتھ اگلی شرمگاہ میں جماع کرنے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں، جب کہ پچھلی شرمگاہ میں جماع کرنا مطلقاً حرام ہے چاہے حیض کے ایام میں ہو یا ان کے علاوہ دنوں میں۔

امام ترمذی اور امام ابن حبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”اللہ عزوجل اس شخص کی طرف نہیں دیکھے گا جو پچھلی شرمگاہ میں جماع کرے“۔(ترمذی: ابواب الرضاع عن رسول اللہ، باب کراھیۃ اتیان النساء فی ادبارھا ۱۱۲۱، صحیح ابن حبان: کتاب الحدود، باب الزنی وحدہ، ذکر التغلیظ علی من اتی رجلا او امراۃ فی دبرھما ۴۴۸۲، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ”الزواجر عن اقتراف الکبائر“ ابن حجر ہیتمی ۲/۵۸۲، اس کتاب میں علامہ ہیتمی نے اس قبیح عمل کی حرمت پر دلالت کرنے والے نصوص کو بہترین انداز میں جمع کیا ہے، اور اس امر شنیع کی شناعت میں بہت سی حدیثوں کو بیان کیا ہے) یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پچھلی شرمگاہ میں جماع کرنا ایڈز کے اسباب میں سے ہے، ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اس بدترین عمل سے باز رہے جو ہر بہترین اخلاق کے خلاف ہے۔

اگر کوئی اپنی حائضہ بیوی کے ساتھ اگلی شرمگاہ میں ابتدائے حیض میں جماع کرے تو اس کے لیے ایک دینار صدقہ کرنا مسنون ہے، اگر آخری ایام میں جماع کرے تو نصف دینار صدقہ کرنا سنت ہے، دارمی اور ترمذی رحمہما اللہ نے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کوئی اپنی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں جماع کرے اور خون لال ہو تو وہ ایک دینار صدقہ کرے، اگر پیلا ہو تو نصف دینار صدقہ کرے“۔(سنن الدارمی: کتاب الطہارۃ، باب من قال علیہ الکفارۃ ۱۱۴۳، جامع الترمذی: ابواب الطہارۃ عن رسول اللہ، باب ما جاء فی کراھیۃ اتیان الحائض ۱۳۷) ابتدائے حیض اور آخری ایام حیض میں فرق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ

آدمی شروع ایام میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنے کا کم ضرورت مند رہتا ہے اور آخری ایام میں زیادہ خواہش رہتی ہے۔

حالتِ حیض میں بیوی کے ساتھ جماع کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اگر اس کو کوئی حرام نہ سمجھے تو وہ کافر ہے، اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ شوہر کو زنا میں پڑنے کا خطرہ ہو اور اس کو اپنی طبیعت کی وجہ سے زنا کا یقین ہو، کیوں کہ حائضہ کے ساتھ جماع کرنے کی سزا زنا کی سزا سے کم ہے، جب کہ دونوں حرام ہیں، ہر گناہ سے توبہ کرنا ضروری ہے، اس کے لیے ندامت اور گناہ سے باز رہنے کا پختہ ارادہ بھی ہو، دو رکعات نماز پڑھے اور استغفار کرے اور صدقہ کرے۔

والدین کو پاک دامن بنانے کے احکام

باپ اور دادا کو پاک دامن بنانے کی ذمہ داری بچوں کی ہے یعنی اگر باپ اور دادا کی بیوی نہ ہو تو ان کی شادی کرانا بچوں کی ذمہ داری ہے، یہ ان بچوں پر واجب ہے جن کے پاس اپنے یومیہ اخراجات سے زیادہ اتنا مال ہو جو باپ کی شادی کرانے کے لیے مہر دینے اور اس کے اخراجات پورا کرنے کے لیے کافی ہو:

۱۔ بچہ پر اپنے باپ اور دادا کو پاک دامن بنانا ہر مالدار، آزاد اور قادر بچے پر ضروری ہے، چاہے وہ بیٹا ہو یا بیٹی کہ وہ اپنے باپ اور دادا کی شادی کرائے تا کہ ان کو پاکدامن بنایا جائے، اگر بچے ایک سے زیادہ ہوں تو ان سبھوں پر اپنے والد کی شادی کے اخراجات اور مہر اور بیوی کے لیے گھر کی فراہمی ضروری ہے اور نکاح و مہر کے اخراجات ان کے درمیان وراثت کے حساب سے تقسیم کیے جائیں گے، اگر وہ سب وراثت میں برابر ہوں مثلاً چند بیٹے ہوں، اگر وہ وراثت میں مختلف ہوں تو سب سے قریبی کو مقدم کیا جائے گا، اس لیے نواسا پوتے کے بیٹے پر مقدم ہوگا۔ ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ پاک دامن بنانا مال دار پر ضروری ہے جس کے پاس اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت سے زیادہ مال ہو، اور یہ اس وقت ضروری ہے جب باپ یا دادا اپنی ضرورت کا اظہار کریں۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۹/۱۸۴)

شریعت اسلامی نے اس مسئلہ اور دیگر تمام مسائل کے سبھی پہلوؤں پر توجہ دی ہے کیوں کہ مالدار اولاد اپنے والدین کے اخراجات اور نفقہ کی مکلّف ہیں، اسی طرح وہ اپنے آباء کی شادی کرانے اور ان کی بیویوں کا نفقہ دینے کے بھی مکلّف ہیں، جہاں تک ماں کا تعلق ہے تو اس کی اولاد شادی کرانے اور اس کے شوہر پر خرچ کرنے کے مکلّف نہیں ہیں، بلکہ اس پر اس سے شادی کرنے والا یعنی شوہر خرچ کرے گا، اگر وہ فقیر ہو اور بچے اس کی معاونت کریں تو ان کی طرف سے صدقہ ہوگا، اور یہ باپ اور اس کی بیوی کے نفقہ کی طرح واجب نہیں ہے، اولیت عصبہ کو حاصل ہے،

مثلاً دادا یا نانا، کیوں کہ باپ دادا کا عصبہ بنتا ہے اور ماں کا باپ (نانا) ذوی الارحام میں سے ہے۔

اگر سبھی عصبہ برابر درجہ کے ہوں تو سب سے قریبی کو اولیت حاصل ہوگی مثلاً باپ اور دادا ہو تو باپ کو اس مسئلہ میں دادا پر مقدم کیا جائے گا، اگر عصبہ میں سے نہ ہو بلکہ ذوی الارحام یکساں ہوں تو سب سے قریبی کو مقدم کیا جائے گا، اگر وہ رشتہ داری میں برابر اور یکساں ہوں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا قرعہ اندازی کے ذریعہ انتخاب کیا جائے گا۔ باپ دادا کی شادی کرانے کا مقصد ان کو زنا میں گرفتار ہونے سے بچانا ہے، جب کہ اللہ تعالی نے ہم کو حکم دیا ہے: ''**وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا**'' (لقمان ۱۵) اور ان کے ساتھ دنیا میں بھلائی کے ساتھ رہو۔

۲۔ یہ بھی حکم ہے کہ باپ کو نکاح سے پہلے آزاد عورت کا مہر دیا جائے جو اس کے لائق ہو۔ یا باپ سے کہے: آپ نکاح کیجئے، میں آپ کو مہر دوں گا۔ یا اس کی اجازت سے اس کا نکاح کرا دے اور مہر ادا کرے، یا اس کو باندی یا اس کی قیمت کا مالک بنادے۔

بیٹے کے لیے اپنے والد کی شادی کے لیے بچی یا اندھی یا بیمار یا بدصورت لڑکی کا انتخاب کرنا جائز نہیں ہے، اس صورت میں پاکدامن بننا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس کی بیوی بیمار ہے اور لطف اندوزی کے لائق نہیں ہے، اس صورت میں بیٹے پر ضروری ہے کہ اپنے والد کی کسی دوسری عورت سے شادی کرائے اور اس کا نفقہ دے۔

۳۔ والد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بیٹے پر کسی بلند مرتبہ عورت سے شادی کرانے کی شرط رکھے۔

۴۔ اگر اس کی شادی کرائے یا باندی کا مالک بنائے تو اس پر باندی کا نفقہ ضروری ہے، اگر بیٹا آزاد عورت کا مہر دینے اور باندی خریدنے سے عاجز ہو تو باپ کو باندی کا مہر دے گا تا کہ وہ باندی سے شادی کرے، کیوں کہ اس کی ضرورت ہے۔

۵۔ اگر دونوں مہر کی مقدار پر متفق ہو جائیں تو بیوی کا انتخاب باپ کے حوالے کیا جائے گا۔

۶۔ اگر باپ کی بیوی کا انتقال ہو جائے یا ارتداد کی وجہ سے یا کسی عیب کی وجہ سے نکاح فسخ ہو جائے یا بیوی کے اخلاق اور پاکدامنی میں شک کی وجہ سے طلاق دے تو بیٹے پر اپنے باپ کی دوبارہ شادی کرا کے دینا ضروری ہے۔

۷۔ باپ کو پاک دامن بنانا ضروری ہے جب اس کے پاس مہر نہ ہو اور اس کو نکاح کی ضرورت ہو، اگر وہ نکاح کے لیے اپنی ضرورت کا اظہار کرے تو اس کی تصدیق کی جائے گی، پھر اس سے قسم کھانے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ باپ پر اپنے بیٹے کی باندی سے جماع کرنا حرام ہے، اگر اس کے ساتھ جماع کرے تو مہر واجب ہو جاتا ہے اور ملکیت کا شبہ پائے جانے کی وجہ سے اس پر حد نہیں ہے البتہ حاکم اس کی تعزیر کر سکتا ہے۔

۹۔ اگر باپ اپنے بیٹے کی باندی کو حاملہ بنا دے تو ہونے والا بچہ آزاد ہوگا اور اس کی نسبت اس کے باپ کی طرف کی جائے گی۔

۱۰۔ اگر باندی بیٹے کے بچے کی ماں (ام ولد) ہو تو وہ باپ کے بچے کی ماں نہیں بن سکتی ہے۔

۱۱۔ ورنہ وہ آزاد باپ کے بچے کی ماں ہوگی اور اس پر مہر کے ساتھ اس کی قیمت کی ادائیگی بھی ضروری ہوگی اور وہ یہ قیمت اپنے بیٹے کو دے گا۔

۱۲۔ اپنے بیٹے کی باندی کے ساتھ نکاح کرنا باپ پر حرام ہے۔

۱۳۔ اگر کوئی اپنے والد کی بیوی کا مالک بن جائے جو اس کے لیے حلال نہیں ہوتی ہے تو نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ اگر اس کا بچہ ہو جائے تو وہ آزاد نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ باندی کے مالک کا بھائی ہے۔

۱۴۔ اپنی مکاتب باندی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اگر وہ اپنی قیمت ادا کرنے سے عاجز ہو تو وہ غلامی کی طرف لوٹ آتی ہے، احتمال اس وقت تک باقی ہے، جب تک کہ وہ باقی قسط ادا نہ کرے، کوئی بھی اس کی باندی کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا ہے کیوں کہ اس کی باندی اس کی ملکیت ہے، ملکیت اور نکاح ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔

۱۵۔ جب کوئی مکاتب غلام اپنے آقا کی بیوی کا مالک بن جائے تو اس باندی کے ساتھ اس کے آقا کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے کیوں کہ مکاتب کی ملکیت آقا کی ملکیت کے حکم میں ہے۔

مہر (صداق)

صداق کے لغوی معنی: بیوی کا مہر۔

شرعی و اصطلاحی معنی: نکاح یا جماع کی وجہ سے مرد کے ذمے عورت کے واجبی مال کا نام صداق یعنی مہر ہے، اس کو صداق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نکاح میں شوہر کی طرف سے سچی خواہش و رغبت کا شعور و احساس دلایا جاتا ہے، یہ اکرام و احترام میں سے ہے جس کی عورت عقدِ نکاح کے وقت مستحق بن جاتی ہے۔

اس باب میں مہر کے احکامات بیان کیے گیے ہیں، ہم یہ بات بیان کریں گے کہ عورت عقدِ نکاح یا جماع یا زبردستی عزت پر حملہ کیے جانے کی وجہ سے مہر کی مستحق بن جاتی ہے۔

عربی زبان میں مہر کے بہت سے نام ہیں: صداق . نحلة . فريضة . حباء . أجر . عقر . علائق . طول . خرص . فرد . عشر . صدُقة۔

عقدِ نکاح میں مہر کا تذکرہ کرنا مستحب ہے۔ امام مالکؒ نے عقدِ نکاح میں مہر کا تذکرہ نہ کرنے کو ناجائز کہا ہے۔ (دیکھا جائے: "حاشية الدسوقي على الشرح الكبير" ۷/۱۳۶۲ انہوں نے ارکان نکاح کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے: اگر مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو عقد نہیں ہوتا ہے) مہر واجب ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: "وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً" (نساء۴) (اور خوش دلی سے عورتوں کو ان کا مہر دو) بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کو پیغام دینے والے سے کہا: "تلاش کرو چاہے لوہے کی ایک انگھوٹی ہی کیوں نہ ہو"۔ وہ شخص گیا پھر واپس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: "کیا تمھیں کچھ قرآن یاد ہے؟" اس نے قرآن کریم کی کئی سورتوں کو گنایا جو اس کو یاد تھیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: "میں نے تمھارے پاس موجود قرآن کے بدلے تم کو اس کا مالک بنا دیا"۔ (صحیح بخاری: کتاب

النکاح، باب التزویج علی القرآن وبغیر صداق ۴۸۵۵۔ صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب الصداق ۲۶۳۲) اسی طرح مہر کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ (ابن المنذر نے "الاجماع" ۳۹ میں کہا ہے: علماء کا اجماع ہے کہ عورت شوہر کو اپنے پاس مہر ادا کرنے سے پہلے آنے سے روک سکتی ہے)

یہ سنت ہے کہ عورت کا مہر دس درہم سے کم نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے: مہر دس درہم سے کم ہونا جائز نہیں ہے۔ (یہ بات احناف میں سے ملا علی قاری نے "فتح باب العناية" ۲/۵۱ میں کہی ہے اور اس کے لیے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی حدیث بطورِ دلیل بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دس درہم سے کم مہر نہیں ہے"۔ دار قطنی: کتاب النکاح، باب المہر ۳/۲۴۴، بیہقی: السنن الکبری ۷/۱۳۳، اس کی سند صحیح نہیں ہے مبشر بن عبید کی وجہ سے، کیوں کہ وہ متروک الحدیث ہے، یہی علت دار قطنی اور بیہقی نے بیان کی ہے) مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہ ہو، کیوں کہ رسول اللہ کی بیٹیوں کا اور آپ کی بیویوں کا مہر اس سے زیادہ نہیں تھا۔ مہر میں زیادتی اور غلو کرنا مکروہ ہے، مستحب یہ ہے کہ شوہر بیوی کو جماع سے پہلے مہر کا ایک حصہ ادا کرے، یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مہر کی دو قسمیں ہیں: حاضر (معجّل یعنی عقدِ نکاح میں ادا کیا جائے) اور مؤجل (یعنی بعد میں بیوی کے مطالبے پر ادا کیا جائے) مہر کی ادائیگی کو دو میں سے قریبی مدت یعنی موت یا طلاق تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، مہر کے سلسلہ میں شرعی اصول یہ ہے کہ "جس چیز کا ثمن یعنی قیمت بننا صحیح ہو تو اس کا مہر بننا صحیح ہے"۔ (امام شافعی اور امام احمد کا مسلک یہ ہے یعنی جو چیز مبیع (یعنی سامانِ تجارت) یا خرید و فروخت میں قیمت یا کرایہ میں اجرت بننا جائز ہو تو اس کا مہر بننا بھی جائز ہے۔ دیکھا جائے "التهذيب" "بغوی" ۵/۴۷۸)

مہر کی دو قسمیں ہیں: عقد میں مقرر کردہ مہر اور مہرِ مثل۔ مہر کی پہلی قسم جماع سے یا مندرجہ ذیل امور میں سے ایک کی وجہ سے طے ہو جاتی ہے:

۱۔ شوہر پر اپنی بیوی سے جماع کرتے ہی مکمل مہر ادا کرنا لازم ہے، چاہے جماع کرنا حرام ہی کیوں نہ ہو، یعنی ایامِ حیض میں جماع کرے یا بیوی کی پچھلی شرمگاہ میں، یا احرام کی حالت میں، کیوں کہ مہر جماع کی وجہ سے ثابت ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ" (نساء۲۱) اور تم اس کو کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم ایک دوسرے کے دخیل رہ چکے ہو۔

٢۔یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور یہ جماع سے پہلے ہو، کیوں کہ عقدِ نکاح دو میں سے کسی ایک کی موت ہونے سے ختم ہو جاتا ہے، موت عورت کے ساتھ جماع کرنے اور اس پر قابو پانے کے قائم مقام ہے، اس سے صرف ایک شکل مستثنیٰ ہے کہ باندی کے ساتھ اس کے شوہر کی طرف سے جماع کیے جانے سے پہلے خود کو قتل کر دے یا اس کا آقا اس کو قتل کر دے، اس صورت میں مہر ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر آزاد عورت خودکشی کر لے یا مر جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کا پورا مہر شوہر کے ذمے واجب ہو جاتا ہے۔

٣۔اگر وطی یعنی جماع نہ کیا جائے تو مکمل مہر واجب نہیں ہوتا ہے، امام شافعی کا قولِ قدیم اور دوسرے اہل سنت والجماعت کے مسالک یہ ہیں کہ خلوت وتنہائی کی صورت میں ہی بیوی کا مکمل مہر واجب ہو جاتا ہے۔(دیکھا جائے:''التہذیب''بغوی ٥/٥٢٣)

اسی طرح بیوی کے ساتھ تھوڑی بہت ملاعبت سے بھی مکمل مہر واجب نہیں ہوتا ہے، بلکہ مکمل مہر جماع کی صورت ہی میں واجب ہوتا ہے، اگر شوہر کی منی عورت کے رحم میں ڈال دی جائے تو بھی شوہر پر مکمل مہر واجب نہیں ہوتا ہے، مکمل مہر صرف دو میں سے ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے: جماع اور میاں بیوی میں سے کسی کی موت۔

٤۔جماع سے پہلے علٰحیدگی کی صورت میں نصف مہر واجب ہوتا ہے جب جدائی بیوی کی طرف سے نہ ہو: اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت سے جماع سے پہلے جو بھی جدائی میاں اور بیوی کے درمیان ہو جائے، البتہ شرط یہ ہے کہ عورت کی طرف سے علٰحیدگی کا مطالبہ نہ کیا جائے اور علٰحیدگی کا سبب وہ نہ ہو تو اس صورت میں نصف مہر واجب ہو جاتا ہے چاہے ایک طلاق دی جائے یا تین طلاق، چاہے سبب کوئی بھی ہو، مثلاً شوہر اسلام لے آئے اور بیوی اسلام نہ لائے، یا شوہر اسلام سے مرتد ہو جائے یا ان کے علاوہ کوئی بھی دوسرے سبب، خلاصہ کلام یہ کہ اگر جماع سے پہلے شوہر کی وجہ سے علٰحیدگی ہو تو نصف مہر واجب ہو جاتا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً''(بقرہ ٢٣٧)(اگر تم ان کو اس سے پہلے طلاق دو کہ تم ان سے جماع کرو جب کہ تم نے ان کے لیے مہر مقرر کر دیا ہو) قرآن کریم نے عورت کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے

طلاق کے حکم کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اس پر شوہر کی وجہ سے جماع سے پہلے علٰحیدگی کی باقی قسموں کو قیاس کیا جائے گا۔

٥۔مہر کی دوسری قسم مہرِ مثل ہے، یہ وہ مال ہے جس کا مطالبہ شادی میں عمومی طور پر بیوی کی طرح کی دوسری عورتوں کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کی عصبہ بننے والی عورتوں پر اس کو قیاس کیا جاتا ہے: عورت کے مہرِ مثل کا اندازہ اس کی عصبہ بننے والی قریبی عورتوں سے لگایا جاتا ہے مثلاً حقیقی پھوپیاں، علاتی پھوپھیاں، بھتیجیاں، بھتیجیوں کی بیٹیاں، حقیقی چچازاد بہنیں، حقیقی چچازاد بھائیوں کی بیٹیاں، علاتی چچازاد بھائی کی بیٹیاں وغیرہ۔ اگر اس عورت کی عصبہ بننے والی عورتوں میں سے کوئی عورت نہ ہو جس پر مہرِ مثل کو قیاس کیا جائے تو اس کو ذوی الارحام عورتوں پر قیاس کیا جائے گا مثلاً دادیاں اور خالائیں۔ ان میں سے سب سے قریبی رشتے دار کو مقدم کیا جائے، ان سبھوں میں مقدم ماں ہے، اس کے بعد خالہ پھر نانیاں پھر خالہ زاد بہنیں پھر ماموں زاد بہنیں۔

اگر ذوی الارحام میں سے کوئی ایسی عورت نہ پائی جائے جس پر مہرِ مثل کو قیاس کیا جائے تو اس کو اس کے شہر کی عورتوں اور خوبصورتی وغیرہ میں اس کے مشابہ عورتوں پر قیاس کیا جائے گا، اعتبار کرنے میں دلہن کے باکرہ یا ثیبہ ہونے، کم عمر یا زیادہ عمر والی ہونے کا بھی خیال رکھا جائے گا، اگر اس کو علم یا ادب کی فضیلت حاصل ہو یا اس میں جہالت یا علم کی کمی ہو تو اس کا بھی اعتبار کیا جائے گا، یعنی مہر عورت کے حال کے مناسب ہوتا ہے، کیوں کہ ان صفات کے مختلف ہونے سے مہر کم دیا جاتا ہے، اور رشتے دار نہ ہونے کی صورت میں زیادہ دیا جاتا ہے تو اس کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔

پانچ موقعوں پر مہرِ مثل واجب ہوتا ہے: نکاح میں، جماع میں، خلع میں، گواہی سے رجوع کرنے میں اور رضاعت میں، ان کے بارے میں ہم تھوڑی تفصیلات بیان کر رہے ہیں۔

١۔نکاح میں مہرِ مثل اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے آپ کو حوالے نہ کرنے والی عورت سے شادی کر لے اور اس کے ساتھ جماع کرے اور عورت مہر پر قبضہ بھی نہ کرے اور عقد میں اس کا تذکرہ بھی نہ کیا جائے، اپنے آپ کو حوالہ کرنے والی عورت وہ ہے جو بالغ ہو اور

اپنے ولی سے کہے: بغیر مہر کی میری شادی کرائیے۔ اس پر ولی اس کی شادی کرائے اور مہر کی نفی کرے یا اس کے تذکرہ سے خاموش رہے۔ (یہ بات غزالی نے ''الوسیط'' میں کہی ہے ۲۲۳/۵) اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی رشد و عقل والی عورت جو اپنے دین اور مال میں بھروسہ مند ہو اپنے سرپرست سے کہے: بغیر مہر کی میری شادی کرائیے اور سرپرست ایسا کرے۔ یا اس کی شادی کرائے اور اس کے مہر سے خاموش رہے۔ یا اس کا ولی مہرِ مثل سے کم میں اس کی شادی کرائے یا ایسی نقدی میں جو اس کے شہر میں متداول نہ ہو۔ یا باندی کا مالک کسی شخص سے کہے: میں نے اپنی باندی کی شادی تمھارے ساتھ بغیر مہر کی کرادی۔ یا وہ اپنی باندی کی شادی اس کے ساتھ کرائے اور اس کے مہر سے خاموش رہے۔ تو ان تمام صورتوں میں اگر مرد شادی قبول کرلے اور اپنی بیوی سے جماع کرلے تو اس پر مہرِ مثل کی ادائیگی ضروری ہوجاتی ہے۔ (لیکن عورت عقد کی وجہ سے کسی چیز کی مستحق نہیں ہوتی ہے، یہی مسلک شافعی ہے۔ نووی نے اس کو ''روضۃ الطالبین'' میں صحیح کہا ہے ۲۶۷/۶۔۲۶۸۔ انہوں نے قاضی حسین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کے لیے مہرِ مثل واجب نہیں ہوتا ہے) کیوں کہ اپنی بیوی کے ساتھ شوہر کی طرح رہنا بغیر مہر کے جائز نہیں ہوتا ہے۔ اس کا مقصد عورت کے معاشرتی حقوق کی حفاظت ہے۔ اسی وجہ سے جب مہر کے بغیر نکاح ہوجائے تو مہرِ مثل لازم آجاتا ہے، اور مہر صرف ایک ہی صورت میں ساقط ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ دو کافر حربیوں کے درمیان نکاح ہوجائے جو اس بات کا عقیدہ رکھتے ہوں کہ نکاح میں مہر نہیں ہوتا ہے، اس صورت میں اگر حربی کافر اپنی بیوی کو جماع کے بعد طلاق دے تو اس کے لیے مہر نہیں ہے۔

۲۔ یا ان دونوں میں سے ایک مہر متعین کرنے سے پہلے مرجائے: اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مہر متعین کرنے سے پہلے مرجائے۔ ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ موت جماع کے مرتبہ میں ہے، اس وجہ سے اگر میاں بیوی کی شادی مہر متعین کیے بغیر ہوجائے اور شوہر کا انتقال ہوجائے تو بیوی کو مہرِ مثل ملے گا اور اس کو وراثت بھی ملے گی، اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ نے صحابیہ بروع بنت واشق کے حق میں مہرِ مثل اور وراثت کا فیصلہ کیا جن کا نکاح ایک شخص سے مہر متعین کیے بغیر ہوا تھا اور شوہر کا انتقال جماع سے پہلے ہی ہوا تھا۔ اس پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہرِ مثل یعنی اس کی رشتے دار عورتوں کے مہر اور وراثت کا فیصلہ فرمایا۔ یہ روایت ابوداؤد وغیرہ نے کی ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔ (ابوداؤد: کتاب النکاح، باب فیمن تزوج ولم یسم صداقا حتی مات ۱۸۲۰، جامع الترمذی: ابواب النکاح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی الرجل یتزوج امرأۃ فیموت عنہا قبل ان یدخل بہا ۱۱۰۰، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۰۸۶۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''التھذیب'' بغوی ۵۰۶/۵)

۳۔ اگر مہر کے لیے مقرر کردہ چیز حرام ہو مثلاً خنزیر یا شراب یا ایسا آزاد شخص ہو جس کو ملکیت میں لیا نہ جاسکتا ہو تو بیوی کو مہرِ مثل دیا جائے گا۔ (نکاح کے صحیح ہونے اور مقررہ مہر کے فاسد ہونے کی تفصیلات جاننے کے لیے دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۴۶۷/۴)

۴۔ یا مہر دوسرے کی ملکیت ہو مثلاً عقد نکاح میں طے کیا جائے کہ مہر فلاں شہر فلاں محلّہ میں موجود ۱۸ نمبر والی جائیداد ہے۔ پھر معلوم ہوجائے کہ یہ جائیداد شوہر کے علاوہ دوسرے کی ملکیت ہے تو اس صورت میں مہر فاسد ہوجائے گا اور بیوی مہرِ مثل کی مستحق بن جائے گی۔

۵۔ یا مہر مجہول ہو۔ مثلاً شوہر کہے: بیوی کا مہر ان قالینوں میں سے ایک ہے اور اس کی تعیین نہ کی جائے۔ یا مہر کوئی ایسی چیز ہو جس کی کوئی قیمت نہ ہو مثلاً شوہر کہے: اس کا مہر دو دانے گیہوں ہیں۔ اس صورت میں مہر فاسد ہوجائے گا اور اس کو مہرِ مثل دیا جائے گا۔ (دیکھا جائے: ''الحاوی'' ماوردی ۳۹۵/۹۔ انہوں نے لکھا ہے: جس ناواقفیت سے خرید و فروخت صحیح نہیں ہوتی ہے تو یہ مہر کے صحیح ہونے میں بھی مانع ہے)

۶۔ یا کوئی عین چیز ہو جو قبضہ کرنے سے پہلے ضائع ہوجائے: مثلاً اپنی بیوی کا مہر پھل دار درخت کو بنائے اور بیوی کی طرف سے اس پر قبضہ کرنے سے پہلے بجلی گر کر جل جائے یا چند بکریاں طے کردے جن کو بھیڑیا اپنا شکار بنالے یا گائے مہر میں طے کردے جس کو شوہر ذبح کرکے گوشت تقسیم کردے۔ ان تمام صورتوں میں شوہر کے ذمے اپنی بیوی کو مہرِ مثل دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ (یہ ''الأم'' میں امام شافعی کی عبارت کا خلاصہ ہے، انہوں نے تحریر کیا ہے: ۶۰/۵: شوہر بیوی کے لیے کوئی چیز مہر میں دے پھر وہ عورت کے حوالے نہ کرے یہاں تک کہ اسی کے ہاتھوں میں ضائع

ہوجائے، اگراس کے ساتھ جماع کیا ہوتو عدت کے لیے مہرمثل دے گا'') اگرخود عاقل اور رشد والی بیوی ہی اپنا مہر ضائع کردے تو یہ قبضہ کرنے کے حکم میں ہوگا اور مہر میں اس کا حق ختم ہوجائے گا، مہر میں اصول یہ ہے کہ یہ شوہر کے ذمے رہتا ہے اور وہ مہر کا ضامن رہتا ہے جب تک عورت اس سے حاصل نہ کرلے، اگر عورت لے تو شوہر کی ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے۔

۷۔ یا مہر میں فاسد شرط رکھی جائے، مثلاً عقد میں شرط رکھی جائے کہ بیوی کا مہر ۱۰ مثقال سونا دیا جائے گا، یا عقد میں شرط رکھی جائے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا یا شرط رکھے کہ شوہر اپنی بیوی کا نفقہ نہیں اٹھائے گا۔ ان تمام صورتوں میں مہر فاسد ہوجاتا ہے اور مہرمثل ضروری ہوجاتا ہے۔ (دیکھا جائے ''الحاوی الکبیر'' ۹/۵۰۶)

۸۔ یا کئی عورتوں سے ایک ہی مہر سے شادی کرلے۔ مثلاً ایک سے زائد عورتوں کو ایک مہر دے کر شادی کرے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس مہر میں سے ہر ایک کا حصہ کتنا ہے، کیوں کہ غیر معلوم مہر فاسد مہر ہے اور اس صورت میں مہرمثل ضروری ہوجاتا ہے، اس سے باندیوں کا مہر مستثنیٰ ہے مثلاً ایک ہی مہر سے دو باندیوں سے شادی کرلے، کیوں کہ مہر کا مالک ایک ہی شخص ہے اور وہ آقا ہے۔ (دیکھا جائے ''الخلاصة'' امام غزالی ۴۶۱، ''عجالة المحتاج'' ابن ملقن ۳/۱۲۹۸)

۹۔ یا کوئی کپڑا مہر میں اس شرط پر دے کہ یہ لکھنؤ میں بنا ہوا ہے پھر معلوم ہوجائے کہ یہ سورت میں بنا ہوا ہے۔

۱۰۔ دھوکہ کی صورت میں وہی حکم ہے جیسا کہ دھوکہ کے نکاح میں تفصیلات گذر چکی ہیں۔

۱۱۔ اس کے علاوہ میں مثلاً کوئی اپنی بیوی کا مہر ایسی چیز بنائے جس کو پیش کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً اپنی بیوی کا مہر امریکا کو بنادے۔ یا ایسی چیز مہر بنادے جس سے عورت کو فائدہ نہ ہو مثلاً اس کے بیٹے کو پڑھانا وغیرہ، ان تمام صورتوں میں مہرِ مثل کا اصول نافذ ہوتا ہے، جس کی ادائیگی شوہر پر نکاح کی وجہ سے یعنی صرف عقد کی وجہ سے ضروری ہوجاتی ہے۔

۱۲۔ جماع کے نتیجہ میں جس صورت میں مہرمثل لازم ہوجاتا ہے وہ شبہ کی وجہ سے جماع کی حالت ہے مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے غلطی کی وجہ سے اس کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے

اور عورت اس کو اپنا شوہر سمجھتے ہوئے جماع کرلے۔ پھر اس کے بعد معلوم ہوجائے کہ وہ میاں بیوی نہیں ہیں، تو اس صورت میں شوہر پر اس عورت کو مہرمثل دینا ضروری ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب عورت کو بھی معلوم نہ ہو کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ (دیکھا جائے ''الحاوی الکبیر'' ۱۲/۲۹۵، ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۳/۳۱۲) اگر عورت کو معلوم ہو کہ یہ اس کا شوہر نہیں ہے پھر بھی وہ خود کو اس کے حوالے کرے تو وہ زانیہ ہے اور اس کو مہر نہیں ملے گا، اگر ان دونوں میں سے کوئی جانتے ہوئے عمداً جماع کرے تو اس پر زنا کی سزا نافذ ہوگی۔

یا کوئی شخص کسی باندی سے یہ گمان کرتے ہوئے جماع کرلے کہ وہ اس کی باندی ہے اور وہ باندی گمان کرلے کہ یہ اس کا آقا ہے۔ پھر معلوم ہوجائے کہ ایسا نہیں ہے تو اس شخص پر اس باندی کا مہر دینا ضروری ہے۔ اگر دونوں طرف سے شبہ کی وجہ سے جماع ہوجائے تو یہ نہ حلال ہوتا ہے اور نہ حرام، اگر کوئی شخص اپنی مکاتب باندی سے جماع کرے اور اس کی وجہ سے وہ حاملہ ہوجائے تو اس باندی کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنا مہر لے اور اس کے مکاتبہ (یعنی معاہدہ) پر باقی رہے۔ یا اس کی ام ولد بن جائے اور اس کے لیے کوئی مہر نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کی مکاتب باندی یا باندی سے عمداً جماع کرلے اور اس کی وجہ سے حاملہ بن جائے تو ملکیت کے شبہ کی وجہ سے اس پر حد نہیں ہے اور اس وجہ سے کہ بیٹے پر اپنے باپ کو پاک دامن بنانا ضروری ہے اور یہ اس پر باپ کا حق ہے۔

۱۳۔ آخری حالت جس میں مہرمثل واجب ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حرام جماع پر کسی عورت کو مجبور کیا جائے، اگر اس کا پردۂ بکارت ختم ہوجائے تو اس کی دیت کے ساتھ مہرمثل بھی واجب ہے۔ (دیکھا جائے ''الحاوی الکبیر'' ۱۲/۲۹۶، ''عجالة المحتاج الی توجیہ المنهاج'' ابن ملقن ۳/۱۳۰۳)

خلع

وہ خلع جس میں مہرِ مثل واجب ہوجاتا ہے:

خلع کے لغوی معنی چھیننے کے ہیں۔اورشرعی واصطلاحی معنی یہ ہے کہ طلاق یاخلع کے لفظ کے ذریعہ کسی عوض کے بدلے جدائی کرائی جائے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک تعالی کافرمان ہے:''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ'' (بقرہ۲۲۹) (پس ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جوعورت بطور فدیہ ادا کرے) صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نے ایک باغ کے بدلے خلع لیا جوان کے شوہر نے ان کودیا تھاتوانہوں نے یہی باغ واپس کردیا۔(صحیح بخاری: کتاب الطلاق،باب الخلع وکیف الطلاق فیہ۵۲۷۳۔۵۲۷۴) کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ہونے والا یہ سب سے پہلا خلع ہے۔ابن منذر نے سلطان کی اجازت کے بغیر خلع ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔(الاجماع ابن المنذر ص۴۶)

خلع میں وہی واجب ہوتا ہے جونکاح میں واجب ہوتا ہے،اگرمکاتب باندی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اپنے شوہر سے خلع لےتو اس پر ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنا مہرِ مثل شوہر کوادا کرے تاکہ اس کا خلع نافذ ہوجائے۔

اگر باندی کا مالک اپنی باندی سے کہے: وہ اس کے شوہر سے خلع لینے پر ایک سونے کی گنی کے عوض راضی ہے۔تواس پر یہ سونے کی گنی اس کے شوہر کے حوالے کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

اگر باندی اپنے شوہر سے ایک دینار کے بدلے خلع لےتو اس کے ذمے یہ دینار لازم ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ وہ جب آزاد ہوجائے اور دینار کی مالک بن جائے تو خلع لیے ہوئے شوہر کو اس کی ادائیگی ضروری ہوجاتی ہے۔

اگر باندی کمانے والی ہواوراس کے آقا کی طرف سے کمانے کی اجازت ہو،اوروہ اپنے شوہر سے ایک دینار کے عوض خلع لےتو اس کی کمائی میں دینار لازم ہوجاتا ہے۔

اگرعورت اپنے شوہر سے شراب کے عوض میں خلع لےتو عوض باطل ہوجاتا ہے اوراس پر مہرِ مثل لازم ہوجاتا ہے، ہم نے مہرِ مثل کی تفصیلات گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہیں۔

شوہر کے لیے مہرِ مثل کا نصف واجب کرنے والی رضاعت

رضاعت کے معنی پستان کو چوسنا اور دودھ پینا ہے۔ رضاعت کے شرعی اور اصطلاحی معنی بچے کے معدہ یا دماغ میں کسی عورت کا دودھ کا پہنچنا ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''المعجم الوسیط'' ۱/۳۵۰، ''مغنی المحتاج'' ۳/۴۱۴۔ ''المجموع'' ۲۰/۷۷)

یہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ '' (بقرہ ۲۳۳) اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت کی وجہ سے وہ حرام ہو جاتا ہے جو ولادت کی وجہ سے حرام ہوتا ہے''۔ (بخاری: کتاب النکاح، باب ما یحل من الدخول والنظر الی النساء فی الرضاع ۲۵۰۳، مسلم: کتاب الرضاع، باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ ۱۴۴۴)

اگر بڑی بیوی اپنے ہی شوہر کی چھوٹی بچی بیوی کو دودھ پلائے تو دونوں بیویاں اس شخص پر حرام ہو جاتی ہیں، کیوں کہ چھوٹی بچی بیوی اس کی بڑی بیوی کی رضاعی بیٹی بن جاتی ہے اور دوسری بیوی حرام بن جاتی ہے یعنی بڑی بیوی، کیوں کہ وہ اس کی چھوٹی بیوی کی رضاعی ماں بن جاتی ہے، سبب بننے والی اس کی بڑی بیوی ہے جس نے اس کی دودھ پیتی چھوٹی بیوی کو دودھ پلایا ہے، اس وجہ سے وہ اس کے شوہر کی ربیبہ بن جاتی ہے، اس وجہ سے بڑی بیوی پر ضروری ہے جو چھوٹی بیوی کو دودھ پلانے کی وجہ سے اس کی بیوی کی ماں بن گئی ہے اور وہ بھی اس پر حرام ہوگئی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اس چھوٹی بیوی کے مہرِ مثل کا آدھا حصہ دے جو اس پر حرام ہوگئی ہے اور ان دونوں کو علحیدہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ (مکمل فائدہ کے

لیے دیکھا جائے: ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا انصاری ۳/۱۵۳، ''الوسیط'' امام غزالی ۶/۱۹۱)

خلاصہ کلام یہ کہ اگر شوہر نے بڑی بیوی کی ساتھ جماع نہیں کیا ہے تو بڑی بیوی پر چھوٹی بیوی کا مہرِ مثل کا نصف ضروری ہو جاتا ہے، اور چھوٹی بیوی کے مہر کا باقی حصہ اس کا شوہر ادا کرے گا کیوں کہ چھوٹی بیوی کی کوئی کوتاہی نہیں ہے اور بڑی کے لیے مہر نہیں ہے، کیوں کہ وہی اپنی علحیدگی کی وجہ بنی ہے، اگر بڑی بیوی کے ساتھ شوہر نے جماع کیا ہے تو شوہر پر اس کا پورا مہر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

اگر چھوٹی بچی بیوی نے ہی بڑی بیوی سے اس کے سونے کے دوران اور اس کی اجازت کے بغیر دودھ پیا ہو تو بڑی پر کچھ بھی لازم نہیں آتا ہے اور چھوٹی بیوی کے لیے مہر نہیں ہے کیوں کہ وہی علحیدگی کا سبب بنی ہے اور شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ بڑی کا مہر چھوٹی بیوی کے مال سے لے، کیوں کہ وہی اس پر بڑی بیوی کے حرام ہونے کا سبب بنی ہے، اگر شوہر کی اجازت سے بڑی بیوی چھوٹی بیوی کو دودھ پلائے تو بڑی بیوی پر کچھ بھی لازم نہیں ہے، شوہر پر ضروری ہے کہ وہ دونوں کا مکمل مہر ادا کرے اگر اس نے دونوں سے جماع کیا ہو، یا آدھا مہر ضروری ہو جاتا ہے اگر جماع سے پہلے ہو، ہم نے اس سے پہلے نکاح، جماع، شبہ، خلع اور رضاعت میں مہرِ مثل کی وضاحت کر دی ہے۔

وہ گواہی جس کی وجہ سے شوہر کے لیے مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے:

۱۔ جس گواہی میں شوہر کے لیے مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دو مرد طلاق بائن یا رجعی کی گواہی دیں اور طلاقِ رجعی میں شوہر رجوع نہ کرے پھر گواہ اپنی گواہی سے رجوع کر لیں:

اس صورت میں دونوں گواہوں پر مہرِ مثل لازم ہو جاتا ہے جو وہ شوہر کے حوالے کریں گے۔ (امام شافعی نے یہی بیان کیا ہے اور امام غزالی نے اس کو ''الوسیط'' میں نقل کیا ہے ۶/۱۹۱) مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ جب دو عاقل بالغ مسلمان قاضی کے سامنے گواہی دیں کہ زید نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے۔ اور قاضی میاں بیوی کو اس گواہی کی وجہ سے علحیدہ کر دے۔ یا دو گواہ قاضی کے سامنے گواہی دیں کہ زید نے اپنی بیوی کو ایک رجعی طلاق تین مہینے پہلے دی

ہے اوراس کی عدت کے دوران رجوع نہیں کیا ہے۔ پھر قاضی اس گواہی کی بنیاد پر میاں بیوی کو علحیدہ کرے۔ پھر یہ دونوں گواہ چند دنوں کے بعد رجوع کریں اور قاضی کے سامنے گواہی دیں کہ وہ دونوں جھوٹے ہیں۔ ان دونوں کی گواہی میں رجوع کا اعتبار نہیں ہوگا کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ وہ پہلی گواہی میں سچے ہوں۔ اس صورت میں دونوں گواہوں پرضروری ہوجاتا ہے کہ وہ شوہر کو مہرِ مثل دیں، چاہے میاں بیوی کے درمیان علحیدگی جماع سے پہلے ہو یا جماع کے بعد، کیوں کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان رشتۂ ازدواجیت کو منقطع کرنے کے سبب بنے ہیں، اور قاضی پرضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ان دونوں کی سرزنش کرے تاکہ وہ معاشرہ میں بگاڑ نہ مچائیں۔

۲۔ اگر بیوی اپنا مہر اپنے شوہر کو ہبہ کرے اوراس کے قبضہ میں دے۔ پھر وہ اس کو جماع سے پہلے طلاق دے تو وہ مہر کے بدلے آدھا واپس کردے گا (اس مسئلہ میں بحث ہے، دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۵/۵۱۷۔ ''حاشیۃ القلیوبی'' ۳/۴۳۹) اگر کوئی شخص کسی سے شادی کرے اوراس کو مہر میں گاڑی یا گھر یا زمین یا سونے کا ٹکڑا دے۔ یعنی کوئی عین چیز مہر دے اور وہ مہر لے لے، پھر وہ عورت اپنا مذکورہ مہر شوہر کو ہبہ کردے اور شوہر کے حوالے کردے۔ پھر اللہ کی مشیت سے وہ جماع سے پہلے اس کو طلاق دے، اس صورت میں بیوی پرضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے مہر کے نصف حصے کے برابر دے جو اس نے اپنے شوہر کو بطور ہبہ دیا ہے یعنی گاڑی یا گھر یا زمین یا سونے کے ٹکڑے کی قیمت کا آدھا دے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ۳۰ کلو گیہوں مہر میں دے اور جماع کرنے سے پہلے اس کو طلاق دے تو بیوی پرضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے مہر کا آدھا واپس کردے، یہ ۱۵ کلو گیہوں ہے۔

اگر مہر شوہر کے ذمے قرض ہو مثلاً وہ اپنی بیوی کے ساتھ ۱۹ مثقال سونا مہر دینے پر متفق ہوجائے اور وہ عہد کرے کہ مہر اس کے ذمے میں ہے جس کو وہ بیوی کو جس وقت چاہے ادا کردے گا، اس کے بعد بیوی اپنے مہر کو معاف کردے یعنی شوہر کو ہدیہ کردے، اور

یہ جماع سے پہلے ہی ہو پھر اس کا شوہر اس کو طلاق دے تو اس صورت میں شوہر اپنی بیوی سے کچھ واپس نہیں لے گا، کیوں کہ اس نے اپنی بیوی کو کچھ بھی نہیں دیا ہے، اس لیے اس کی بیوی پر کچھ بھی اپنے شوہر کو دینا ضروری نہیں ہے۔ (مسلک میں یہ صحیح ہے، بغوی نے یہی ایک قول بیان کیا ہے، یہ اکثر اہلِ علم کا قول ہے، دیکھا جائے ''التہذیب'' ۵/۵۱۷)

☆ اگر لڑکی کا باپ اس کا مہر ہبہ کردے تو یہ لڑکی کے سبھی حقوق کی طرح نافذ نہیں ہوتا ہے: باپ کے لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے مہر سے دستبردار ہوجائے اور شوہر کو ہبہ میں دے۔ (یہ امام شافعی کا قول جدید ہے اور یہی مسلک ہے۔ دیکھا جائے ''روضۃ الطالبین'' مع حاشیۃ بلقینی ۶/۲۹۸۔ ''التہذیب'' بغوی ۵/۵۱۶) کیوں کہ مہر بیوی کے تمام حقوق کی طرح ہے جو اس کے ساتھ متعلق ہیں اور باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس میں تصرف کرے۔

مہر شوہر اور بیوی کے درمیان قرض ہے، اور شوہر معاف کرسکتا ہے کہ وہ نصف مہر واپس نہیں لے گا، بیوی اپنے شوہر کو مکمل مہر ہدیہ دے سکتی ہے؛ جہاں تک سرپرست اور ولی کا تعلق ہے تو عقدِ نکاح ہونے کے بعد کسی بھی حق کا مالک نہیں ہوتا ہے: کیوں کہ نکاح جب منعقد ہوجاتا ہے تو اس کا انجام میاں بیوی کے ہاتھ میں رہتا ہے: شوہر کے ہاتھ میں طلاق کے ذریعہ جب وہ چاہے، یا عیب کی بنیاد پر فسخ کے ذریعہ، اور عیب کی وجہ سے فسخ کے ذریعہ بیوی کے ہاتھ میں یا خلع کے ذریعہ شوہر سے طلاق کو خرید کر۔

مہرِ مثل پانچ چیزوں میں منحصر ہونے کی وجہ سے (جن کو ہم نے اس سے پہلے بیان کیا کردیا ہے) یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی کافر دیارِ اسلام میں امان لے کر داخل ہوجائے، آج کل ویزا کو امان کا حکم حاصل ہے، اوراس کی بیوی مسلمان ہوجائے، یہ بات معلوم ہی ہے کہ مسلم عورت کو اس کے کافر شوہر کے پاس لوٹایا نہیں جائے گا، تو اس صورت میں کافر اپنی بیوی کا مہر اس شخص سے مانگ نہیں سکتا ہے جس نے اس شخص کو امان یعنی ویزا دی ہے۔

متعہ کے احکام

یہاں متعہ سے مراد وہ چیز ہے جو بیوی کو اس کا دل خوش کرنے کے لیے دیا جاتا ہے جس کو اپنے شوہر کی جدائی کی وجہ سے غم لاحق ہوتا ہے، یہ شوہر کی طرف سے دیے ہوئے مہر سے زائد چیز ہے، اس متعہ کا ۳۰ درہم سے کم نہ ہونا ضروری ہے۔

☆ ہر جدائی پر متعہ ہے:

جس عورت کو بھی اس کا شوہر طلاق دے تو اس کو متعہ کا حق ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ''وَالْمُطَلَّقَاتُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ '' (بقرہ ۲۴۱) (اور تمام مطلقہ عورتوں کے لیے معروف طریقہ پر کچھ فائدہ پہنچانا ہے) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو بھی اس کا شوہر طلاق دے تو اس کو متعہ کا حق ہے، اس میں عرف اور طلاق دینے والے شوہر کی طاقت واستطاعت کا اعتبار کیا جائے گا، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ '' (احزاب: ۲۸) (تو آؤ میں تمہیں کچھ سامان دے دلا دوں اور تمہیں بہتر طریقہ پر رخصت کروں) یہاں قرآنی خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج رضی اللہ عنہن سے ہے، اس میں ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کے مطابق تقشّف اور زہد کی زندگی پر راضی نہیں ہیں تو رسول اللہ ان کو متعہ دیں گے اور بھلے طریقہ پر طلاق دیں گے۔

جس عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دیا ہو تو اس کو متعہ حاصل کرنے کا حق ہے چاہے اس کا شوہر آزاد ہو یا غلام، مسلمان ہو یا ذمی، چاہے وہ عورت آزاد ہو یا باندی یا مسلمان یا ذمی۔ (قلیوبی نے ''الحاشیۃ'' میں اپنے شیخ امام نوویؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: عورت کے لیے متعہ کے احکام کو جاننا ضروری ہے اور متعہ کے معاملہ کو عام کرنا بھی لازمی ہے تاکہ وہ ان احکام کو جان لیں: کہا: اس کے وجوب کے معنی یہ ہیں کہ شوہر کے ذمہ مالدار یا غریب ہونے کے اعتبار سے یہ واجب ہے، چنانچہ شوہر اس کو موخر کرنے سے گنہگار ہوگا یا عورت کی طلب پر اس کا لازم اور ضروری ہونا موقوف ہے ۳/۴۴۰)

☆ اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ اس کے لیے مہر مقرر کیا جائے اور جماع سے پہلے علحیدگی ہوجائے یا جدائی اس عورت کی وجہ سے ہو، مثلاً وہ اپنے شوہر سے خلع مانگے، یا وہ اسلام سے مرتد ہوجائے یا شوہر و بیوی دونوں مرتد ہوجائیں تو ان تمام صورتوں میں بیوی کو متعہ حق نہیں ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۵/۵۲۵۔ رملی سے سوال کیا گیا کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو بار بار طلاق دے تو کیا اس پر ہر مرتبہ متعہ ضروری ہے یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ بیوی کے لیے شوہر پر جماع کے بعد دیے ہوئے ہر طلاق کے بدلہ متعہ ضروری ہے۔ ''فتاوی الرملی'' مع حاشیۃ ''الفتاوی الکبری الفقہیۃ'' ابن حجر ہیتمی ۳/۱۹۱۔۱۹۲)

☆ یا شوہر اپنی بیوی کا مالک بن جائے یا دونوں کی موت ہوجائے یا ان میں سے ایک کی موت ہوجائے تو ان تمام صورتوں میں عورت کو متعہ نہیں ملتا ہے یعنی اگر اپنے شوہر کی ملکیت بن جائے مثلاً اس کو آقا سے خرید لے تو اس صورت میں بیوی کے لیے متعہ میں کوئی حق نہیں ہے، یا دونوں کی موت کی وجہ سے علحیدگی ہوجائے یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے۔ اگر جماع سے پہلے طلاق دیا جائے تو عورت کو نصف مہر ملتا ہے، پھر اس کو متعہ میں کوئی حق نہیں ہے، کیوں کہ شوہر اس سے لطف اندوز ہوا ہی نہیں ہے اور اس کو نصف مہر مل چکا ہے۔ البتہ باقی حالات میں عورت کے لیے متعہ نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو کوئی وحشت ہوئی ہی نہیں ہے کہ اس کے عوض میں اس کو متعہ دیا جائے۔

☆ اگر شوہر کی طرف سے لِعان سے جدائی ہوجائے تو عورت کو متعہ ملے گا، اگر اس عورت کی طرف سے لعنت سے جدائی ہوجائے تو اس کے لیے متعہ حاصل نہیں ہوگا:

مزید تفصیلات کے لیے اس کتاب میں موجود ''لعان'' کے باب کی طرف رجوع کیا جائے۔

۔ اگر شوہر نامرد ہو تو بیوی ہی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، اس لیے اس کو متعہ مانگنے کا حق نہیں ہے، نامردی کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔

☆ متعہ کی کم سے کم مقدار ۳۰ درہم ہے، مستحب یہ ہے کہ اس سے کم نہ ہو اور نصف مہر تک نہ پہنچے، اس وجہ سے جس مبلغ پر میاں بیوی راضی ہوں گے وہی متعہ ہوگا، اگر اس سلسلہ میں دونوں میں اختلاف ہوجائے تو قاضی اس کی مقدار متعین کرے گا۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلی واعلم۔

ولیمہ

ولیمہ ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو چند لوگوں کے لیے بنایا جائے، اس سے مراد شادی یا ختنہ کی مناسبت سے کھانا اور مٹھائی کھانے پر لوگوں کو مدعو کرنا ہے، اسی طرح حج سے واپسی یا کسی بھی سفر سے لوٹ کر آنے یا قرآن کریم ختم ہونے یا نیا گھر تعمیر کرنے کی مناسبت سے بلائی جانے والی دعوت کو بھی ولیمہ کہا جاتا ہے، شادی وغیرہ کے لیے ولیمہ کرنا سنت ہے:

لوگوں کو کھانے اور مٹھائی نوش کرنے کے لیے مدعو کرنا سنت ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہے اور عمل سے بھی ، یہ بھی سنت ہے کہ شادی کے علاوہ دوسری مناسبتوں اور موقعوں پر بھی لوگوں کو کھانے کی دعوت دی جائے مثلاً بچوں کے عقیقہ کے موقع پر، امام بخاری اور امام مسلم نے رسول اللہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ؐ نے عبدالرحمٰن بن عوف ؓ سے ان کی شادی کے موقع پر فرمایا: ''ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کیوں نہ ہو''۔

(بخاری: کتاب النکاح، باب کیف یدعی للمتزوج ۴۸۶۱، مسلم: کتاب النکاح، باب الصداق ۲۶۳۴)

ایک بکری ذبح کرنا ولیمہ کی کم سے کم مقدار اس شخص کے لیے ہے جس کے پاس اپنی اور اپنے گھر والوں کے ایک دن کی روزی موجود ہو، اگر بکری ذبح نہ کرے تو وہ کسی بھی کھانے یا مٹھائی کی لوگوں کو دعوت دے کر ولیمہ کر سکتا ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ام المومنین سیدہ صفیہ ؓ کے ساتھ اپنی شادی کے موقع پر گھی اور پنیر سے ولیمہ کیا۔ (بخاری: کتاب الصلاۃ، باب مایذکر فی الفخذ ۳۷۱، صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب فضیلۃ اعتقاق امتہ ۲۶۴۴)

ولیمہ کا وقت:

ولیمہ کا مستحب وقت بیوی کے ساتھ جماع کے بعد ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی بیوی سے جماع کے بعد ولیمہ فرمایا، ولیمہ کا وقت نکاح کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری وقت کوئی بھی نہیں ہے، اس لیے نکاح کے دس سال بعد بھی ولیمہ کرنا سنت ہے اور اس سے ولیمہ کی سنت ادا ہو جاتی ہے۔

شادی کے علاوہ دوسرے موقعوں پر بھی ولیمہ کرنا سنت ہے، ابوداود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو دعوت دے تو وہ قبول کرے چاہے شادی ہو یا کوئی دوسرا موقع''۔ (مسلم: کتاب النکاح، باب الأمر باجابۃ الداعی الی دعوۃ ۲۶۵۶، ابوداود: کتاب الأطعمۃ، باب ماجاء فی اجابۃ الدعوۃ ۳۲۶۶، دونوں نے ابن عمر ؓ سے روایت کیا ہے)

ولیمہ کی دعوت دینا سنت ہے۔ تقی الدین سبکی ؒ نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ (نووی نے مسلک میں اس کو ایک قول کے طور پر نقل کیا ہے، لیکن قربانی اور دوسری دعوتوں پر قیاس کرتے ہوئے اس کو سنت ہونے پر محمول کرنا بہتر ہے۔ بغوی نے ''التہذیب'' میں یہی کہا ہے ۵/۵۲۶، ''دیکھا جائے، ''مغنی المحتاج ۴/۴۹۷) کیوں کہ اس بارے میں رسول اللہ سے بہت سی روایتیں منقول ہیں۔

شادی کے ولیمہ کی دعوت قبول کرنا فرضِ عین ہے اور دوسری دعوتوں کو قبول کرنا سنت ہے، البتہ اس کے لیے چند شرطیں ہیں:

ا۔ وہاں کوئی گناہ کا کام ہونے والا نہ ہو، مثلاً شراب، موسیقی وغیرہ اور جاندار کی تصویر نصب کی ہوئی نہ ہو۔

اگر ولیمہ میں شراب وغیرہ نشہ آور چیزیں ہوں یا وسائل لہو ولعب اور آلات موسیقی ہوں، یا ولیمہ ایسی جگہ ہو جہاں کی دیواروں پر جاندار کی تصویریں لٹکی ہوئی ہوں، یا گاؤ تکیوں پر فاخرانہ انداز میں ہو تو اس دعوت کو قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اس طرح کی جگہوں پر بیٹھنا اور حاضر ہونا جائز نہیں ہے۔

یہ اس وقت ہے جب اس کو معلوم ہو کہ اگر وہ ان کو ان برائیوں سے روکے گا تو باز نہیں آئیں گے، اگر مدعو کو معلوم ہو کہ یہ لوگ اپنے ولیمہ میں گناہوں کا ارتکاب کریں گے، اگر وہ دعوت قبول کر کے وہاں چلا جائے اور ان کو اپنی دعوت میں گناہوں سے باز رہنے کے لیے کہے تو وہ باز نہیں آئیں گے اور گناہوں پر اصرار کریں گے تو پھر اس کو ولیمہ کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ دعوت عام ہو اور شادی کے پہلے دن ہو اور مدعو متعین ہو:

یہ بھی شرط ہے کہ ولیمہ صرف مالداروں کے لیے نہ ہو۔ (کیوں کہ رسول اللہ کا فرمان ہے: ''بدترین کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالداروں کو دعوت دی جائے اور فقراء کو دور رکھا جائے''۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اس کو موصولاً روایت کیا ہے ۲۶۱، مسلم: کتاب النکاح، باب الأمر باجابۃ الداعی الی الدعوۃ ۱۴۳۲، امام مالک نے موطا میں اس کو ابو ہریرہؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے، اور امام مالک کی سند سے امام بخاری نے: کتاب النکاح، باب من ترک الدعوۃ فقد عصی اللہ ورسول اللہ)

اور سبھوں کے لیے ہو یعنی عمومی دعوت ہو، اور شادی کی دعوت پہلے دن ہو، ایسا نہ ہو کہ داعی ولیمہ تین دنوں تک کرے اور تیسرے دن دعوت دے، وہ ولیمہ کے مدعو کو شادی کارڈ بھیجے یا دعوت دینے کے لیے کسی آدمی کو بھیجے، صرف یہ نہ کہے: جو چاہے وہ آجائے۔ اگر اس طرح کے اعلان سے دعوت دی جائے تو داعی کی دعوت قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

اگر ولیمہ کسی چھوٹے گھر یا فلیٹ میں ہو اور مدعوئین بہت زیادہ ہوں اور ایک ہی دن میں ان سبھوں کو بلائے تو جگہ میں گنجائش نہ ہو تو ضرورت کے مطابق مدعوئین کو چند دنوں میں تقسیم کرنا جائز ہے اور اس صورت میں دعوت قبول کرنا واجب ہے، اگر زمین پر پھیلائے ہوئے قالین پر کسی جاندار کی تصویر ہو جس کو لوگ روند کر جاتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر مدعو کے جانے کی وجہ سے ولیمہ میں ہونے والی برائیاں رک جاتی ہوں تو اس کا جانا ضروری ہے، اسی طرح شادی کے ولیمہ کے علاوہ دوسری دعوتوں میں بھی جانا ضروری ہے تا کہ لوگوں کو گناہوں میں پڑنے سے روکا جائے، اگر اس کی طاقت میں روکنا ممکن ہو تو وہ روکے۔ ولیمہ میں مصری، اخروٹ، بادام اور درہم و دینار وغیرہ پھیلانا اور اس کو اٹھانا جائز ہے، البتہ ایسا نہ کرنا بہتر اور اولی ہے (بغوی نے اس کو بہتر کہا ہے اور اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں نقل کیا ہے، اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ لوگ گرے ہوئے کو چھین کر لیتے ہیں۔ دیکھا جائے ''التہذیب'' ۵۳۰/۵) درہم و دینار شادی کے ولیمہ میں دلہا و دلہن پر پھیلانا جائز ہے۔

باری کی تقسیم اور نافرمانی کے مسائل

تقسیم سے مراد رات گذارنے میں بیویوں کے درمیان انصاف کرنا ہے جس شخص کے پاس ایک سے زائد بیویاں ہوں۔ نشوز سے مراد بیوی کی طرف سے شوہر کی نافرمانی ہے۔ ہم اس باب میں تقسیم اور نافرمانی کے شرعی احکام کی وضاحت کر رہے ہیں۔

تقسیم یہ ہے کہ شوہر اپنی چار بیویوں میں سے ہر ایک بیوی کو ہر دن اور رات میں چھ گھنٹے مخصوص کرے کہ اپنی چار بیویوں کے پاس ہر چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ پہنچ جائے۔

نشوز یعنی نافرمانی یہ ہے کہ عورت خود کو اپنے شوہر سے بڑا سمجھے، فقہاء نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی نافرمانی کرے۔ تقسیم واجب ہونے پر علماء کا اجماع ہے۔ (ابن منذر نے ''الاجماع'' میں کہا ہے ۴۲: علماء کا اجماع ہے کہ مسلمان اور ذمی بیوی کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے۔ ماوردی نے تقسیم کے واجب ہونے کے سلسلہ میں طویل بحث کی ہے۔ ''الحاوی الکبیر'' ۵۶۸/۹) یعنی بیویوں کے درمیان انصاف کرنا ضروری ہے اور علماء نے اس کو دین کا ضروری علم شمار کیا ہے یعنی جو اس کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر شمار ہوتا ہے۔

تقسیم کی دو قسمیں ہیں: خاص اور عام۔ مخصوص یعنی خاص تقسیم سات جگہوں پر ہوتی ہے:

۱/۲۔ اگر اس کی شادی باکرہ سے ہو جائے چاہے باندی ہی ہو تو سات دن قضا کے بغیر مخصوص کیے جاتے ہیں، یا ثیبہ ہو تو تین دن بغیر قضا کے۔ یعنی شوہر اپنی باکرہ بیوی کے ساتھ زفاف کے وقت سے سات دن راتیں رہے گا، چاہے وہ باندی ہی کیوں نہ ہو، ان راتوں میں نہیں نکلے گا، چاہے وہ جماعت کی نماز کے لیے کیوں نہ ہو، البتہ وہ دن میں جماعت کی نماز، نمازِ جنازہ یا میت کے ساتھ چلنے یا مریض کی عیادت کے لیے نکل سکتا ہے، اس کے لیے صبح کے اوقات میں جماعت کی نماز چھوڑنے کا حق نہیں ہے۔

اگر دلہن ثیبہ ہوتو اس کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ شوہر تین دن اور تین رات رہے، اس دوران وہ اپنی دوسری بیویوں کے پاس نہ جائے، باکرہ کے لیے ان سات راتوں یا ثیبہ کے لیے ان تین راتوں کی قضا نہیں ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ سے منقول صحیح حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ''سات راتیں باکرہ کے لیے اور تین ثیبہ کے لیے''۔ یہ روایت ابن حبان نے کی ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب قدر ما تستحقہ البکر ١٤٦٠، صحیح ابن حبان: کتاب الحج، باب القسم، ذکر الأمر للمرء إذا تزوج علی امرأتہ بکراً أن یقسم لها ٤٢٠٨)

سنت یہ ہے کہ ثیبہ کو اس کا اختیار دیا جائے کہ وہ اس کے ساتھ تین راتیں رہے اور اس کی دوسری بیویوں کے ساتھ کوئی قضا نہیں ہوگی، یا یہ کہ اس کے ساتھ سات راتیں رہے، البتہ دوسری بیویوں کے ساتھ سات راتوں کی قضا ہوگی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین ام سلمہ کو ان سے شادی کے وقت اختیار دیا کہ وہ ان کے ساتھ بغیر قضا کے تین دن اور تین راتیں رہیں یا ان کے ساتھ سات راتیں یا سات دن رہیں، البتہ آپ اپنی سبھی بیویوں کے ساتھ اسی طرح قضا کریں گے۔ ام سلمہ نے اپنے پاس تین دن اور تین راتیں رہنے کو اختیار کیا۔ (صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب قدر ما تستحقہ البکر ١٤٦٠، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''شرح النووی علی مسلم'' ٥/٣٠٠)

اگر ثیبہ تین کے بجائے سات کا انتخاب کرے تو شوہر باقی بیویوں کے ساتھ سات دن قضا کرے گا: اگر شوہر ثیبہ کے ساتھ تین سے زیادہ راتیں رہے تو شوہر پر ضروری ہے کہ وہ اتنی ہی مدت اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کے ساتھ رہے، یہ اس وقت ہے جب مطالبہ بیوی کی طرف سے ہو، اگر وہ باکرہ کے ساتھ سات راتوں سے زیادہ یا ثیبہ کے ساتھ تین دنوں سے زیادہ رہے، البتہ یہ بیوی کے مطالبہ پر نہ ہو بلکہ اپنی طرف سے ہی ہو تو باکرہ کے ساتھ سات راتوں سے زیادہ اور ثیبہ کے پاس تین راتوں سے زیادہ کی قضا کرے گا اور زائد راتیں اپنی بیویوں کے پاس رہے گا۔ (دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ٥/٥٤٠) اگر اپنی باکرہ بیوی کے پاس دس دن رہے یعنی تین دن زیادہ تو اس پر ضروری ہے کہ اپنی نئی دلہن کے پاس

جانے سے پہلے اپنی ہر بیوی کے پاس تین دن قضا کے گزارے۔

اگر اپنی ثیبہ دلہن کے پاس تین دنوں کے علاوہ مزید تین دن رہے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنی باقی بیویوں میں سے ہر ایک کے پاس تین تین دن بطور قضا گزارے پھر اپنی نئی بیوی کے پاس آئے۔

٣۔ سفر کی صورت میں چاہے سفر چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اور وہ قرعہ نکال کر کسی کو اپنے ساتھ لے گیا ہو تو سفر کی مدت کی قضا باقی بیویوں کے لیے نہیں ہے۔ مثلاً اگر شوہر قرعہ اندازی کر کے اپنی کسی بیوی کو سفر پر ساتھ لے جائے چاہے سفر ١٦ فرسخ سے کم ہی کیوں نہ ہو، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ جس جگہ سفر کر کے جا رہا ہے وہاں منتقل ہونے اور وہیں مستقل رہنے کا ارادہ نہ ہو، اس صورت میں سفر میں جتنے دن گزرے ہیں ان دنوں کے بقدر دوسری بیویوں کے ساتھ رہنے کی قضا نہیں ہے جو مدت اس نے اپنی ہم سفر بیوی کے ساتھ گزارے ہیں۔ (سفر میں نہ جانے والی بیویوں کے ساتھ سفر کی مدت میں گزرے ہوئے دنوں کی قضا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ ہم سفر بیوی اگر چہ شوہر کی صحبت سے لطف اندوز ہوئی ہے، اس کے باوجود وہ سفر کی مشقت کی وجہ سے تھکی بھی ہے۔ دیکھا جائے ''التہذیب'' ٥/٥٤٢)

رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت رہی ہے کہ جو شخص اپنی بیویوں میں سے کسی کو سفر میں اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب قرعہ اندازی کے ذریعہ کرے۔ (صحیح بخاری: کتاب الهبة: باب هبة المرأة لغیر زوجها ٢٥٩٣، صحیح مسلم: کتاب التوبة: باب فی حدیث الافک ٢٧٧٠) البتہ شرط یہ ہے کہ سفر گناہ کا نہ ہو۔ جس کے نام قرعہ نکلا ہے اس پر اپنے شوہر کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے۔ اگر شوہر قرعہ اندازی کے بغیر کسی ایک کا انتخاب کرے یا سفر گناہ کا ہو تو اپنے سفر کی مدت کے بقدر ایام کی قضا اپنی دوسری بیویوں کے ساتھ کرنا ضروری ہے، اور قرعہ اندازی کے بغیر کسی بیوی کو سفر پر لے جانا حرام ہے، اگر شوہر ایسا کرتا ہے تو وہ گنہگار ہو جاتا ہے۔ (کیوں کہ قرعہ اندازی سے تہمت اور الزام ختم ہو جاتا ہے اور اس میں بیویوں کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ماوردی نے روایت کیا ہے کہ اگر اپنی سبھی بیویوں کو کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کر لے تو یہ جائز ہے۔ اگر بیویاں رضامندی کے بعد مکر جائیں اور قرعہ اندازی پر بضد ہوں تو ان کو یہ اختیار ہے اس وقت جب شوہر نے سفر شروع نہ کیا ہو۔ اگر شوہر سفر شروع کرے

یہاں تک کہ اس کے لیے نماز قصر کرنا جائز ہو جائے تو پھر بیویوں کو یہ اختیار نہیں ہے۔)

اگر شوہر ایک شہر سے دوسرے شہر مستقل رہائش کے لیے سفر کر رہا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنی سبھی بیویوں کو ساتھ لے جائے، اگر قرعہ اندازی کے ذریعہ بعض بیویوں کو اپنے ساتھ لے جائے اور دوسروں کو چھوڑ دے تو وہ گنہگار ہو جائے گا، مگر یہ کہ اس میں سبھوں کو لے جانے کی استطاعت نہ ہو، اس صورت میں شرط یہ ہے کہ وہ اپنی باقی بیویوں کو لے جانے کے لیے واپس آئے، اگر وہ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونا چاہے اور دوسرے شہر میں رہنے کے لیے ان کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش نہ ہو تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے تاکہ ان کو کوئی نقصان نہ ہو یا ان کو تنہائی اور وحشت لاحق نہ ہو، اگر شوہر کی دوری کی وجہ سے ان کو نقصان اور وحشت لاحق ہوتی ہو۔

۴۔ اگر کسی کی ایک بیوی آزاد ہو اور دوسری بیوی باندی تو باندی کے لیے ایک دن اور آزاد کے لیے دو دن، اس صورت میں مخصوص طور پر آزاد عورت کو ایک دن زیادہ ملتا ہے، یہ اس صورت میں ہے جب کہ کسی کی دو بیویاں ہوں؛ ایک بیوی آزاد اور دوسری باندی، یا تو اس وجہ سے کہ شوہر غلام ہو۔ یا اس وجہ سے کہ آزاد ہو اور اس کو باندی سے شادی کرنا جائز ہو، پھر وہ اس کے بعد ایک آزاد سے بھی شادی کر لے، اس صورت میں شوہر پر ضروری ہے کہ وہ باندی کے ساتھ ایک دن گزارے چاہے وہ مکاتب باندی ہو یا بعض حصہ آزاد ہو اور بعض غلام، اور آزاد کے ساتھ دو دن گزارے، یا باندی کی باری سے ایک دن زیادہ، کیوں کہ حضرت علی بن ابو طالبؓ سے یہی مروی ہے اور صحابہ میں سے کسی نے آپ کے فتوی کی مخالفت نہیں کی۔

(بیہقی نے ''السنن الکبری'' میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جب باندی کی موجودگی میں آزاد سے شادی کی جائے تو اس کے لیے دو تہائی ہے اور باندی کے لیے ایک تہائی۔ ۲۹۹/۷۔ ''معرفۃ السنن والاثار میں بھی یہ روایت ہے ۴۶۲۶۔ مصنف عبد الرزاق ۲۴۵/۷، مصنف ابن ابی شیبہ ۴۶۹/۳، یہ قول حسن بصری سے نقل کیا گیا ہے۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۱۳۲۵/۳)

۵/۶/۷۔ اگر بیویوں میں سے کوئی نافرمانی کرے مثلاً ان کو اپنے گھر بلائے جہاں بلانے

کا وہ عادی ہو، اس پر کوئی عورت آنے سے انکار کرے یا شوہر کی اجازت کے بغیر تنہا سفر کرے یا اس کی اجازت سے اس کی ضرورت کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے سفر کرے۔ یا کسی دوسرے کی ضرورت کے لیے سفر کرے اور شوہر کی اجازت بھی ہو، مثلاً کسی اپنے رشتے دار کے لیے عورت کو پیغام دینے کے لیے سفر کرے یا اپنی ضرورت یا کسی دوسرے کی ضرورت پورا کرنے کے لیے سفر کرے مثلاً اس کی کسی دوسرے شخص کے ساتھ تجارتی شراکت ہو اور وہ اس کے ساتھ تجارت کے لیے سفر کرے، یا وہ اپنی مخصوص ضرورت کے لیے سفر کرے مثلاً حج یا عمرہ کی ادائیگی یا اپنی مخصوص تجارت کے لیے اپنے شوہر کی اجازت سے سفر کرے، یا شوہر کی اجازت سے سیاحت کے لیے سفر کرے۔ یا بیوی باندی ہو یا وہ خود کو اپنے شوہر کے حوالے کرنے سے انکار کر دے۔ تو ان تمام صورتوں میں شوہر باقی بیویوں کے درمیان تقسیم کرے گا اور نافرمان، مسافرہ اور باندی کے لیے قضا نہیں ہوگی۔ کیوں کہ جو بیوی شوہر کی اجازت سے اپنی ضرورت کے لیے سفر کرے تو اس کے لیے قضا نہیں ہے، اور نہ اس کے لیے جو خود کو شوہر کے حوالے کرنے سے باز رہے، اگر بیوی اپنے شوہر کی ضرورت پورا کرنے کے لیے سفر کرے تو اس کے واپس آنے کے بعد اس کے سفر کی مدت کی شوہر قضا کرے گا۔

اگر بیوی نے سفر نہ کیا ہو اور شہر ہی میں اپنے شوہر کی اجازت سے بچے جنوانے کے کام میں مشغول ہو تو اس کی باری کا حق باقی رہتا ہے، اسی طرح اس بیوی کا بھی حق باقی رہتا ہے جو اپنے شوہر کی اجازت سے دلہنوں کو سجاتی ہے۔

بیویوں کے درمیان انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ شوہر اپنی بیویوں کے درمیان برابری کرے یعنی ہر ایک بیوی کو ایک رات یا دو راتیں یا تین راتیں تقسیم کرے۔

شوہر کو اپنی بیویوں کی اجازت کے بغیر اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کے لیے تین راتوں سے زائد کی تقسیم کرنا جائز نہیں ہے۔ (یہی مسلک ہے، یہی بات امام نوویؒ نے کہی ہے اور سُلیم رازی نے تین دنوں سے زیادہ کو جائز کہا ہے۔ ابن رفعہ نے ان کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے؛ صحیح یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ۱۳۲۴/۳۔ بغوی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب کسی ایک کے پاس زیادہ دن آدمی رہتا ہے تو اس

سے جدائی دشوار ہوجاتی ہے۔اور کبھی وہ مشغول ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ باقی بیویوں کا حق ادا کرنے سے عاجز ہوجاتا ہے۔دیکھا جائے ''التہذیب'' ۵/۵۳۶) کیوں کہ تین راتوں سے زیادہ لمبی باری سے اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کے ساتھ شوہر کی ملاقات کے درمیان فاصلہ طویل ہوجاتا ہے۔جو اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم میں برابری نہیں کرتا ہے تو وہ گنہگار رہوتا ہے۔(کیوں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کسی شخص کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک حصہ گرا ہوا ہوگا''۔مسند احمد ۲/۳۴۷،ترمذی: کتاب النکاح، باب التسویۃ بین الضرائر ۱۱۴۱،نسائی: کتاب عشرۃ النساء، باب میل الرجل الی بعض نساءہ ۷/۶۳)

اگر بیویوں میں سے ہر ایک اپنی باری پہلے شروع کرنے کا مطالبہ کرے تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کرنا ضروری ہے،جس کے نام قرعہ آئے گا باری اس سے شروع ہوگی، اس کی باری ختم ہونے پر شوہر باقی بیویوں کے درمیان قرعہ نکالے گا،اسی طرح کرے گا یہاں تک کہ ان سبھوں کی باری ختم ہوجائے گی۔پھر شوہر پر ضروری ہے کہ وہ اس ترتیب کی پابندی کرے۔ان کے درمیان نئی قرعہ اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جماع کرنا شوہر پر ضروری نہیں ہے: شوہر پر اپنی بیویوں کے ساتھ جماع کرنے میں برابری کرنا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ جماع کرنے کا تعلق دل سے ہے،اس میں انسان کو اختیار نہیں ہے،اور لطف اندوزی کے دوسرے طریقوں مثلاً بوس وکنار وغیرہ میں بھی برابری ضروری نہیں ہے، بلکہ اپنی بیویوں کے درمیان ان امور میں برابری کرنا مستحب ہے۔

اگر وہ اپنی سبھی بیویوں کی باری سے گزرے اور ان میں سے کسی کے ساتھ بھی جماع نہ کرے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا،البتہ شرط یہ ہے کہ اس کی بیویوں سے روگردانی ان کی وحشت وتنہائی اور بگاڑ کا سبب نہ بن جائے۔

اگر شوہر اپنی بیویوں میں سے کسی ایک کی باری میں کسی عذر کی وجہ سے رات کے وقت نکل جائے تو وہ اس عورت کے لیے چھوٹے ہوئے دن کی قضا کرے گا؛ مثلاً کوئی کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی کسی بیوی کی باری میں اپنے گھر سے باہر پوری رات گزارنے پر

مجبور ہوجائے تو اس صورت میں آنے والی رات گزری ہوئی رات کی قضا کرے گا۔(دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۵/۵۳۷)

اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی کی نشانی نظر آئے مثلاً وہ اپنے شوہر سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنے کی عادی ہو پھر وہ اس کو سختی سے مخاطب کرنے لگے۔یا شوہر اس کے تصرفات میں محسوس کرے کہ تبدیلی آئی ہے یا بیوی اس کو ناپسند کرنے لگی ہے:

۱۔اس صورت میں سب سے پہلے شوہر بیوی کو وعظ ونصیحت کرے، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ معذور ہو۔یا وہ اپنی نافرمانی سے توبہ کرلے اگر کوئی عذر نہ پایا جائے۔وعظ ونصیحت میں پہلے نرمی اختیار کرے گا،سختی کے ساتھ پیش نہیں آئے گا،اگر وعظ ونصیحت سے کوئی فائدہ نہ ہوتو اس کو اللہ کے غضب سے ڈرائے گا کہ وہ نافرمانی کرتی رہے گی اور کسی عذر کے بغیر شوہر کی معصیت جاری رکھے گی تو اللہ کا غضب ہوگا،اس کے سامنے واضح کرے گا کہ اگر وہ نافرمانی جاری رکھے گی تو تقسیم اور نفقہ میں اس کا حق ختم ہوجائے گا۔

۲۔یا نافرمانی محقق ہوجائے،اگر بار بار نافرمانی نہ ہوتو شوہر اس کو نصیحت کرے گا اور اس کا بستر چھوڑ دے گا اور اس کو مارے گا۔(''عجالۃ المحتاج'' میں ہے: اگر نافرمانی محقق وثابت ہوجائے اور مکرر نہ ہوتو شوہر نصیحت کرے گا اور بستر چھوڑ دے گا،اور قولِ اظہر کے مطابق نہیں مارے گا۔کیوں کہ وہ جرم موکد نہیں ہوا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے اتفاقی طور پر اس سے نافرمانی سرزد ہوجاتی ہے جو جلد ہی ختم ہوسکتی ہے،اس وجہ سے تکلیف دینے یا تادیب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔نووی نے یہ کہتے ہوئے ان کا تعاقب کیا ہے: قول اظہر یہ ہے کہ اس کو مارا جائے گا۔واللہ اعلم۔یہی آیت کے ظاہر کے مطابق ہے)البتہ شرط یہ ہے کہ مار ایسی ہو جس سے نہ خون بہے اور نہ ہڈی ٹوٹے،اللہ کا فرمان ہے: ''وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ'' (نساء ۳۴)(اور جن کی نافرمانی کا تمہیں خوف ہوتو ان کو نصیحت کرو اور ان کا بستر چھوڑ دو اور ان کو مارو)مارنا اس وقت صحیح ہوتا ہے جب عورت کی نافرمانی کی اصلاح ہونے میں مفید ہو، یہ ضروری ہے کہ مار ایسی ہو جس سے نہ ہڈی ٹوٹے اور نہ خون بہے،شوہر پر ضروری ہے کہ شوہر عورت کے چہرہ یا سینے پر نہ مارے۔یہاں ''تخافون'' کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کی نافرمانی کو جانو۔

۳۔اگر میاں بیوی کے درمیان اختلافات گہرے ہوجائیں اوران دونوں کے درمیان جھگڑا قاضی کے پاس پہنچ جائے ،اگردونوں یہ دعوی کریں کہ دوسرے نے اس پرزیادتی کی ہے۔اورصحیح صورتِ حال سامنے نہ آئےتو قاضی میاں بیوی کی رضامندی سے واجبی طورپردوحکم بھیجے گا جوان دونوں کے درمیان مصلحت دیکھتے ہوئے یاتواصلاح کرائیں گے یاعلحیدہ کریں گے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے بیوی کی زیادتی اوراپنے شوہرکی نافرمانی کاحکم واضح کیاہے،اب ہم میاں بیوی دونوں کی زیادتی کے مسائل بیان کررہے ہیں۔اگرقاضی کومیاں بیوی میں سے کسی کی زیادتی کے بارے میں معلوم ہوجائےتو قاضی اس کوروکے گا۔اگرشوہررات گزارنے یا نفقہ میں بیوی کاحق ادانہیں کررہاہےتو قاضی اس کودینے پرمجبورکرے گا۔اگرقاضی کومعلوم ہو جائے کہ شوہربیوی کےساتھ بدسلوکی کرتاہے یااس کوگالی دیتاہےتواس کوروکنا قاضی پرضروری ہے،اگرشوہرکی طرف سے باربار یہ جرم ہوجائےتو میاں بیوی کی مصلحت اورمفاد دیکھتے ہوئے قاضی شوہرکی تادیب کرے گا،اگرمیاں بیوی کے درمیان باربار جھگڑے ہوتے ہوں تو قاضی کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کی تادیب اور ڈانٹ ڈپٹ میں مبالغہ کرے، کیوں کہ میاں بیوی کے درمیان ازدواجی زندگی میں اختلافات ہوتے رہتے ہیں ،اگرباربار سرزنش اورتادیب کی جائے گی تواس سےان دونوں کے درمیان نفرت پیداہوجائے گی۔

میاں بیوی پرضروری ہے کہ وہ دوسرے کا خیال رکھیں اور بہترسلوک کریں ،اگربیوی کو محسوس ہوکہ اپنی عمرکی زیادتی یاخوبصورتی میں کمی کی وجہ سےشوہرکواس میں خواہش نہیں ہےتو وہ اپنی محبت اورشفقت ومہربانی کے ذریعہ اس کاپیارحاصل کرسکتی ہے۔اگراس کی دوسری بیوی ہےتواپنے شوہرسے کہہ سکتی ہے:میں آپ کے نکاح میں رہتے ہوئے دوسری بیوی کے لیے اپنی باری کےحق سے دست بردار ہوجاتی ہوں۔ام المومنین سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔وہ بوڑھی عورت تھی اوراس کواندیشہ ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کوطلاق دینے والے ہیں، انہوں نے آپؐ کےسامنےاپنامعاملہ یہ کہتے ہوئے پیش کیا:جودلچسپی دوسری بیویوں کے پاس ہے وہ مجھ میں نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ قیامت کے دن آپ کی ازواج مطہرات میں رہوں۔اورانہوں نے آپ سے طلاق نہ دینے کی درخواست کی۔اوراپنی باری ام المومنین

حضرت عائشہؓ کے لیے ہبہ کیا۔رسول اللہ نے اس کی موافقت کی،آپؐ سودہؓ کی باری حضرت عائشہؓ کے یہاں گزارتے تھے۔(صحیح بخاری: کتاب النکاح،باب المرأۃ تھب یومھامن زوجھالضرتھا۵۲۱۲، صحیح مسلم: کتاب الرضاع،باب جواز ھبتھالضرتھا۱۴۶۳،امام نووی نے''شرح صحیح مسلم''میں کہاہے۱۰/۴۸:اس سے اپنی باری اپنی سوکن کو ہبہ کرنا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کاحق ہے،لیکن شرط یہ ہے کہ شوہراس پرراضی ہو، کیوں کہ شوہرکوہبہ کرنے والی وہ ہے،اس لیے وہ اپنی رضامندی سے ہی اس حق کوچھوڑسکتاہے،البتہ بیوی اس ہبہ پرعوض لےسکتی ہے۔اپنی باری شوہرکوبھی ہبہ کرسکتی ہے کہ شوہراس کی باری جس کوچاہے ہبہ کرے۔یہ بھی کہا گیا ہے :اس پرضروری ہے کہ اس باری کوباقی بیویوں پرتقسیم کرے)

جب خیال کرے کہ وہ بوڑھا ہوگیاہےاوراس کی بیوی کواس میں خواہش نہیں ہے،اس صورت میں وہ اپنی بیوی کادل اس پرزیادہ خرچ کرکے لبھاسکتاہے،اس کوہدیہ وتحائف پیش کرے،اس کی تعریف کرےاوراس کاشکریہ اداکرے، پہلے قدیم زمانہ میں کہاگیاہے: تم میٹھے بول اورمیٹھی زبان سے پہاڑکوایک بال سے کھینچ سکتے ہو۔(یہ فارسی مثال ہے)

اگرمیاں بیوی دونوں ایک دوسرے پرظلم وزیادتی کاالزام لگائیں اورقاضی کی سمجھ میں کچھ نہ آئےتو وہ میاں بیوی کی رضامندی سے دوحکم بھیجے گا تاکہ وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی وجوہات تلاش کریں اوراس کےاسباب سے واقف ہوں،میاں بیوی دونوں سےمل کرحکم اپناکام شروع کریں،اگربیوی کاحکم اس کےمحارم میں سے ہوتو وہ تنہائی میں اس سے ملے ورنہ کسی محرم کی موجودگی میں ملے،تاکہ میاں بیوی میں سے ہرایک اپنے دل کی بات اورحقیقی شکایت ان کےسامنے بیان کریں۔

مستحب یہ ہے کہ بیوی کاحکم اس کے رشتے داروں میں سےکوئی ہواورشوہرکاحکم بھی اس کے رشتے داروں میں سےکوئی ہو،ان دونوں حکم پرضروری ہے کہ جس میں میاں بیوی کامفاد ہے وہی کام کریں، چاہےدونوں کے درمیان اصلاح کرائیں اوردونوں کوملائیں،یادونوں کو علحیدہ کردیں،جیسا کہ اس فرمان الہی میں ہے:''وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا ''(نساء۳۵)(اوراگرتم کوان دونوں کےدرمیان جھگڑے کاخوف ہوتواس (مرد) کےگھرسےایک حکم اوراس (عورت) کےگھرسےایک حکم

بھیجو) حکم کا شوہر اور بیوی کے گھر والوں میں سے ہونے کی حکمت یہ ہے کہ رشتے دار ایک دوسرے کے مفادات جانتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔(ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: فقہاء نے کہا ہے: جب میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوجائے تو حاکم ان دونوں کو بھروسہ مند جگہ پر ٹھہرائے گا اور ان دونوں کے معاملے میں غور کرے گا، ان میں سے ظلم کرنے والے کو ظلم سے منع کرے گا، اگر ان دونوں کا معاملہ گھمبیر ہوجائے اور دونوں کے اختلافات بڑھ جائیں تو حاکم عورت کے گھر والوں میں سے ایک ثقہ آدمی اور شوہر کے گھر والوں میں سے ایک ثقہ آدمی متعین کرے گا، تاکہ وہ مل بیٹھ کر ان کے معاملہ پر غور کریں اور جس میں مفاد ہو وہی فیصلہ کریں، یا تو دونوں کو ملائیں یا علحیدہ کریں، شارع نے دونوں کو ملانے کو پہلے بیان کیا ہے، فرمان الٰہی ہے ''ان یریدا اصلاحا یوفق الله بینهما'')

حکم شوہر اور بیوی کے وکیل ہوتے ہیں، اس لیے شوہر اپنے حکم کو طلاق دینے اور عوض قبول کرنے کا وکیل بنائے گا۔ اور بیوی اپنے حکم کو مال خرچ کرنے اور طلاق قبول کرنے کا وکیل بنائے گی۔ (اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف مشہور ہے، مالکیہ کے نزدیک یہ دو حکم فیصلہ کرنے والے ہیں، وکیل نہیں۔ دیکھا جائے: ''احکام القرآن'' ابن عربی ۱/۴۲۴، مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''تفسیر ابن کثیر'' ۲/۲۹۷)

یہ حکم قاضی کے نمائندے نہیں ہیں اور نہ اس کی نیابت کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں، کیوں کہ معاملہ کبھی طلاق اور علحیدگی تک پہنچتا ہے، اور شرمگاہ شوہر کا حق ہے اور مال عورت کا حق ہے اور وہ دونوں عاقل و بالغ ہیں، اس وجہ سے مصلحت اور مفاد اس میں نہیں ہے کہ ان دونوں پر حاکم یا قاضی کی طرف سے کوئی مسلط ہوجائے۔ (اس موقع پر ابن عربی نے ''احکام القرآن'' میں ایک سوال کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: اگر کہا جائے: اگر شوہر یا بیوی کی طرف سے ظلم واضح ہوجائے تو ظلم کا واضح ہونا نکاح کے منافی نہیں ہے، بلکہ ظالم سے مظلوم کا حق لیا جائے گا اور عقد باقی رہے گا۔ ہم کہتے ہیں: یہ کوتاہ نظر ہے جس کا تصور مالی عقود میں کیا جاتا ہے، جہاں تک جسمانی عقود کا تعلق ہے تو یہ اتفاق و اتحاد اور آپس میں رضامندی اور معاشرت سے مکمل ہوتے ہیں، اگر یہ چیزیں نہ پائی جائیں تو عقد باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور مصلحت علحیدگی میں ہی ہے۔ اور دونوں حکم چھوڑنے یا شوہر یا بیوی سے کوئی چیز لینے کی کوئی صورت نکالیں)

حکم کا مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، ازدواجی مسائل میں فیصلہ کرنے کے لائق ہونا اور عادل ہونا شرط ہے، اور سنت یہ ہے کہ مرد ہوں۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

خلع

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''الوسیط'' امام غزالی ۵/۳۰۹، ''روضۃ الطالبین'' ۷/۳۸۳، ''فتح الوہاب'' شیخ الاسلام زکریا ۲/۶۶)

خُلع عربی زبان میں خَلع سے نکلا ہوا ہے جس کے معنی چھیننے کے ہیں، کیوں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں، خلع کے ذریعہ ان دونوں سے یہ لباس چھین لیا جاتا ہے، یہ طلاق کی ایک قسم ہے، یہ مکروہ حلال ہے، اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ جب میاں بیوی کو معلوم ہوجائے کہ اگر وہ علحیدہ نہیں ہوئے تو اللہ تعالی کی طرف سے میاں بیوی ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد کردہ حقوق ادا نہیں کر پائیں گے۔

شوہر اس صورت میں خلع کا سہارا لے سکتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کے کرنے پر اپنی بیوی کو تین طلاق دے جس کا کرنا ضروری ہے مثلاً کھانا، پینا اور قضائے حاجت، اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر یہ کام اس سے ہوگیا تو اس کی بیوی کو تین طلاق ہوجائے گی اور اس صورت میں وہ عورت پھر اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوتی ہے جب تک عدت گزرنے کے بعد دوسرے سے شادی نہ کرلے اور دوسرے شوہر کی طرف سے طلاق دیے جانے کے بعد اس کی بھی عدت نہ گزر جائے۔

اس صورت میں اگر شوہر کو تین طلاق ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ اپنی بیوی سے خلع کا مطالبہ کرسکتا ہے مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: اگر میں زید کے گھر جاؤں تو تم کو تین طلاق۔ پھر وہ کسی اپنے کام کی وجہ سے زید کے گھر جانے پر مجبور ہوجائے تو اس صورت میں اپنی بیوی سے خلع لینے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور زید کے گھر جاسکتا ہے پھر وہ اپنی بیوی سے نیا عقدِ نکاح کرے گا، اس طرح اس کو دلدل سے نکلنے کا ایک راستہ مل جاتا ہے، اس کے بعد

زید کے گھر جانے سے اس کی بیوی کو تین طلاق نہیں ہوتی ہے۔

خلع کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے: ''فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا'' (نساء۴) اور اگر وہ تمہارے لیے خوش دلی سے کچھ چھوڑ دیں تو اسے ذوق شوق سے کھاؤ۔

یہ بھی فرمان خدا ہے: ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ '' (بقرہ ۲۲۹) سو اگر تمہیں اس کا ڈر ہو کہ وہ دونوں احکاماتِ الٰہی قائم نہ رکھ سکیں گے تو (ایسی صورت میں) عورت جو مالی معاوضہ دے اس میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

بخاری نے ثابت بن قیسؓ کی بیوی جمیلہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: اللہ کے رسول! ثابت بن قیس؛ میں ان کے اخلاق میں ان کی سرزنش نہیں کرتی ہوں اور نہ دین کے سلسلہ میں، لیکن میں اسلام میں کفر کو پسند کرتی ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا تم ان کا باغ ان کو لوٹاؤ گی؟''۔ اس نے کہا: جی ہاں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے قیس سے فرمایا: ''باغ قبول کرو اور اس کو ایک طلاق دو''۔ (صحیح بخاری: کتاب الطلاق، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ ۳/۵۲۷) ثابت نے جمیلہ سے باغ قبول کیا اور اس کو ایک طلاق دی۔

کسی عوض کے بدلے طلاق دینا خلع ہے، اس کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ (بکر بن عبداللہ مزنی کا خیال ہے کہ اس فرمان الٰہی کی وجہ سے خلع منسوخ ہے: ''وما آتيتم إحداهن قنطارا فلا تأخذوا منه شيئاً'' (نساء۲۰) (اور جو تم نے ان (عورتوں) میں سے کسی کو ایک ڈھیر مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی مت لو) ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس کو بیان کیا ہے ۱/۴۶۱۔ اور کہا ہے کہ یہ ضعیف قول ہے)

خلع کے ارکان پانچ ہیں:

۱۔ واجب کرنے والا یعنی شوہر۔

۲۔ خلع دینے والی یعنی بیوی؛ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کو مال میں تصرف کا مکمل اختیار ہو۔

۳۔ محل؛ یعنی حقِ لطف اندوزی اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ شوہر کی ملکیت میں ہو، اس لیے جس عورت کو طلاق بائن دی ہو تو اس کی طرف سے خلع صحیح نہیں ہے۔

۴۔ عوض؛ یہ وہ بدل ہے جس کی پابندی خلع لینے والی شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے۔

۵۔ صیغہ یعنی ایجاب وقبول؛ مثلاً شوہر اپنی بیوی سے کہے: ایک ہزار درہم کی شرط پر میں تم کو خلع دیتا ہوں۔ اس پر بیوی کہے: میں نے ایک ہزار درہم کے بدلے خلع کو قبول کرلیا۔ اگر وہ مال ادا کرے تو ان دونوں کے درمیان خلع ہو جاتا ہے۔ (دیکھا جائے ''الوسیط'' امام غزالی ۵/۳۲۱، عجالۃ المحتاج ابن ملقن ۳/۱۳۳۱)

خلع اس شوہر کی طرف سے علٰحیدگی ہے جس کا طلاق کسی عوض کے مقابلہ میں صحیح ہو، یا تو طلاق کے لفظ سے ہوتا ہے یا خلع کے لفظ سے، چاہے لفظ صریح ہو یا کنایہ مثلاً جدائیگی، علٰحیدگی، فراق وغیرہ، جب یہ عوض کے مقابلہ میں اور طلاق یا خلع کی نیت سے ہو تو خلع ہو جاتا ہے، شوہر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا طلاق صحیح ہو یعنی وہ بالغ، عاقل اور رشید ہو، بچہ اور پاگل نہ ہو، بیوی میں بھی یہ شرط ہے، اور وہ چیز مقصود اور مال ہو، اس لیے شراب یا خنزیر ہونا صحیح نہیں ہے، اسی طرح معلوم ہو، اس لیے مجہول پر خلع صحیح نہیں ہے، عوض شوہر کے لیے ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا خلع میں شریک ہو، مثلاً زید اپنی بیوی سے کہے: اگر تم میرا ذمہ اور عمرو کا ذمہ قرض سے بری کردو جو میرے ذمے ایک سو درہم اور عمرو کے ذمے ایک سو درہم ہے تو میں تم کو خلع دوں گا۔ جب بیوی اپنے شوہر اور عمرو کا ذمہ قرض سے بری کردے تو اس کا خلع شرعی طور پر صحیح ہو جاتا ہے۔

اگر عوض مقصود نہ ہو تو طلاق رجعی ہو جاتی ہے، جب شوہر اپنی بیوی سے کہے: میں نے تمھیں خلع اس شرط پر دیا کہ تم عمرو کا قرض معاف کردو۔ اور بیوی اس کو قبول کرلے تو اس کو طلاق ہو جاتی ہے اور عمرو کا ذمہ قرض سے بری ہوتا ہے۔

یہ خلع کے لفظ سے طلاق ہے جب عوض کے بدلہ ہو، یہ فسخ نہیں ہے، اگر صحیح معاوضہ کے ساتھ خلع واقع ہو جائے تو لازم ہو جاتا ہے اور خلع ایک طلاق شمار ہوگی جس کو شوہر کے لیے شریعت میں اجازت دی ہوئی تین طلاق میں سے کم کیا جائے گا۔ (کیوں کہ اللہ تعالی نے

اس کا تذکرہ دوطلاق کے درمیان کیا ہے، اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوطلاق کے ساتھ ملحق ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ''الطلاق مرتا ن''۔(طلاق دومرتبہ ہے) پھر اللہ تعالی فرماتا ہے: ''فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلاجنا ح علیھما فیماافتدت بہ'' (پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کے حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عورت جو کچھ دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے) پھر اللہ تعالی فرماتا ہے: ''فان طلقھا فلاتحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاًغیرہ'' (بقرہ ۲۲۹۔۲۳۰) (پھر اگر اس کو طلاق دے تو وہ اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ دوسرے (مرد) سے شادی نہ کرلے) اگر شوہر تین مرتبہ بیوی کو خلع دے تو پھر اس کے ساتھ اس وقت تک نکاح جائز نہیں ہے جب تک وہ دوسرے مرد کے ساتھ شادی نہ کرلے۔ دیکھا جائے؛ ''مغنی المحتاج'' ۵۳۵/۴) یہ اس اعتبار سے فسخ سے مختلف ہے، کیوں کہ فسخ ایک طلاق شمار نہیں ہوتا ہے اور اس کو شوہر کے لیے شریعت کی طرف سے عطا کردہ تین طلاق کے حق سے کم بھی نہیں کیا جاتا ہے، کیوں کہ فسخ کی صورت میں شوہر ادا کردہ مہر واپس لیتا ہے، اگر کوئی ایک ہزار درہم مہر دے کر کسی عورت سے شادی کرلے پھر معلوم ہوجائے کہ وہ پاگل ہے تو شوہر اس کا عقد فسخ کردے گا اور پاگل پن کے عیب کی وجہ سے ایک ہزار درہم واپس لے گا، اگر یہ فسخ بیوی کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے ہو، جب کہ خلع کسی بھی مقدار والے معاوضہ پر ہوجاتا ہے۔

امام شافعی کے قولِ قدیم کے مطابق خلع فسخ ہے اور اس کی وجہ سے تین طلاق کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ (دیکھا جائے ''الام'' ۱۲۰/۵، ''الوسیط'' ۳۱۱/۵) علماء شوافع میں سے بہت سے متقدمین اور متاخرین علماء نے اس کو اختیار کیا ہے، لیکن اس پر فتوی دینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ مسلک شافعی کے قولِ معتمد کے یہ مخالف ہے۔

اگر فاسد معاوضہ پر خلع ہوجائے مثلاً شراب پر، یا کسی معاوضہ کے تذکرہ کے بغیر خلع ہوجائے اور وہ بیوی سے قبول کرنے کی درخواست کرے تو شوہر کے لیے مہرِ مثل واجب ہوجاتا ہے جو بیوی اپنے شوہر کو دے گی، کیوں کہ معاوضہ کے فاسد ہونے کی صورت میں مرجع مہرِ مثل ہے۔

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو خلع دے اور معاوضہ کا تذکرہ نہ کرے اور شوہر کی نیت یہ ہو کہ بیوی قبول کرلے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر بیوی خلع کو قبول کرلے تو یہ معاوضہ کے بغیر واقع نہیں ہوتا ہے، اگر بیوی خلع کو قبول کرلے تو اس پر ضروری ہوجاتا ہے کہ خلع دینے کے عوض اپنے شوہر کو مہرِ مثل ادا کرے، کیوں کہ لوگوں میں عام عرف یہ ہے کہ شریعت نے یہ بات طے کردی ہے کہ خلع معاوضہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ اگر وہ خلع کو قبول کرلے اور شوہر معاوضہ متعین نہ کرے تو مہر مثل کی طرف رجوع کرنا واجب ہوجاتا ہے جو بیوی اپنے شوہر کو دے گی۔ (یہی مسلک میں زیادہ صحیح قول ہے۔ دوسرا قول ہے کہ مہر مثل واجب نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس کو لازم کرنا نہیں پایا جاتا ہے۔ دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ۱۳۳۶/۳)

یہ علیحدگی بائنہ ہے:

خلع کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان جو علیحدگی ہوتی ہے وہ رشتہ ازدواج کو ختم کرنے والی علیحدگی ہے، جس عورت کو اپنے شوہر سے خلع ملا ہو تو وہ اس کی عصمت سے نکل جاتی ہے چاہے وہ عدت کی مدت کے دوران ہی کیوں نہ ہو، اس لیے عدت کے دوران نہ اس کو طلاق ہوتی ہے اور نہ ظہار اور نہ ایلاء، اور شوہر کو اس سے رجوع کرنے کا بھی حق نہیں ہے، اسی طرح اس عورت کو حاملہ نہ ہونے کی صورت میں نہ نفقہ ملے گا اور نہ کپڑا، البتہ حاملہ اپنے شوہر سے خلع لے تو اس کے حاملہ ہونے کی وجہ سے اس کے شوہر پر نفقہ اور کپڑا دینا ضروری ہے۔ (''الحاوی الکبیر'' ۱۶/۱۰)

اپنے شوہر سے خلع لینے والی بیوی کو وراثت میں حق نہیں ہے۔ (''الحاوی الکبیر'' ۱۹/۱۰) اگر خلع کے بعد ان دونوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے اور ان کے درمیان تمام ازدواجی رشتے منقطع ہوجائیں گے، اگر خلع کے بعد شوہر اس سے جماع کرے تو اس پر زنا کی حد نافذ ہوگی اور یہ عورت اس کے لیے عقدِ جدید کے بغیر حلال نہیں ہوتی ہے، اگر اپنی بیوی کو خلع دینے والے شوہر کا انتقال عدت کے دوران ہوجائے تو وہ عورت متوفی عنہا کی عدت کی طرف منتقل نہیں ہوگی، اگر اپنے شوہر سے خلع پانے والی عورت باندی ہو اور عدت کے دوران انتقال ہوجائے تو وہ عورت

متوفی عنہا کی عدت کی طرف منتقل نہیں ہوگی، اگر اپنے شوہر سے خلع پانے والی عورت باندی ہو اور عدت کے دوران اس کو آزاد کردیا جائے تو خلع واقع ہونے کے بعد آزاد کی عدت لازم نہیں ہوگی، بلکہ وہ صرف باندی کی عدت ہی مکمل کرے گی، اگر معلق طلاق سے پہلے خلع ہوجائے اور خلع ہونے کے بعد وہ چیز ہوجائے جس پر طلاق معلق کی گئی تھی تو اپنے شوہر سے خلع لینے والی عورت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ (ایضاً ١٠/١٦، ١١/٢٩١) جب کہ طلاق رجعی کی وجہ سے عدت گزارنے والی عورت کو طلاق بھی ہوتی ہے اور ظہار اور ایلاء بھی واقع ہوتا ہے اور وہ عدت کے نفقہ کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ حاملہ بھی نہ ہو۔

اگر طلاق رجعی کی وجہ سے عدت گزارنے والی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے تو وہ متوفی عنہا کی عدت میں منتقل ہوجاتی ہے، اگر طلاق رجعی کی وجہ سے عدت گزارنے والی کو معلق طلاق دی جائے اور معلق کی ہوئی چیز وجود میں آئے تو اس کو طلاق ہوجاتی ہے، خلاصہ کلام یہ کہ طلاق رجعی جس کو دی گئی ہے وہ مذکورہ تمام امور میں خلع لینے والی سے مختلف ہے۔

واللہ سبحانہ تعالی أعلم

طلاق

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: أسنی المطالب: شیخ الاسلام زکریا ٣: ٢٦٣۔ الإقناع: خطیب شربینی: ٢: ٩٩، الوسیط: غزالی ٥: ٣٥٩)

طلاق کی بہت سی قسمیں ہیں اور خلع ان اقسام میں سے ایک قسم ہے، عرب زمانہ جاہلیت سے ہی طلاق سے واقف ہیں اور شریعتِ اسلامیہ نے اس میں چند تبدیلیاں کی ہے۔

طلاق کے لغوی معنی قید کھولنا ہے۔ اور شرعی معنی طلاق یا دوسرے لفظ سے عقد نکاح کو کھولنا ہے، طلاق کے دلائل قرآن، حدیث اور اجماعِ امت ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتا ہے: ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ'' (بقرہ ٢٢٩) طلاق دو مرتبہ ہے۔

امام ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بھی حلال چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو''۔ (ابوداؤد: کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق ١٨٧٥، ''المستدرک علی الصحیحین'' حاکم: کتاب الطلاق ٢٧٢٦، ''السنن الکبری''، بیہقی ٧/٣٢٢) یعنی حلال کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک مکروہ ہے۔ اور ہر مکروہ: اگرچہ وہ حلال ہے ناپسندیدہ اور مبغوض ہے، اور طلاق حلال کی قسموں میں سے ہے۔

طلاق کی پانچ قسمیں ہیں: (دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ٦/٦، ''اللباب'' محاملی ١/٣١٥) واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام۔

واجب طلاق: مثلاً وہ طلاق جس کو قاضی اس شخص پر نافذ کرتا ہے جو قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے چار مہینوں سے زیادہ مدت تک جماع نہیں کرے گا۔ جب چار مہینے گزر جائیں اور وہ اپنی بیوی سے جماع نہ کرے تو اس صورت میں قاضی اپنی طرف سے اس کی بیوی کو ایک طلاق دے گا، اور میاں بیوی کے درمیان اختلافات کی صورت میں جب دونوں حکم علحیدگی بہتر سمجھیں۔

مستحب طلاق : مثلاً اس شخص کا طلاق دینا جو اپنی بیوی کے ازدواجی حقوق ادا کرنے سے عاجز ہو، یا اس کی بیوی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ اس سے خیانت کرتی ہے یا وہ پاک دامن نہیں ہے، یا اس کے اخلاق اتنے برے ہیں کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں ہے اور شوہر کا اس کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے۔ (اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: اللہ کے رسول! میری زوجیت میں ایک خوبصورت عورت ہے جو کسی چھونے والے کا ہاتھ لوٹاتی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اس کو طلاق دو''۔ ابوداؤد: کتاب النکاح، باب النہی عن التزویج ممن لم یلد من النساء ۲۰۴۹، نسائی: ''السنن الکبری'': کتاب النکاح، باب تحریم زواج الزانیۃ ۵۳۲۰، یہ روایت ابن عباسؓ سے ہے) حقیقت یہ ہے کہ مطلقاً بہترین اخلاق والی بیوی نادر الوجود ہے۔

مباح طلاق : مثلاً اس شخص کی طرف سے طلاق جس کو اپنی بیوی میں رغبت اور خواہش نہ ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی پر اس بیوی کا نفقہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے جس سے وہ لطف اندوز نہ ہو رہا ہو، یہ حماقت ہے کہ باپ یا ماں اپنے بیٹے سے اس کی بیوی کو کسی وجہ کے بغیر طلاق دینے کے لیے کہیں، اس طرح وہ اچھا کام نہیں کرتے ہیں۔

مکروہ طلاق : مثلاً اس بیوی کو طلاق دینا جس کے ساتھ وہ بھلے طریقہ سے زندگی گزار رہا ہو اور وہ اخلاقی طور پر بہتر ہو اور مذکورہ عیوب سے خالی ہو۔

حرام طلاق: مثلاً حیض کی حالت میں طلاق دینا یا ایسے طہر میں طلاق دے جس میں جماع کیا ہو۔

طلاق کے ارکان:

طلاق کے چار ارکان ہیں: طلاق دینے والا، صیغہ، ارادہ اور بیوی، طلاق دینے والے کے لیے شرط یہ ہے کہ (یہ اصل اور عام طور پر شوہر ہوتا ہے) بالغ، عاقل، مختار اور غیر مکرہ ہو یعنی مجبور کیا ہوا نہ ہو، بچے یا پاگل یا مجبور کیے ہوئے کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، ابن عباس کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''طلاق اس کے لیے ہے جو پنڈلی کو پکڑ لے''۔

(ابن ماجہ: کتاب الطلاق، باب نکاح العبد ۲۰۸۱، طبرانی: المعجم الکبیر: ۹/۴۹۶، ''السنن الکبری'' بیہقی ۷/۳۶۰)

طلاق کے صیغہ کی دو قسمیں ہیں: لفظ طلاق، فراق، سراح، یا خلع یا شوہر سے یہ سوال کرنے والے: کیا تم نے اپنی بیوی کو طلاق دیا؟ کا جواب ''ہاں'' میں دینا صریح طلاق ہے، اس صورت میں ہاں کے لفظ کا استعمال ''میں نے طلاق دیا'' کی طرح ہے۔ (طلاق کی اس صریح قسم سے بغیر نیت کے طلاق ہو جاتی ہے۔ دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۶/۲۱)

کنایہ طلاق جس میں طلاق اور دوسرے معنی کا احتمال ہے مثلاً کہے: تم خالی ہو۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ تم شوہر سے خالی ہو۔ یا یہ بھی احتمال ہے کہ عیوب سے خالی ہو۔ اگر طلاق کی نیت سے یہ کہا ہے تو طلاق ہو جاتی ہے، اگر طلاق کا ارادہ نہ ہو تو طلاق نہیں ہوتی ہے۔

ارادہ: یعنی لفظ طلاق کہتے وقت عقدِ نکاح ختم کرنے کا ارادہ ہو، اگر یہ ارادہ نہ ہو مثلاً کوئی شخص کسی قوم سے کوئی چیز طلب کرے اور وہ اس کو نہ دے۔ اس پر ان لوگوں سے وہ کہے: میں نے تم کو چھوڑ دیا (**طَلَّقْتُکَ**) ان میں اس کی بیوی بھی موجود ہو تو اس کو طلاق نہیں ہوگی، کیوں کہ طلاق دینے والے کا ارادہ طلاق دینے کا ہو، ورنہ یہ صیغہ لغو ہو جائے گا۔ (یہ دیگر چند صورتوں میں بھی ہوتا ہے: سویا ہوا، پاگل، سبقت لسانی، نداء اور عجمی لفظ تو ان سے طلاق نہیں ہوتی ہے اگر اس میں قصد وارادہ کا رکن نہ پایا جائے)

بیوی :اس کو طلاق ہوتی ہے۔ (امام ماوردی نے ''الحاوی'' ۱۰/۱۱۳ میں لکھا ہے: ''طلاق شوہر کی طرف سے ہے اور بیوی پر ہوتی ہے''۔) اسی طرح طلاق اس کے بدن کے کسی عضو یا جزء کو دینے سے بھی ہوتی ہے مثلاً اس کے ہاتھ، دل، بال، ناخن، خون، روح اور چربی کو طلاق دی جائے۔ مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: تمھارے ہاتھ کو طلاق دی۔ تو اس صورت میں بیوی کو طلاق ہو جاتی ہے، البتہ اس کے لعابِ دہن، دودھ اور پسینے کو طلاق دینے سے طلاق نہیں ہوتی ہے۔

اگر کوئی اپنی بیوی سے کہے: تم کو ایک چوتھائی طلاق دی۔ تو یہ مکمل طلاق ہو جاتی ہے، کیوں کہ طلاق کے حصے نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ (''الوسیط'' غزالی ۵/۴۱۱)

نکاح سے علحیدگی طلاق اور فسخ سے ہوتی ہے؛ یہ اس وقت ہوتا ہے جب میاں اور

بیوی زندہ ہوں، نکاح سے علحید گی میاں بیوی میں سے کسی کی موت کی وجہ سے ہوتو یہ نہ طلاق ہے اور نہ یہ فسخ ہے۔

طلاق کی چار قسمیں ہیں: معہود، اس کی تفصیلات آرہی ہیں، خلع، جس کی تفصیلات گزرچکی ہیں، ایلاء کی وجہ سے علحید گی جس کی تفصیلات آرہی ہیں، دو حکم کی طرف سے علحید گی جس کو تقسیم اور نافرمانی کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔

طلاق معہود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کسی سبب کے بغیر طلاق دے۔

فسخ کی مندرجہ ذیل سترہ قسمیں ہیں:

۱۔عورت کی طرف سے فسخ کیا جائے جس کا شوہر اس کا مہر اور نفقہ دینے سے عاجز ہو، تنگ دست کو تین دنوں کی مہلت دی جائے گی، تاکہ اس کی تنگ دستی کی حقیقت سامنے آئے۔ (شیخ الاسلام زکریاؒ نے ''اُسنی المطالب'' ۳/۴۳۸ میں سعید بن مسیّب کی صحیح روایت سے استدلال کیا ہے جس کو بیہقی نے بیان کیا ہے ۷/۴۶۹: سعید بن مسیّب سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو اپنی بیوی پر خرچ کرنے کی روزی نہ پاتا ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: ان دونوں کو علحیدہ کیا جائے گا۔ ان سے دریافت کیا گیا: کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، یہ سنت ہے)

۲۔عورت کی طرف سے فسخ کیا جائے جس کا شوہر اس کا مہر دینے سے عاجز ہو، شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے ہو، اگر اس کے ساتھ جماع کیا گیا ہو تو بیوی فسخ نہیں کرسکتی ہے، کیوں کہ وہ اپنے شوہر کی عصمت میں آگئی ہے، البتہ شوہر بیوی کے نفقہ سے عاجز آجائے تو عورت کو فسخ کرنے کا حق ہے۔

۳۔لعان کی وجہ سے علحید گی: لعان کی وجہ سے علحید گی کو فسخ مانا جاتا ہے، طلاق نہیں۔ (یہ امام احمد و شافعی کا قول ہے اور امام مالک کی ایک روایت ہے، یہی قول احناف میں سے امام ابو یوسف اور زفر رحمۃ اللہ علیہما کا ہے، اس سے ہمیشہ کے لیے بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ ابو حنیفہ اور محمد بن حسن کا قول ہے: یہ طلاق بائن ہے۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک بیوی ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہوتی ہے۔ اگر شوہر خود کو جھٹلائے تو وہ اس کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ ''الحاوی الکبیر'' ۱۱/۵۴) اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: اگر میں تمھاری سوکن کو طلاق دوں تو تم کو بھی طلاق۔ پھر شوہر اور اس کی سوکن کے درمیان لعان ہو جائے تو اس کو طلاق نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ جو شوہر اور اس کی سوکن کے درمیان ہوا ہے وہ فسخ ہے، طلاق نہیں۔

۴۔آزاد ہونے والی عورت کی علحید گی؛ یہ وہ باندی ہے جو آزاد ہو گئی ہو تو وہ اپنے شوہر کا نکاح فسخ کرسکتی ہے اگر شوہر غلام ہو۔

۵۔عیب کی وجہ سے علحید گی: مثلاً شوہر یا بیوی پاگل ہو جائے تو اس جنون کی وجہ سے عقدِ نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔دھوکہ کی وجہ سے علحید گی: یعنی میاں اور بیوی میں سے کسی ایک کو دھوکہ ہو جائے مثلاً شوہر سے کہا جائے: اس کی بیوی آزاد ہے۔ پھر معلوم ہو جائے کہ وہ باندی ہے تو شوہر کو نکاح فسخ کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح اوصاف میں اختلافات کی وجہ سے جدائی اور علحید گی کا بھی مسئلہ ہے جس کی تفصیلات گزرچکی ہیں۔

۷۔وطی شبہ کی وجہ سے علحید گی: شوہر اور بیوی کے درمیان اس وقت علحید گی ہوتی ہے جب وہ بیوی کی ماں کے ساتھ غلطی سے جماع کرے، اس صورت میں اس پر بیوی حرام ہو جاتی ہے اور اس کی ماں بھی حرام ہو جاتی ہے۔

۸۔آزاد میاں بیوی میں سے کوئی ایک مسلمانوں کی قید میں آئے: مثلاً میاں بیوی کافر اور آزاد ہوں پھر شوہر جہاد میں قید ہو جائے اور وہ غلام بن جائے تو اس کی آزاد بیوی کے ساتھ اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں غلام بن جائیں تو ان کا نکاح فسخ نہیں ہوتا ہے۔

۹۔میاں بیوی میں سے کوئی ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے علحید گی، اگر جماع سے پہلے میاں بیوی میں سے کوئی مسلمان ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان فوراً علحید گی کی جائے گی۔ اگر جماع کے بعد اسلام لے آئے تو بیوی کی عدت گزرنے سے پہلے علحید گی نہیں ہوگی، اگر عدت گزر جائے اور دونوں مسلمان نہ ہوں تو ان کا نکاح فسخ ہو جائے گا۔

۱۰۔ارتداد کی وجہ سے علحید گی: اگر دونوں میں سے ایک اسلام سے مرتد ہو جائے اور

دوسرا مسلمان باقی رہے یا دونوں مرتد ہو جائیں تو ان کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ (أسنی المطالب ۳/۳۵۵؛ ''الحاوی الکبیر'' ۹/۲۹۵)

۱۱۔ دو بہنوں سے شادی کی ہو اور وہ اسلام لے آئے، اس کی وجہ سے ہونے والی علیحدگی؛ مثلاً اسلام لانے سے پہلے کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ آپس میں بہنیں ہوں، اس کے بعد یہ شخص اسلام لے آئے تو اس صورت میں اس پر ضروری ہو جاتا ہے کہ دو میں سے ایک بہن کا انتخاب کرے، پھر دوسری کا نکاح فسخ ہو جائے گا، کیوں کہ اسلام میں مسلمان کے لیے اپنے نکاح میں دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھنا جائز نہیں ہے۔

۱۲۔ چار سے زائد بیویوں کی موجودگی میں اسلام لانے کی وجہ سے علیحدگی؛ جو اسلام لے آئے اور اس کے پاس چار سے زائد بیویاں ہوں تو وہ اپنے نکاح میں ان میں سے چار کو باقی رکھے گا اور باقی بیویوں کا نکاح فسخ ہو جائے گا۔ (اس کی دلیل عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی اسلام لے آئے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ ان سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''ان میں سے چار کا انتخاب کرو''۔ مسند احمد ۴۶۰۹۔ ترمذی: کتاب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یسلم وعندہ عشر نسوۃ ۱۱۲۸، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۱۵۷)

۱۳۔ دو باندیاں بیویاں ہوں اور اس کے اسلام لانے کی وجہ سے ایک سے علیحدگی کی جائے؛ مثلاً کسی آزاد شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ باندیاں ہوں پھر وہ اسلام لے آئے تو اس پر اسلام لانے کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کا انتخاب کرے، اس صورت میں دوسری بیوی سے اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے، کیوں کہ اسلام میں کسی عذر کے بغیر آزاد شخص کو اپنے نکاح میں ایک ساتھ دو باندیاں رکھنا جائز نہیں ہے۔

۱۴۔ کفو نہ ہونے کی وجہ سے علیحدگی: مثلاً کوئی عورت اپنی شادی میں اپنے ولی کو وکیل بنائے۔ پھر نکاح کے بعد معلوم ہو جائے کہ اس کا شوہر کفو نہیں ہے تو اس صورت میں اس کو اپنا نکاح فسخ کرنے کا حق ہے۔ (''الوسیط'' غزالی ۵/۸۸)

۱۵۔ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونے کی وجہ سے علیحدگی: مثلاً میاں بیوی

یہودی ہیں، پھر ان دونوں میں سے ایک عیسائی بن جائے تو دوسرے کو شادی فسخ کرنے کا حق ہے، کیوں کہ جو اپنے دین کو چھوڑے تو اس کی طرف سے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کا مالک بننے کی وجہ سے علیحدگی: مثلاً شوہر غلام ہو اور بیوی باندی، جب ان دونوں میں سے کوئی دوسرے کو خرید لے تو ان کا عقدِ نکاح فسخ ہو جاتا ہے کیوں کہ نکاح اور ملکیت ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے ہیں۔

۱۷۔ رضاعت کی وجہ سے علیحدگی؛ اس کے لیے بعض شرطیں ہیں جس کی تفصیلات رضاعت کے باب میں آ رہی ہیں، مثلاً ایک بیوی دوسری بیوی کو دودھ پلائے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک بیوی بالغ اور بڑی عمر والی ہو اور دوسری بیوی بچی ہو، اس صورت میں دونوں بیویوں کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے، پہلی بیوی اس لیے کہ وہ دوسری بیوی کی ماں بن جاتی ہے اور دوسری اس لیے کہ وہ دودھ پینے کی وجہ سے پہلی کی بیٹی بن جاتی ہے، اس طرح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ دوسری بیوی کی عمر دو سال سے کم ہو اور وہ پانچ مرتبہ سیر ہو کر دودھ پیئے، جس کی تفصیلات رضاعت کے باب میں آ رہی ہیں۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔ صریح طلاق وہ ہے جو طلاق کے لفظ سے دی جائے، اس میں نیت کی ضرورت نہیں ہے، اور کنایہ وہ ہے جس میں طلاق ہونے اور نہ ہونے کا احتمال ہو، اس میں نیت کی ضرورت ہے تا کہ طلاق ہو جائے جس کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

صریح طلاق کے پانچ الفاظ ہیں: طلاق، فراق، سراح، خلع اور شوہر سے یہ کہنے والے کے جواب میں ''ہاں'' کہنا: کیا تم نے اپنی بیوی کو طلاق دیا؟ اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے: میں نے تم کو طلاق دیا۔ میں نے تم کو اپنی زوجیت سے الگ کیا۔ یا میں نے تم کو ایک ہزار کے بدلے خلع دیا تو طلاق ہو جائے گی۔ (اس سے صرف اکراہ یعنی مجبور کیے جانے کی شکل مستثنی ہے، کیوں کہ اس صورت میں صریح لفظ طلاق بھی کنایہ ہے۔ ابن ملقن نے ''عجالۃ المحتاج'' میں یہ بات لکھی ہے ۳/۱۳۴۶)

شوہر سے یہ کہنے والے کا سوال: ''کیا تم نے اپنی بیوی کو طلا

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی آمنہ بنت غفار کو حالتِ حیض میں طلاق دی۔ عمرؓ نے یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اس کو حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کر لے اور اس کو اپنی زوجیت میں باقی رکھے یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے صاف ہو جائے پھر دوبارہ اس کو حیض آئے پھر وہ دوبارہ صاف ہو جائے، اس کے بعد اگر وہ چاہے تو اس کو اپنے پاس رکھ لے، اگر چاہے تو اس طہر میں جماع کیے بغیر طلاق دے تا کہ وہ اپنی عدت فوراً شروع کر سکے، یہی وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالی نے شوہروں کو حکم دیا ہے کہ اپنی بیویوں کو طلاق ایسے ہی دیں''۔ (صحیح بخاری: کتاب الطلاق، باب قول اللہ تعالی: یا أیہا النبی ان طلقتم النساء ۵۲۵۱، مسلم: کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض بغیر رضاہا ۱۴۷۱)

طلاقِ بدعی

مثلاً کوئی اپنی مدخولہ (یعنی جس کے ساتھ جماع کیا ہے) کو حیض کی حالت میں طلاق دے۔
یا اپنی بیوی کو ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس کے ساتھ جماع کیا ہو اور حمل ظاہر نہ ہوا ہو۔

بدعی طلاق حرام ہے، کیوں کہ یہ سابقہ آیت میں بیان کردہ حکم کے مخالف ہے، اور اس طرح طلاق دینے سے عدت کی مدت طویل ہو جاتی ہے، اگر اس کے بعد ثابت ہو جائے کہ بیوی حاملہ ہے تو اس کے شوہر کو افسوس اور ندامت ہو گی، کیوں کہ اس نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دی ہے؛ کیوں کہ شوہر اپنی بیوی کو اس صورت میں طلاق نہیں دیتا ہے جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بیوی حاملہ ہے، کیوں کہ اس کو طلاق دینے کی صورت میں خود اس کے بچے کو نقصان ہوتا ہے۔

سنت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے اس صورت میں رجوع کرے جب وہ پہلی یا دوسری طلاق ہو اور اس کو اپنی عصمت وزوجیت میں واپس لے آئے۔ (کیا اس مدت میں اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کرنے کو چھوڑنا مکروہ ہے؟ اس میں بحث ہے، نووی نے ''الروضۃ ۴/۷'' میں اس سے رجوع کرنے کے مستحب ہونے کو صحیح کیا ہے۔ شیخ الاسلام زکریا نے ''أسنی المطالب'' ۳/۲۶۵ میں کہا ہے کہ رجوع کرنا مستحب ہونے کے باوجود ہم یہ نہیں کہتے ہیں: اس کو چھوڑنا مکروہ ہے)

نہ سنی اور نہ بدعی

وہ طلاق جو نہ سنی ہے اور نہ بدعی؛ آٹھ ہیں: (دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۶/۱۳، ''اللباب'' محاملی ۱/۳۱۷)

۱۔ جماع سے پہلے بیوی کو طلاق دے، اس صورت میں عورت پر عدت نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے بیوی کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ ایسی چھوٹی بچی کو طلاق دینا جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو اور شوہر نے اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو، کیوں کہ وہ جماع کو برداشت نہیں کر پاتی ہے، اس وجہ سے اس پر عدت نہیں ہے، اگر وہ اپنے شوہر کی منی اپنی اگلی شرمگاہ میں داخل کر دے تو اس پر عدت گزارنا لازم ہے اور اس کی عدت تین مہینے ہیں۔

۳۔ آیسہ (یعنی جس کو حیض آنا بند ہوا ہو) کو طلاق دینا، یہ بوڑھی عورت ہے اور اس کی عدت تین مہینے ہیں۔

۴۔ حاملہ کو طلاق دینا اور اس کی عدت وضع حمل پر ختم ہو جاتی ہے، چاہے طلاق کے بعد ایک لحظہ ہی میں بچہ پیدا ہو جائے۔ (اس کی دلیل سبیعہ اسلمیہ کی حدیث ہے جو صحیح بخاری میں ہے: کتاب الطلاق، باب ''وأولات الأحمال أجلہن أن یضعن حملہن'' ۵۳۱۹، مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہ اپنے شوہر کی وفات کے چند دنوں بعد ہی نفاس والی ہو گئی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور شادی کرنے کی اجازت مانگی، آپ نے اس کو اجازت دی تو اس نے شادی کر لی) اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' (طلاق ۴) اور حمل والیاں؛ ان کی عدت یہ ہے کہ ان کو بچہ ہو جائے)

۵۔ ایلاء کی وجہ سے طلاق؛ اس شوہر کی وجہ سے طلاق جو قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے چار مہینوں سے زیادہ مدت تک جماع نہیں کرے گا، اگر چار مہینے گزر جائیں اور اس کے ساتھ جماع بھی نہ کرے اور اس کو طلاق بھی نہ دے تو قاضی اس عورت کو ایک طلاق دے گا، اور ایلاء کی وجہ سے طلاق بیوی کی طلب پر ہو گی۔ (ایلاء جاہلیت کی طلاق ہے، اسلام آنے کے

بعد اس کا حکم تبدیل ہوا۔ دیکھا جائے ''التہذیب'' (۱۲۸/۶)

۶۔ دو حَکَم کی طرف سے طلاق، یہ وہ طلاق ہے جس کو شوہر اور بیوی کے حَکَم دیتے ہیں جب ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اصلاح کی کوئی بھی گنجائش نہیں ہے، جب کہ شوہر ہی حَکَم کو بیوی کو طلاق دینے کا اختیار دے گا، البتہ اس کو دو حَکَم کا طلاق کہا جاتا ہے، کیوں کہ حَکَم دوسرے حَکَم سے مشورہ اور شوہر کی اجازت اور بیوی کی رضامندی سے طلاق دیتا ہے۔

۷۔ خلع مانگنے والی کو دی جانے والی طلاق؛ خلع یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے معاوضہ کے مقابلے میں طلاق طلب کرتی ہے، یہ معاوضہ وہ شوہر کو دیتی ہے جس سے شوہر کو چھوڑنے کی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔

۸۔ متحیرہ کو طلاق دینا یعنی ہمیشہ خون والی عورت کو طلاق دینا یعنی مستحاضہ، اس کو متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ایامِ حیض کو نہیں جانتی ہے اور نہ استحاضہ کے دنوں کو، اسی وجہ سے جب اس کو طلاق دی جاتی ہے تو اس کو معلوم ہی نہیں رہتا ہے کہ وہ یقینی طور پر حیض میں ہے یا حالتِ طہر میں، اسی وجہ سے اس کی طلاق نہ سنی ہے اور نہ بدعی۔

طلاق معلق وغیر معلق

یہاں تک طلاق کی تین قسموں؛ سنی، بدعی اور جو نہ بدعی ہے اور نہ سنی کے بارے میں گفتگو ہوئی، اب یہاں طلاق کی دوسری تقسیم کے بارے میں بیان کیا جارہا ہے، طلاق کی دو قسمیں ہیں: غیر معلق اور معلق۔ غیر معلق طلاق وہ ہے جو فوراً ہوتی ہے، اور معلق وہ ہے جس کا واقع ہونا معلق کی ہوئی چیز کے وجود میں آنے پر موقوف ہے۔

جب شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم کو طلاق دی۔ تو طلاق اسی وقت ہوجاتی ہے۔ اگر اپنی بیوی سے کہے: اگر تم گھر گئی تو تم کو طلاق دی۔ تو یہ طلاق معلق ہوجائے گی۔ صرف اتنا کہنے سے طلاق نہیں ہوگی، بلکہ اس وقت ہوگی جب بیوی اس گھر میں داخل ہوجائے جو شوہر کا مقصود ہو۔

جو طلاق کو معلق کرنے پر قدرت رکھتا ہو تو وہ عام طور پر اس کو مکمل کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

عام طور پر نہ ہونے کی مثال حائضہ عورت کو طلاق دینا ہے، کیوں کہ اس کا شوہر سنی طریقہ پر اس کی طلاق کو معلق کرسکتا ہے اور اس طرح وہ مکمل بھی نہیں کرسکتا ہے، مثلاً اپنی بیوی سے کہے: جب تم اپنے حیض سے پاک ہوجاؤ تو تم کو طلاق۔ وہ مکمل سنی طلاق حالت حیض میں نہیں دے سکتا ہے، کیوں کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور اس لیے کہ حائضہ کو طلاق دینا طلاق بدعی ہے اور یہ حرام ہے، اس صورت کے برعکس شوہر اپنی بیوی کو سنی طلاق دے سکتا ہے جو حائضہ ہوئی ہو اور صاف ہوئی ہو اور نہ اس حیض میں اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو اور نہ اس طہر میں، اسی طرح وہ طلاقِ بدعی کو معلق کرسکتا ہے، مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: جب تمھیں حیض آئے تو تم کو طلاق ہے۔ البتہ شوہر ایسے حالتِ طہر میں مکمل بدعی طلاق نہیں دے سکتا ہے جس طہر میں جماع نہ کیا ہو۔

جو غلام ہو تو وہ اپنی بیوی کی طلاق کو معلق کرسکتا ہے مثلاً اپنی بیوی سے کہے: جب میں آزاد ہوجاؤں تو تم کو تین طلاق ہے۔ کیوں کہ غلام کو صرف دو طلاق کا ہی حق ہے، جو تین طلاق واقع ہونے والی نہیں ہے وہ دے سکتا ہے۔ ہم نے یہاں جو بیان کیا ہے وہ شریعت کا حکم ہے، اگر مقصد اور ارادہ شریعت کے احکام کی رعایت کیے بغیر صرف طلاق دینا ہے تو شوہر کسی بھی طرح عورت کو طلاق دے سکتا ہے اگر وہ گناہ سے بچتا نہ ہو۔

اگر طلاق کو کسی صفت کے ساتھ معلق کردے تو اس صفت کے وجود میں آنے سے طلاق ہوجاتی ہے مثلاً میاں بیوی دونوں احمق ہوں اور دونوں آپس میں گفتگو کررہے ہوں، شوہر کہے: زید بیل کی طرح ہے، کچھ بھی نہیں سمجھتا، اس پر بیوی کہے: تم یہ بات کیسے کہہ رہے رہو، وہ تو بڑا ماہر درزی ہے! اس کے جواب میں شوہر کہے: ''اگر زید درزی ہے تو تم کو تین طلاق ہے''۔ جب معلوم ہوجائے کہ زید درزی ہے تو اس کی بیوی کو تین طلاق ہوجاتی ہے۔

چار حالات میں صفت کے ساتھ معلق کی ہوئی طلاق نہیں ہوتی ہے:

۱۔ تعلیق اور صفت یا ان دونوں کا تعلق نکاح کے علاوہ دوسرے اور سے ہو۔ مثلاً کوئی اجنبیہ سے کہے: اگر تم گھر کے اندر گئی تو تجھ کو طلاق ہے۔ یعنی زید اس عورت سے کہے جو اس کی بیوی نہ ہو: اگر تم گھر میں چلی گئی تو تم کو طلاق ہے۔ اگر وہ گھر میں چلی جائے تو اس کی اور زید کی شادی نہ ہونے

کی وجہ سے طلاق نہیں ہوتی ہے۔ یا زید اپنی بیوی سے کہے: اگر تم عمرو کے گھر چلی گئی تو تم کو طلاق ہے۔ اس کے بعد زید اپنی بیوی کو خلع دے۔ خلع کے بعد بیوی عمرو کے گھر چلی جائے تو طلاق نہیں ہوگی۔ کیوں کہ عمرو کے گھر جانے سے اس کو طلاق نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ طلاق اس بیوی کو ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی زوجیت میں ہو۔ (اس کی تفصیلات ماوردی کی کتاب ''الحاوی الکبیر'' میں ہے)

یا ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے نکاح میں ہو: یعنی جس چیز پر طلاق معلق کی گئی ہو وہ نئے نکاح میں ہو جائے، کیوں کہ صفت تعلیق سے پہلے نہیں ہوسکتی ہے۔ یعنی تعلیق ایک نکاح میں ہو اور صفت دوسرے نکاح میں ہو مثلاً شوہر اپنی بیوی سے کہے: اگر تم گھر چلی گئی تو تم کو طلاق ہے۔ پھر وہ اس کے بعد اپنی بیوی کو خلع دے۔ خلع کے بعد وہ گھر چلی جائے۔ پھر یہی شخص اپنی پہلے والی بیوی سے دوبارہ شادی کرلے۔ اور نئے نکاح کے بعد اس کی بیوی مذکورہ گھر چلی جائے تو طلاق نہیں ہوگی۔ کیوں کہ جس نکاح میں نکاح کو معلق کیا گیا ہے تو یہ نکاح خلع کی وجہ سے ختم ہوگیا ہے اور گھر میں چلا جانا دوسرے نکاح میں ہوا ہے۔

اگر کسی صفت کے ساتھ معلق طلاق ہو تو اس کے وجود میں آئے بغیر یہ طلاق نہیں ہوتی ہے۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے کہے: اگر تم گھر میں چلی گئی تو تم کو طلاق ہے۔ اگر وہ گھر میں چلی گئی تو طلاق ہوجاتی ہے۔ اگر وہ نہیں گئی تو طلاق نہیں ہوتی ہے۔

اس سے چند شکلیں مستثنی ہیں:

اپنی بیوی کی طلاق کو بیوی کے رویتِ ہلال پر معلق کرے۔ پھر چاند کوئی دوسرا دیکھے یا کوئی بھی نہ دیکھے، لیکن مہینے کی تیس دن مکمل ہوجائیں۔ مثلاً کوئی اپنی بیوی سے رمضان کے مہینے میں کہے: جب تم شوال کا چاند دیکھ لو تو تم کو طلاق ہے۔ اس کی بیوی شوال کا چاند نہ دیکھے، کوئی دوسرا چاند دیکھ لے۔ یا کوئی بھی نہ دیکھے، لیکن رمضان کے تیس دن مکمل ہوجائیں، اس طرح یقینی طور پر شوال کا مہینہ شروع ہوجاتا ہے، اس سے اس بیوی کو طلاق ہوجاتی ہے۔ (یہ امام غزالی کی عبارت کا خلاصہ ہے ''الوسیط'' ۴۵۴/۵)

یہ بھی شرط ہے کہ حاکم کے پاس چاند دیکھنا ثابت ہوجائے۔ اگر حاکم کے پاس ثابت نہ

ہو اور بچہ کہے: اس نے چاند دیکھا ہے۔ یا چاند دیکھنے کے بارے میں کوئی عورت کہے۔ یا فاسق کہے: اس نے چاند دیکھا ہے۔ اور شوہر ان کی تصدیق کرے تو طلاق ہوجاتی ہے۔ کیوں کی عرف یہ ہے کہ رویتِ ہلال اس کو دیکھنے کا علم ہونے سے ثابت ہوجاتا ہے۔

یا کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: تم کو کل طلاق ہے یا گذشتہ زمانہ میں طلاق ہے۔ ''کل'' کا لفظ یا گذشتہ زمانہ کا جملہ ''تم کو طلاق ہے'' کے ساتھ متفق نہیں ہے اور اب جو مراد لی جارہی ہے اس کے مطابق نہیں ہے، اس کے باوجود طلاق واقع ہوجائے گی۔ اور کل کی طرف طلاق کی نسبت لغو ہوجائے گی کیوں کہ یہ ناممکن ہے۔

یا اپنی بیوی سے کہے: فلاں کی رضامندی کے لیے تم کو طلاق ہے۔ تو اس صورت میں فوراً طلاق ہوجاتی ہے۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے کہے: فلاں کی رضامندی ہونے پر تم کو طلاق ہے۔ تو یہ معلق طلاق ہوجائے گی۔ اس شخص سے پوچھا جائے گا، اگر وہ اس پر راضی ہو تو طلاق ہوجائے گی، اگر راضی نہ ہو تو طلاق نہیں ہوگی۔

یا بیوی سے کہے: تم کو حسن اور قبیح طلاق ہے۔ باوجود یہ کہ قباحت اور حسن ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے، طلاق حسن وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو اور قبیح طلاق وہ ہے جو بدعی اور حرام ہو، البتہ یہ طلاق شوہر کی طرف سے یہ کہنے سے ہی ہوجاتی ہے۔ حسن اور قبیح کے الفاظ لغو ہونے کی وجہ سے ساقط ہوجائیں گے۔

یا شوہر اپنی اس بیوی سے کہے جس کو نہ سنت طلاق ہوتی ہو اور نہ بدعی: تم کو سنی طلاق یا بدعی طلاق ہے۔ مثلاً اپنی بوڑھی بیوی یا ابھی حیض شروع نہ ہونے والی بیوی سے کہے، ان دونوں کی طلاق نہ سنی ہے اور نہ بدعی: تم کو سنی طلاق یا بدعی طلاق ہے۔ اس صورت میں صرف ''تم کو طلاق ہے'' کہنے سے ہی طلاق ہوجاتی ہے۔ اور اس کے علاوہ جو سنی یا بدعی کے الفاظ ہیں وہ لغو ہیں، ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج ۵۲/۵)

طلاق کی یہ چھ شکلیں ایسی ہیں جن میں استثناء نہیں ہے، کیوں کہ شوہر کی طرف سے بیوی کے چاند دیکھنے پر طلاق کو معلق کرنا دراصل آئندہ قمری مہینہ کے شروع ہونے پر طلاق کا وقت متعین

کرنا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب چاند دیکھنے یا مہینہ تیس دن ہونے پر مکمل ہو جائے تو اس کی طلاق ہو جاتی ہے۔اور یہاں سابقہ مثالوں میں تعلیق نہیں ہے۔

اگر شوہر اپنی نابالغ بیوی سے کہے:تم کو سنت وقت طلاق یا بدعی وقت میں طلاق ہے۔اگر اس کا ارادہ طلاق کو معلق کرنا ہے۔تو اس کا ارادہ قابل قبول ہوگا۔اس صورت میں اس وقت طلاق ہوگی جب وہ حائضہ ہو جائے اور حیض سے پاک ہو جائے۔اس سے سنی طلاق کا وقت اور بدعی طلاق کا وقت متعین ہو جاتا ہے۔اگر اس کا ارادہ طلاق کو معلق کرنا نہ ہو تو فوراً طلاق ہو جاتی ہے۔

محال اور ناممکن چیز پر طلاق کو معلق کرنے سے طلاق نہیں ہوتی ہے، چاہے یہ عقلی طور پر ناممکن و محال ہو یا شرعی طور پر، عقلی طور پر محال کی مثال یہ ہے کہ شوہر اپنی بیویوں سے کہے: اگر تم دونوں کو ایک ساتھ ایک بچہ ہو۔یا تم دونوں کو ایک ساتھ ایک حیض آئے تو تم دونوں کو طلاق ہے۔کیوں کہ دو عورتیں ایک ہی بچے کی پیدائش یا ایک ہی حیض میں شریک ہوں؛ یہ عقلی طور پر ناممکن ہے،اس لیے دونوں کی طلاق نہیں ہوتی ہے۔(روضۃ الطالبین ۷/۱۴۹)

شرعی طور پر محال یہ ہے کہ مثلاً شوہر اپنی بیوی سے کہے: جب رمضان کے روزے منسوخ ہو جائیں تو تم کو طلاق ہے۔اس لیے کہ رمضان کے روزے منسوخ نہیں ہوتے ہیں،اس لیے طلاق بھی نہیں ہوتی ہے۔اسی طرح اگر عرف کے اعتبار سے محال چیز پر طلاق کو معلق کیا جائے تو بھی طلاق نہیں ہوتی ہے۔طلاق کو اپنی بیوی کے آسمان پر اڑنے کے ساتھ معلق کردے،عرف یہ ہے کہ عورت آسمان پر نہیں چڑھ سکتی ہے۔کیوں کہ وہ پرندہ نہیں ہے کہ اڑنے لگے۔

اگر شوہر اپنی باندی بیوی کو تین طلاق دے، یا اس پر لعان کرے، یا اس سے ظہار کرے۔پھر اس کا مالک بن جائے تو اس سے اس وقت تک جماع کرنا اس شخص کے لیے حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے شخص سے شادی نہ کرلے،طلاق نہ ہو جائے اور عدت نہ گزر جائے،اس کے بعد وہ اس کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔

البتہ ظہار کی حالت میں شوہر اپنی بیوی سے کہے:تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح

ہو۔اور اس کو فوراً طلاق نہ دے۔پھر اس باندی کو خرید لے تو وہ کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع نہیں کرسکتا ہے۔اگر اس کو ظہار کا لفظ بولنے کے فوراً بعد ہی خرید لے تو ظہار میں رجوع نہیں ہوتا ہے، وہ اس باندی سے جماع نہیں کرسکتا ہے۔

البتہ لعان کی صورت میں اگر وہ لعان کے فوراً بعد اپنی باندی بیوی کو خرید لے تو وہ اس پر لعان کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ جماع ہی نہیں کرسکتا ہے۔

اگر شوہر بیوی کو طلاق دے اور تین طلاق مکمل نہ کرلے، پھر وہ عورت دوسرے سے شادی کرلے، پھر اس شوہر کے پاس آئے تو وہ اپنی باقی طلاق کے ساتھ واپس ہوتی ہے؛ اگر کوئی اپنی بیوی کو تین سے کم طلاق دے اور اس کی عدت گزر جائے، پھر وہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرلے، دوسرا شوہر اس کو طلاق دے اور اس سے عدت گزر جائے۔پھر پہلا شوہر اس کے ساتھ شادی کرلے۔تو اس صورت میں عورت اپنے پہلے شوہر کے پاس اپنی تین شرعی طلاق میں سے باقی بچی ہوئی طلاق کے ساتھ واپس آئے گی۔یعنی اگر اس نے ایک طلاق دی ہے تو عورت کی دو طلاق باقی رہتی ہے۔اگر اس کو دو طلاق دی گئی ہے تو صرف ایک طلاق باقی رہتی ہے۔البتہ احناف کے نزدیک تین طلاق کا ہی حق باقی رہتا ہے۔("بدائع الصنائع" ۳/۱۲۷۔محمد بن حسن اور زفر بن ہذیل کا خیال ہے کہ وہ باقی طلاقوں کے ساتھ پہلے شوہر سے شادی کرے گی)

اگر آدھا طلاق دے مثلاً اپنی بیوی سے کہے:تم کو آدھا طلاق ہے تو مکمل طلاق ہو جاتی ہے۔کیوں کہ طلاق کے اجزاء نہیں ہوتے ہیں۔("اسنی المطالب" ۳/۲۹۰۔ماوردی "الحاوی الکبیر" ۱۰/۲۴۴۔داود ظاہری سے نقل کیا ہے کہ عورت کو مکمل طلاق ہی ہوتی ہے۔اگر طلاق کا بعض حصہ دے تو طلاق نہیں ہوتی ہے)صرف یہ شکل اس مسئلہ سے مستثنی ہے کہ شوہر بیوی سے کہے:تم کو طلاق کے دو نصف حصے ہیں۔اس صورت میں صرف ایک طلاق ہوتی ہے۔اگر ہر نصف حصے سے ایک طلاق کا ارادہ کرے تو دو طلاق ہو جاتی ہے۔("الوسیط" غزالی ۵/۴۱۱،نووی "الروضۃ" ۸/۸۶،شربینی الخطیب "مغنی المحتاج" ۵/۳۵)اگر بیوی سے کہے:تم کو مٹی کی تعداد کے مطابق طلاق ہے۔(کیوں کہ مٹی اسم جنس ہے،اس لیے یہ متعدد نہیں ہوتی ہے "مغنی المحتاج" ۱/۹۶)تو ایک طلاق ہو جاتی ہے۔اگر وہ اپنی بیوی سے کہے:تم کو ریت کی تعداد یا کنکریوں کی تعداد کے برابر طلاق ہے تو تین طلاق ہو جاتی ہے۔

رجوع کرنے کے مسائل

''رَجْعَة'' کے لغوی معنی ایک مرتبہ رجوع کرنے کے ہیں۔ شرعی معنی یہ ہے کہ غیر بائن طلاق میں عدت کے دوران بیوی کو اپنے نکاح میں واپس لینا۔

رجوع کی دلیل قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور اجماع امت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ'' (بقرہ ۲۲۸) اور اس (مدت) میں ان کے شوہر ان کو واپس (اپنے نکاح میں) لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''اس کو حکم دو کہ وہ بیوی سے رجوع کر لے''۔ یعنی عبداللہ بن عمر کو حکم دو۔ انہوں نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دی تھی۔ یہ طلاق بدعی ہے جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیوی سے رجوع کرنے کا اس وقت حق ہے جب طلاق رجعی ہو اور وہ عدت میں موجود ہو۔ (دیکھا جائے ''الاجماع'' ابن منذر ص ۴۳۔ ''مراتب الجماع'' ابن حزم ص ۷۵)

رجوع کے چار ارکان ہیں:

۱۔ طلاق رجعی

۲۔ شوہر

۳۔ بیوی

۴۔ صیغہ؛ مثلاً شوہر کہے: میں نے اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں واپس لے لیا۔

ہم نے یہ بات کہی ہے کہ رجوع طلاقِ رجعی ہی میں صحیح ہے، تا کہ یہ بات معلوم ہو کہ فسخ یا طلاق بائن یعنی تین طلاق میں یا معاوضہ لے کر طلاق یعنی خلع یا موت میں رجوع کا حق نہیں ہے۔

شوہر کے لیے شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل، مختار یعنی مجبور کیا ہوا نہ ہو، شرابی، بیوقوف اور غلام کی طرف سے رجوع کرنا صحیح ہے، اگرچہ کہ غلام کو شادی کرنے کے لیے اپنے آقا سے اجازت لینا ضروری ہے، البتہ مرتد، مجبور کیے ہوئے، بچے اور پاگل کا رجوع کرنا صحیح نہیں ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۹۰/۵)

بیوی کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ جماع کیا ہو، اور اپنے شوہر کے لیے حلال ہو یعنی وہ مرتد نہ ہو، اور اس کو طلاق بائن نہ دیا گیا ہو یعنی خلع یا آزاد کو تین طلاق نہ دی گئی ہو، یا غلام نے خلع نہ دیا ہو یا دو طلاق نہ دیا ہو اور وہ ابھی تک عدت میں ہو۔

اور رجوع صحیح صیغہ سے ہو مثلاً شوہر کہے: میں نے تم کو اپنے پاس واپس لیا۔ یا کہے: میں نے تم کو اپنے نکاح میں واپس لے لیا۔

صریح لفظ سے رجوع کرنا صحیح ہے: مثلاً کہے: میں نے تم سے رجوع کیا۔ میں نے تم کو اپنے نکاح میں واپس لیا۔

کنایہ الفاظ سے بھی رجوع کرنا صحیح ہے البتہ اس میں نیت رہنا ضروری ہے: مثلاً میں نے تمہاری رسی کھول دی۔ میں نے تمھاری حرمت اٹھا دی۔ میں نے تم سے شادی کر لی۔ کسی بھی عام لفظ سے رجوع کرنا صحیح ہے جس سے واضح طور پر عورت حلال ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی زبان میں رجوع کا ترجمہ کرنے سے رجوع صحیح ہو جاتا ہے، جس کو شوہر اور بیوی سمجھتے ہوں۔ اسی طرح کنایہ کے کسی بھی زبان کے لفظ سے بھی نیت پائے جائے کی صورت میں صحیح ہے مثلاً طلاق کا لفظ عربی اور عجمی زبانوں میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

رجوع اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ رجوع ولی اور گواہوں کے بغیر صحیح ہے۔ جب کے شادی ولی اور گواہوں کے بغیر صحیح نہیں ہے۔ (''الوسیط'' ۴۶۰/۵۔ ''روضۃ الطالبین'' حاشیۃ البلقینی ۲۰۶/۷، بلقینی نے رجوع پر گواہ بنانے کو مستحب کہا ہے)

نکاح اور انکاح اور تزوج اور شادی کے لفظ کے بغیر رجوع صحیح ہے، جب کہ شادی میں ان دونوں کی رضامندی ضروری ہے، اس کے بغیر صحیح نہیں۔

میاں بیوی دونوں احرام میں ہوں یا ان میں سے کوئی ایک احرام میں ہوتو رجوع صحیح ہوجاتا ہے، جب کہ حج یا عمرہ میں عقدِ نکاح جائز نہیں ہے۔ (اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بغوی نے کہا ہے: یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ بیوی سے رجوع کرے تو مہر واجب نہیں ہوتا ہے جیسا کہ ''التہذیب'' ۶/۱۱۵ میں ہے، ماوردی نے ''الحاوی الکبیر'' ۹/۲۹۸، غزالی نے ''الوسیط'' ۵/۴۶۵، اور نووی نے ''روضۃ الطالبین'' ۷/۲۱۲ میں کہا ہے کہ مہر واجب ہوجاتا ہے) جب کہ شادی میں مہر واجب ہوجاتا ہے اگر عقد نکاح میں مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے، یا تو شوہر اور بیوی دونوں اس کو متعین کرتے ہیں یا شوہر بیوی سے مہر متعین کیے بغیر جماع کرتا ہے تو ان صورتوں میں مہر مثل واجب ہوجاتا ہے، یہ اس اعتبار سے ہے کہ نکاح ازدواجی زندگی کی بنیاد اور ابتدا ہے، جب کہ رجوع کرنا اس کو جاری رکھنا ہے، قرآن کریم نے رجوع پر گواہ بنانے کا جو حکم دیا ہے اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ رجوع پر گواہ بنانا مستحب ہے، واجب نہیں۔

شوہر کے خود سے نکاح کرنے کا اہل ہونے اور مرتد نہ ہونے کے ساتھ رجوع کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ رجوع عدت گزرنے سے پہلے ہو، شوہر کا نکاح کے اہل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عاقل و بالغ اور مختار ہو یعنی اس کو مجبور نہ کیا جائے اور وہ اپنے طلاق کی عدت میں ہی اپنی بیوی سے رجوع کرلے، اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ'' (بقرہ ۲۲۸) اور اس (مدت) میں ان کے شوہر ان کو واپس (اپنے نکاح میں) لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اگر عدت کے دوران شبہ کی وجہ سے عورت سے جماع کیا جائے اور اس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہوجائے تو یہ عدت حمل کی عدت میں منتقل ہوجاتی ہے، اس کے باوجود اس عدت میں شوہر کو اس سے رجوع کرنے کا حق ہے، باوجود یہ کہ وہ دوسرے شخص کی طرف سے شبہ کی بنیاد پر جماع کرنے کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہے۔

اگر خلع کی وجہ سے بیوی بائنہ ہوئی ہو تو عدت کے دوران ہی وہ تجدید عقد کرسکتا ہے، کیوں کہ اس کی عدت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، یہ اس صورت میں ہے جب یہ تین طلاق کے علاوہ میں ہے مثلاً وہ شوہر سے خلع لے اور شوہر خلع دے دے، کیوں کہ شوہر کو اپنی بیوی

سے طلاق رجعی کی صورت میں عدت کے دوران عقد کے بغیر رجوع کرنے کا حق ہے اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ طلاق بائن کی وجہ سے عدت گزارنے والی اپنی بیوی سے عقدِ جدید کے ذریعہ رجوع کرلے، اسی طرح شوہر کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنی بیوی سے طلاق رجعی میں رجوع کرے اگر یہ طلاق حیض یا نفاس کی حالت میں ہوئی ہو اور اس حیض یا نفاس میں اس سے رجوع بھی کیا ہو، چاہے حائضہ اور نفاس والی کی ابھی عدت شروع نہ ہوئی ہو، اس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں اگر ان دونوں میں سے کوئی طلاقِ رجعی کی عدت کے دوران انتقال کرجائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ طلاقِ رجعی کی صورت میں پانچ امور میں عدت گزارنے والی کو بیوی کا حکم حاصل ہے، نفقہ، طلاق، وراثت، ظہار اور ایلاء۔

جس کو شوہر نے طلاقِ رجعی دی ہو تو شوہر اس کا نفقہ اٹھائے گا، بالکل اسی طرح جس طرح بیوی ہونے کی صورت میں ہے، اگر عدت کے دوران شوہر کا انتقال ہوجائے تو وہ اس کی وارث بھی بنتی ہے جب طلاقِ رجعی ہو، شوہر طلاقِ رجعی کی صورت میں اپنی عدت گزارنے والی بیوی کے ساتھ ظہار بھی کرسکتا ہے، اسی طرح ایلاء بھی کرسکتا ہے۔

ایلاء کے احکام

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "الحاوی الکبیر" ۳۳٦/۱۰، "التھذیب" بغوی ۱۳۷/٦، "روضۃ الطالبین" ۲۲۰/۷، مغنی المحتاج "۱۰۲/۵)

ایلاء کے لغوی معنی قسم کے ہیں۔

شرعی واصطلاحی معنی یہ ہے کہ ایسا شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہ کرنے کی قسم کھائے جس ہو یعنی اس میں جماع کی طاقت ہو اور اس کا طلاق صحیح ہو۔ ایسی بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھائے جس کی اگلی شرمگاہ میں جماع کیا جاسکتا ہو، مدت کی تعیین کے بغیر مطلقاً قسم کھائے یا چار ماہ سے زیادہ جماع نہ کرنے کی قسم کھائے۔ (یہی حد امام نووی نے مقرر کی ہے "منہاج الطالبین"، دیکھا جائے "مغنی المحتاج "۱۰۲/۵) بیوی میں شرط یہ ہے کہ وہ جماع کو برداشت کرسکتی ہو یعنی وہ چھوٹی بچی نہ ہو، زمانہ جاہلیت میں ایلاء طلاق کی قسموں میں سے ایک قسم تھی، اسلام نے اس کا حکم تبدیل کردیا۔

اس کا صیغہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے جماع نہیں کروں گا۔ یا کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے پانچ مہینے جماع نہیں کروں گا۔ یا کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے فلاں کی موت ہونے تک جماع نہیں کروں گا۔ یا کہے: یہاں تک کہ تم مرجاؤ۔ ان تمام صورتوں میں ایلاء ہوجاتا ہے۔

ایلاء کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ" (بقرہ۲۲٦) جو اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں تو ان کے لیے چار مہینوں کا انتظار ہے۔

ایلاء حرام ہے اور صغیرہ گناہوں میں سے ہے، اس آیت میں حکم الہی ہے کہ ایلاء کی سب سے آخری مدت چار مہینے ہیں، یا تو اس کے بعد شوہر اپنی بات سے رجوع کرلے اور

اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرلے اور اپنی بیوی کو دی ہوئی تکلیف پر اللہ سے مغفرت مانگے، اگر وہ ایلاء سے رجوع نہ کرے اور اپنی بیوی سے جماع نہ کرے تو طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اللہ اس کی بات کو سننے والا اور اس کے حال کو جاننے والا ہے۔

ایلاء کے ارکان

ایلاء کے ارکان چھ ہیں: ایسا شوہر جس میں جماع کی طاقت ہو اور اس کی طلاق صحیح ہوتی ہو، ایسی بیوی جس سے جماع ممکن ہو، جس کے ذریعہ قسم کھائی جائے: یہ اللہ تعالی کے ناموں میں سے کوئی نام یا ذاتِ الٰہی کے صفات میں سے کوئی صفت ہے، قسم میں شرط ہے کہ اللہ کے اسمائے حسنی میں سے کسی نام کے ساتھ قسم کھائی جائے یا اللہ سبحانہ تعالی کی صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ (یہ قولِ قدیم کے مطابق ہے، قول جدید یہ ہے کہ اللہ تعالی اور اس کی صفات کی قسم کھانے کے ساتھ ہی ایلاء مقصود نہیں ہے، بلکہ اگر شوہر اس پر طلاق یا آزادی کو معلق کردے تو وہ ایلاء کرنے والا بن جائے گا۔ یہی بات امام غزالی نے "الوسیط" میں ۸/٦، امام نووی نے "روضۃ الطالبین" میں ۲۲۲/۷ کہی ہے۔ غزالی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایلاء کا تعلق نقصان پہنچانے سے ہے۔ عورت کی امید منقطع کرنے کے لیے نقصان پہنچانا ہے، جب شوہر کے لیے کوئی رکاوٹ ظاہر ہوجاتی ہے تو عورت کی امید منقطع ہوجاتی ہے) جماع کو طلاق یا آزاد کرنے یا کسی عبادت کی پابندی مثلاً نماز یا روزہ یا نذر ماننے ہوئے حج سے معلق کرنا جائز ہے۔ اور جس چیز کی قسم کھائی جائے یعنی جماع۔ مدت اور صیغہ۔

صیغہ کی دو قسمیں ہیں: (دیکھا جائے "روضۃ الطالبین" حاشیۃ بلقینی ۲۴۲/۷) صریح مثلاً اپنی بیوی سے کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے جماع نہیں کروں گا۔ یا کہے: میں تمھارا پردہ بکارت نہیں کھولوں گا۔ مدت کی کوئی تعیین نہ کرے۔ یا مدت متعین کرے اور وہ چار مہینوں سے زیادہ ہو، مثلاً کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے پانچ مہینے جماع نہیں کروں گا۔ یہ کہنا کہ میں تمھارا پردۂ بکارت نہیں کھولوں گا۔ کے معنی یہ ہیں کہ جماع نہیں کروں گا۔ کیوں کہ پردۂ بکارت کھولنے کے لیے جماع کرنا ضروری ہے۔

دوسری قسم کنایہ ہے، اس میں نیت شرط ہے، مثلاً کہے: اللہ کی قسم! میں تمھارے قریب

نہیں آؤں گا۔ اس کے معنی قریب آنے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور جماع کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس میں نیت شرط ہے۔

مثلاً یہ کہے: اللہ کی قسم! میں تم کو نہیں چھوؤں گا یعنی میں تمھارے جسم پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ اس میں بھی جماع نہ کرنے کی نیت رہنا شرط ہے تا کہ ایلاء شمار ہو۔ یعنی ایلاء صریح عبارت سے بھی منعقد ہوتا ہے مثلاً جماع کرنا اور وطی کرنا، پردہ بکارت کھولنا۔ اور کنایہ سے بھی، لیکن شرط یہ ہے کہ نیت ہو مثلاً چھونا اور مباشرت وغیرہ الفاظ استعمال کرے۔

ذکر (اگلی شرمگاہ) کٹے ہوئے شخص کی طرف سے ایلاء صحیح نہیں ہوتا ہے جس کے ذکر میں حشفہ کے بقدر بھی حصہ باقی نہ ہو، اور فالج زدہ کی طرف سے بھی ایلاء صحیح نہیں ہوتا جو حرکت اور جماع کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو، اور اس عورت سے ایلاء نہیں ہوتا ہے جس کی شرمگاہ میں گوشت یا ہڈی ہو کیوں کہ اس صورت میں جماع کرنا ممکن نہیں ہے۔

جب ایلاء پر یا رجوع کرنے پر چار مہینے گزر جائیں اور شوہر جماع نہ کرے اور وہ حیض میں نہ ہو تو عورت اپنے شوہر سے رجوع کرنے کا یا طلاق دینے کا مطالبہ کر سکتی ہے، جب تک عورت مطالبہ نہ کرے تو شوہر کو کسی بھی چیز کا حکم نہیں دیا جائے گا اور تاخیر کی وجہ سے عورت کا حق بھی ختم نہیں ہوتا ہے، اگر وہ اپنا حق چھوڑ دے اور راضی رہے، پھر اس کو اس کے حق کے بارے میں خیال آئے تو وہ مطالبہ کر سکتی ہے جب تک قسم کی مدت ختم نہ ہوئی ہو۔

ایلاء کی مدت کے دوران طلاقِ رجعی دے پھر اس عورت کو اپنے نکاح میں واپس لے آئے تو چار مہینے رجوع کرنے کے بعد سے شمار ہوں گے، اسی طرح میاں بیوی میں سے کسی ایک کے مرتد ہونے سے بھی ایلاء کی مدت منقطع ہو جاتی ہے اور عدت کا حساب اس وقت سے شروع ہوگا جب مرتد ہونے والا اسلام دوبارہ قبول کر لے اور دوبارہ مسلمان ہونا عدت کے دوران ہو۔ (یہی مسلک شافعی ہے اور جمہور کا مسلک بھی یہی ہے، یہی بات نووی نے ''الروضۃ'' ۷/۲۴۵ میں کہی ہے۔ اور سرخسی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ بیماری اور سبھی اعذار کی طرح ارتداد حساب کو روکتا نہیں ہے)

جب ایلاء پر چار مہینے گزر جائیں اور بیوی سے جماع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو

مثلاً وہ حائضہ یا نفاس والی نہ ہو تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے شوہر سے ایلاء سے رجوع کرنے اور اس کے ساتھ جماع کرنے کا مطالبہ کرے۔

اگر شوہر اس کا مطالبہ پورا نہ کرے تو اس کو طلاق کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر بیوی اپنے شوہر سے ایلاء سے رجوع کرنے کا مطالبہ نہ کرے تو اس کے ولی کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ یہ حق صرف بیوی کا ہے اور ولی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے چاہے وہ باندی ہی کیوں نہ ہو؛ اس لیے اس کے آقا کو شوہر سے ایلاء سے رجوع کرنے کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ (کیوں کہ اس مطالبہ میں نیابت نہیں ہوتی ہے ''الوسیط'' ۶/۲۳)

اگر بیوی اپنے شوہر سے چار مہینوں کے بعد اپنے ایلاء سے رجوع کا مطالبہ کرے اور شوہر قبول نہ کرے، پھر بیوی طلاق کا مطالبہ کرے اور وہ قبول نہ کرے تو قاضی شوہر کی موجودگی میں بیوی کو ایک طلاق دے گا۔ تا کہ قاضی شوہر کے رجوع اور طلاق دونوں سے انکار کو ثابت کر دے۔ قاضی اپنے فیصلے میں کہے: میں نے فلانہ کو اس کے شوہر فلاں کی طرف سے ایک طلاق دی۔ اگر قاضی بیوی کو ایک سے زائد طلاق دے تو صرف ایک ہی طلاق ہوتی ہے۔

اللہ تعالی اور اس کی صفات کی قسم کھانے سے ایلاء ہو جاتا ہے، اسی طرح طلاق یا آزاد کو معلق کرنے یا کوئی ثواب کے کام کی پابندی سے بھی ایلاء ہو جاتا ہے۔

اللہ کے نام یا اللہ کے اسماء حسنی میں سے کسی نام کی قسم کھائی جا سکتی ہے مثلاً اپنی بیوی سے کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے پانچ مہینے جماع نہیں کروں گا۔ یا کہے: ذوالجلال والاکرام کی قسم! میں تم سے پانچ مہینے جماع نہیں کروں گا۔ طلاق کو معلق کرنے کی مثال یہ ہے کہ اپنی بیوی سے کہے: اگر پانچ مہینوں میں تم سے جماع کروں تو تمھاری سوکن کو طلاق ہے۔ آزادی پر معلق کر کے ایلاء کی مثال یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: اگر میں نے پانچ مہینوں میں تم سے جماع کیا تو میرا غلام مبروک آزاد ہے۔

کسی ثواب کے کام کی پابندی کے ذریعہ ایلاء کی مثال یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے کہے: اگر میں نے پانچ مہینوں میں تم سے جماع کیا تو اللہ کی خاطر مجھ پر چھ مہینوں کے روزے ہیں۔ یا

اللہ کے لیے مجھ پر روزہ ہے۔ یا کہے: اللہ کے لیے مجھ پر فقیروں کو ایک ہزار درہم دینا ہے۔

یہ تین قسمیں ہیں جن کے ذریعہ ایلاء منعقد ہوتا ہے، اگر کوئی کہے: اگر میں تمھارے ساتھ اس مہینے جماع کروں تو اللہ کی خاطر مجھ پر اس مہینے کے روزے ہیں۔ تو ایلاء منعقد نہیں ہوتا ہے کیوں کہ اگر ایک مہینے بعد اپنی بیوی سے جماع کرے تو اس پر کوئی بھی چیز لازم نہیں ہے۔

اگر اللہ کی یا اللہ کے صفات میں سے کسی صفت کی قسم کھائے کہ وہ پانچ مہینے اس سے جماع نہیں کرے گا، پھر وہ اس سے پہلے ہی جماع کرلے تو اس پر قسم کا کفارہ لازم ہوتا ہے۔ (یہ جدید قول کے مطابق ہے، کیوں کہ اس نے اللہ تعالی کے نام سے قسم کھا کر توڑ دی ہے۔ غزالی کہتے ہیں: قدیم میں دو اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ ایلاء زمانہ جاہلیت میں طلاق تھی، شریعت نے اس کو تبدیل کر دیا اور اس کو ایک مدت بعد طلاق واجب کرنے والا بنایا۔ اس لیے اس کا حکم مدت پورا کرنا ہے اور مدت کے بدلے طلاق کو واجب کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ فرمان الہی ہے: ”فان فاء وا فان الله غفور رحیم “ (بقرہ ۲۲۶) (اگر وہ رجوع کرلیں تو یقیناً اللہ بڑی مغفرت فرمانے والے اور رحم کرنے والے ہیں) اس سے کفارہ کے لازم ہونے کا احساس نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ چیزیں مغفرت اور رحمت کو واجب کرتی ہے۔ ”الوسیط“ ۸/۶) اگر طلاق یا آزاد کرنے کو معلق کرنے کی قسم کھائے تو اس صفت کی موجودگی ہی سے طلاق ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی دو میں سے ایک بیوی سے کہے: میں پانچ مہینوں میں جب تم سے جماع کروں تو میری دوسری بیوی کو طلاق ہے۔ پھر شوہر مدت ختم ہونے سے پہلے جماع کرے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

اگر وہ اپنی بیوی سے کہے: جب میں پانچ مہینوں میں تم سے جماع کروں تو میرا غلام مبروک آزاد ہے۔ اور وہ پانچ مہینے گزرنے سے پہلے جماع کرے تو اس کا غلام آزاد ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی عبادت کرنے کی قسم کھائے تو جس کی پابندی اپنے اوپر لازم کی ہے وہ اس پر ضروری ہو جاتا ہے یا یہ کہنے کی صورت میں قسم کا کفارہ لازم آ جاتا ہے: اگر میں نے تم سے جماع کیا تو اللہ کی خاطر مجھ پر حج ہے یا ایک مہینے کے روزے ہیں، یا ایک سو رکعتیں نماز ہے۔ اس صورت میں اس کو حج، روزے اور نماز یا قسم کا کفارہ دینے میں کسی ایک کا اختیار ہے۔

اگر وہ جماع کرنے سے کسی فطری رکاوٹ کی وجہ سے معذور ہو مثلاً ایسی بیماری ہو جس

کی شفایابی کی امید ہو یا اس کے ختم ہونے کی امید نہ ہو تو وہ اپنی زبان سے رجوع کرے گا۔ مثلاً وہ کہے: جب میں اپنی بیماری سے شفایاب ہو جاؤں گا تو میں اپنی قسم سے رجوع کروں گا۔ اگر اس کا عذر ختم ہونے والا نہ ہو مثلاً اس کا ذکر کٹ چکا ہو تو وہ کہے گا: اگر میں طاقت رکھتا تو رجوع کرتا اور اپنی بیوی سے جماع کرتا۔ اس طرح وہ زبانی طور پر رجوع کرنے والا بن جائے گا۔ یعنی وہ اپنی زبان سے رجوع کرے گا اگر وہ عملی طور پر کام کرنے سے عاجز ہو۔ تاکہ وہ اپنی بیوی سے جماع کرنے سے باز رہنے کے نقصان کو ہلکا کردے۔

اگر شوہر چار مہینوں کے اخیر میں حج کا احرام باندھ لے تو بیوی کو حق ہے کہ وہ شوہر سے ایلاء سے رجوع کرنے کا مطالبہ کرے یا طلاق دینے کا۔ اگر شوہر طلاق دینے سے انکار کردے اور اس سے رجوع کرے اور اپنے حج کو فاسد کردے تو ایلاء میں اس کا رجوع کرنا یقینی ہو جاتا ہے اور حج کو فاسد کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہو جاتا ہے اور اس پر فدیہ بھی لازم ہوتا ہے اور دوسرے سال حج کی ادائیگی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

ایلاء کا حکم کب ختم ہوتا ہے؟

مندرجہ ذیل چار امور سے ایلاء کا حکم ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ ان میں سے ہر صورت میں قسم ختم ہو جاتی ہے:

۱۔ ایلاء کرنے والا اپنی بیوی سے جماع کرلے اور وہ مکلّف، جاننے والا، مختار (مجبور کیا ہوا نہ ہو) اور بالغ ہو، اسی طرح اگر نشہ میں کوئی شخص اپنی بیوی سے جماع کرے تو بھی اس کا ایلاء ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ طلاقِ بائن دے، کیوں کہ جس نے اپنی بیوی کو طلاقِ بائن دی ہو تو پھر اس سے جماع کرنا حرام ہو جاتا ہے مثلاً بیوی کو تین طلاق دے یا خلع دے۔

۳۔ مدت ختم ہو جائے، مثلاً اپنی بیوی سے پانچ مہینوں کا ایلاء کرے اور یہ مدت ختم ہو جائے، اس سے جماع کی حرمت ختم ہو جاتی ہے اور ایلاء بھی ختم ہو جاتا ہے۔

۴۔ اپنی چار بیویوں میں سے ہر ایک سے کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے جماع نہیں کروں

گا۔ پھر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے کیوں کہ ایلاء سبھوں کو شامل ہے۔ اگر ایک کا انتقال ہو جائے تو ایلاء ختم ہو جاتا ہے اور باقی تین بیویوں سے جماع کرنے کی صورت میں کچھ بھی شوہر پر لازم نہیں ہوتا ہے۔

۵۔ اگر ان میں سے کسی کا انتقال نہ ہوا اور ان میں سے تین کے ساتھ جماع کرلے تو چوتھی بیوی میں ایلاء متعین ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چوتھی بیوی سے جماع کرے تو ان سبھوں کا ایلاء ختم ہو جاتا ہے اور شوہر پر وہ چیز لازم ہو جاتی ہے جو اس نے قسم میں اپنے اوپر لازم کی ہے۔

اگر وہ کہے؛ اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی سے جماع نہیں کروں گا۔ تو وہ ان میں سے کسی سے بھی جماع کرنے کی صورت میں ہر مرتبہ اپنے ایلاء میں قسم توڑنے والا بن جائے گا اور اس پر اپنے اوپر لازم کی ہوئی چیز لازم ہو جائے گی۔

اگر وہ کہے: اللہ کی قسم! میں تم میں سے ایک کے ساتھ جماع نہیں کروں گا۔ تو وہ اپنی بیویوں میں سے ایک کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہوگا۔ اگر وہ ایک کو چھوڑ کر سبھوں کے ساتھ جماع کرلے تو باقی بچی ہوئی بیوی سے ایلاء ہو جائے گا۔ اگر وہ کہے کہ اس کا مقصود کسی تعیین کے بغیر صرف ایک ہے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ متعین کرے۔ اگر اس کا مقصود ان سبھوں میں سے ایک ہو یا کوئی بھی متعین نہ ہو تو ایلاء ان سبھوں کو شامل ہے۔

ایلاء کو حرام کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بیوی کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور اس کو نقصان نہ پہنچایا جائے، جب کہ شریعتِ اسلامی نے میاں بیوی دونوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ أعلم

ظہار کے مسائل

ظہار کے لغوی معنی: ظہار ''ظَهْر'' یعنی پیٹھ سے ماخوذ ہے۔ ظہر کہتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے سوار ہونے کی جگہ کو۔ ظہار کا اصل صیغہ جو جاہلیت میں بھی استعمال ہوتا تھا یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔

ظہار کے شرعی معنی: شوہر اپنی بیوی کو اپنی ماں اور اپنے محارم کے مشابہ قرار دے۔
(''کفایۃ الاخیار'' ۱۵۲/۲)

زمانہ جاہلیت میں ظہار طلاق کے معنی میں تھا، ایسا کہنے سے شوہر بیوی کو معلق بنا دیتا تھا، اس لیے وہ اپنی بیوی ہونے کے اعتبار سے اس کے ساتھ معاملہ نہیں کرتا تھا اور نہ اس عورت کی طرح معاملہ کرتا تھا جس کا شوہر نہ ہو، ظہار جاہلیت کے اعمال میں سے ایک ایسا عمل تھا جو عورت کو حقیر کرتا تھا اور اس کی شان گھٹاتا تھا۔

اسلام نے ظہار کو غیر لائق تشبیہ شمار کیا، کیوں کہ بیوی کو ماں کے مشابہ قرار دینا یا اس کو ماں کے برابر کہنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ماں ہی نے بچے کو جنم دیا ہے، جب کہ بیوی وہ عورت ہے جو گھر کا انتظام چلاتی ہے اور بچوں کی تربیت کرتی ہے، ماں محرم اصلی ہے اور ہمیشہ کے لیے محرم ہے، بیوی آدمی کی لطف اندوزی کی چیز ہے اور اس کی زندگی کا متعہ ہے ان سب وجوہات کی بنا پر قرآن کریم نے بیوی کو ماں سے تعبیر کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے اس سے متعلق سبھی احکام کو ٹھکرا دیا ہے۔

ظہار حرام ہونے کے دلائل قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں ہیں اور فقہاء کا اس کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''اَلَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَائِكُمْ مَا هُنَّ

أُمَّهَا تُهُنَّ ،إِنْ أُمَّهَاتُهُنَّ الّٰتِیْ وَلَدْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا، وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ '' (مجادلہ۲) جوتم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں تو وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہ ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے، اور وہ یقیناً منکر بات اور جھوٹ کہتے ہیں، اور یقیناً اللہ بڑا معاف فرمانے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

اسی بنیاد پر جو ظہار کا جملہ بولتے ہیں اور اس کے بعد اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتے تو وہ اپنی بیویوں کو خود پر حرام کر دیتے ہیں، جو اپنی بیوی سے ظہار کرے اور اپنی بات سے رجوع کرے اور طلاق نہ دے تو اس پر اپنی بیوی سے جماع کرنے سے پہلے ایک غلام یا باندی آزاد کرنا ضروری ہے، یہ سزا اللہ تبارک تعالی کی طرف سے ایک درس ہے کہ وہ ظہار سے باز رہے اور اللہ تعالی تمھارے اعمال کو جاننے والا ہے۔ اگر غلام یا باندی نہ ملے تا کہ اس کو آزاد کر دیا جائے؛ اس وجہ سے کہ اس کے پاس غلام یا باندی کی قیمت نہ ہو، یا اس وجہ سے کہ غلام ہی نہ پائے جائیں، اس صورت میں اس پر اپنی بیوی سے جماع کرنے سے پہلے مسلسل دو مہینے روزے رکھنا ضروری ہے، اگر کسی کو غلام نہ ملے اور وہ دو مہینوں کے مسلسل روزے بھی نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھلائے گا؛ مسکین کو اپنے شہر والوں کی متوسط غذا میں سے ایک مد دینا واجب ہے۔

ظہار کے کفارہ میں یہ اللہ تعالی کی طرف سے تخفیف ہے، اس کا مقصد رحمان ورحیم اللہ اور اس کے رسول کریم ﷺ پر ایمان لازمی ہے، یہ بھی مقصد ہے کہ لوگ جان جائیں کہ اللہ ان پر رحم کرنے والا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے جن گناہوں سے بچنے اور ان سے دور رہنے کا حکم دیا ہے ان کو کرنے کی سزا میں رحم کرنے والا ہے۔ اور جو اللہ کی آیتوں سے اعراض کرنے والے کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

حدیث مبارکہ میں ظہار کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اوس بن صامتؓ نے اپنی بیوی خولہ بنت حکیم سے ظہار کیا۔ (ابوداود: کتاب الطلاق، باب فی الظہار۲۲۱۴ مسند احمد ۶/۴۱۰۔ ''المنتقی'' ابن جارود ۷۴۶۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۲۷۹) اوس اندھے ہو گئے تھے۔ خولہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ کے پاس آئی اور اپنے شوہر کی طرف سے ظہار کرنے کے بارے میں سوال کیا تو

آپؐ نے ان سے فرمایا: ''تم اس پر حرام ہو گئی ہو''۔ اس نے دوبارہ سوال کیا اور آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اس کے لیے کوئی راہ تلاش کریں: میں اپنے شوہر کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی ہوں اور میرے ساتھ بچے ہیں، اگر میں ان کو ان کے والد کے پاس چھوڑ دوں گی تو وہ ضائع جائیں گے۔ اگر میں ان کو اپنے ساتھ رکھوں تو وہ بھوکے رہ جائیں گے۔ رسول للہ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی: ''تم اس پر حرام بن گئی ہو''۔

جب خولہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنی شان کے بارے میں صادر کیے ہوئے حکم سے مایوس ہو گئی تو اس نے اللہ کے حضور میں اپنے حالات، تنہائی اور فقر وفاقہ کی شکایت کی اور اس نے اللہ تعالی سے اپنے معاملہ میں کوئی راہ نکالنے کی درخواست ودعا کی۔ اس پر اللہ تعالی نے سورہ مجادلہ کی آیات ۲، ۳، ۴ نازل فرمائی اور ان آیات میں ظہار کے احکام اور اس کے کفارہ کو بیان کیا کہ اگر شوہر یہ کفارہ ادا کرتا ہے تو میاں بیوی کے درمیان علحید گی نہیں ہوتی ہے۔

فقہاء کا ظہار کے حکم پر اجماع ہے۔ (ابن منذر ''الاجماع'' ص ۴۷: علماء کا اجماع ہے کہ صریح ظہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔)

اللہ تعالی کے اس فرمان کی وجہ سے ظہار حرام ہے: ''وَإِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا، وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ '' (مجادلہ۲) اور وہ یقیناً منکر بات اور جھوٹ کہتے ہیں، اور یقیناً اللہ بڑا معاف فرمانے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیوں کہ اس میں اللہ تعالی کے احکام میں سے ایک حکم کو تبدیل کرنا ہے، کیوں کہ اللہ نے ماں اور بیوی کے درمیان فرق کیا ہے، جو اپنی بیوی سے ظہار کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ بیوی کو ماں کی طرح بنادے، اگر عام لوگوں کا یہ عقیدہ نہ ہوتا کہ ظہار اللہ کے حکم کو تبدیل کرنا ہے تو ظہار کفر ہو جاتا، بہر حال ظہار بہت سے کبیرہ گناہوں سے خطرناک ہے۔

ظہار کے ارکان

ظہار کے ارکان چار ہیں: میاں بیوی، مشبہ بہ یعنی جس کے ذریعہ تشبیہ دی گئی ہے، اور صیغہ۔ مثلاً شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔

ہر اس شوہر کی طرف سے ظہار صحیح ہوتا ہے جس کی طلاق صحیح ہو، اس بنیاد پر خصی، ذکر کٹے ہوئے، نامرد، نشہ آور چیز کا استعمال کیے ہوئے شخص اور ذمی کی طرف ظہار صحیح ہے، کیوں کہ ان سبھوں کی طلاق صحیح ہوتی ہے۔

اجنبی کی طرف سے ظہار صحیح نہیں ہے، چاہے وہ جس سے شادی سے پہلے ظہار کیا ہے اس کے بعد اس سے شادی کر لے، کیوں کہ ظہار بیوی اور شوہر کے درمیان ہوتا ہے، ظہار بچے، پاگل اور مجبور کیے ہوئے شخص کی طرف سے صحیح نہیں ہے۔

ظہار یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم یا تمھارے ظاہری اعضاء میں سے کوئی عضو میرے نزدیک یا مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ مثلاً کہے: تمھارا ہاتھ میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ چاہے وہ ''مجھ پر'' کا لفظ حذف کر دے۔ مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: تم میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ تو اس کا ظہار ہو جاتا ہے۔

باطنی اعضاء سے ظہار نہیں ہوتا ہے مثلاً جگر اور دل، کیوں کہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں ہے، اگر بیوی کو پیٹھ کے علاوہ ماں کے کسی دوسرے عضو سے تشبیہ دے اور اس کا تذکرہ عزت وکرامت کے لیے نہ کرے تو یہ مطلقاً ظہار ہوگا۔ مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: تم مجھ پر میری ماں کے سینے کی طرح ہو۔ اس صورت میں ظہار ہو جاتا ہے۔

اگر اس کا تذکرہ عزت وکرامت کے ضمن میں ہو تو ظہار ہو جاتا ہے مثلاً ماں کی آنکھ اور مقصد ظہار ہو: تم مجھ پر میری ماں کی آنکھ کی طرح ہو۔ تو ظہار ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے مراد ظہار نہ ہو، بلکہ مقصد اس طرح کا احترام ہو جس طرح ماں کی آنکھوں کا احترام ہے۔ اس صورت میں ظہار نہیں ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص کہے: تم میری ماں کی طرح ہو۔ تو یہ ظہار سے کنایہ ہے۔ اگر ظہار مراد لیا ہو تو ظہار ہو جاتا ہے۔ اگر مراد نہ لیا ہو تو نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ذہانت میں میری ماں کی طرح ہو۔

ماں کی طرح دوسرے محارم بھی ہیں جن کی حرمت کسی سبب کی وجہ سے نہ آئی ہو۔ ظہار

میں ماں کی طرح ماں کے علاوہ دوسری ہر محرم عورت ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس کی حرمت اصلی ہو، عارضی نہ ہو۔

اس بنیاد پر اگر شوہر اپنی بیوی کو اپنی بہن، پھوپی یا خالہ یا اپنے والد یا ماں کو دودھ پلانے والی یا اپنے والد کی بیوی سے تشبیہ دے تو ظہار ہو جاتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس کے والد نے اس عورت سے شوہر کے پیدا ہونے سے پہلے شادی کی ہو۔

اگر شوہر اپنی بیوی کو خود کو دودھ پلانے والی عورت (مرضعہ) سے تشبیہ دے تو ظہار نہیں ہوتا ہے۔ یا اس کو اپنے بیٹے کی بیوی سے تشبیہ دے، کیوں کہ اس طرح کی عورتوں کی حرمت شوہر کے حق میں عارضی ہے۔ (اس کی وضاحت شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں کی ہے ۱۱۹/۵، کیوں کہ وہ دونوں کسی وقت اس کے لیے حلال تھیں، اس لیے اس وقت کو مراد لینے کا احتمال ہے۔ بغوی نے اس میں اختلاف بیان کیا ہے جیسا کہ ''التہذیب'' میں ہے ۶/۱۵۴)

رجوع کرنے کی صورت میں شوہر پر کفارہ لازم ہوتا ہے یعنی شوہر پر لازم ہوتا ہے کہ وہ صرف ظہار سے رجوع کرتے ہی اس کا کفارہ ادا کرے، جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے: ''ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا'' (مجادلہ ۳) پھر جو انھوں نے کہا اس سے رجوع کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنی بیوی سے ظہار کرتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح بن جاتا ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی ہو۔ یعنی اس کو اپنے اوپر اپنی ماں کی طرح حرام کیا ہے۔ اگر وہ ظہار کے بعد اپنی بیوی کو طلاق نہ دے تو گویا اس نے اپنی بات سے رجوع کر لیا ہے۔ اس صورت میں اس پر اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے اپنے گناہ کا کفارہ دینا ضروری ہے۔ وہ غیر موقت غیر رجعی ظہار میں بیوی کو اپنے ساتھ اتنی مدت تک رکھے جس مدت میں اس کی بیوی سے علحیدگی ممکن ہو۔

رجوع کرنا یہ ہے کہ وہ وقت متعین نہ کیے ہوئے ظہار میں رجوع کرے۔ یہ رجعی نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ظہار کرے اور اس وقت طلاق نہ دے جس وقت اس کو طلاق دینا ممکن ہو، اور اپنی بیوی کو اپنی عصمت اور زوجیت میں باقی رکھے۔ وقت متعین کردہ ظہار میں رجوع کا جہاں تک تعلق ہے مثلاً وہ اپنی بیوی سے کہے: تم

مجھ پر ایک دن یا دو دن میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔

اس ظہار میں رجوع یہ ہے کہ وہ اس دن اپنی بیوی سے جماع کرے۔ البتہ غیر رجعیہ بیوی کے لیے وقت متعین نہ کیے ہوئے ظہار میں اگر وہ ظہار کا جملہ ادا کرے اور اس کو فوراً طلاق نہ دے یعنی اتنی مدت کے دوران طلاق نہ دے جتنی مدت میں طلاق دینا اس کے لیے ممکن ہے تو اس صورت میں اپنے ظہار میں رجوع ہو جائے گا اور اپنی بیوی سے جماع کرنے سے پہلے اس پر کفارہ ادا کرنا واجب ہے، کیوں کہ اس کی بات کی مخالفت اس کے عمل سے ہو گئی ہے۔

صحیح قول یہ ہے کہ کفارہ دو امور کی وجہ سے لازم ہوتا ہے۔ یعنی ظہار اور اس میں رجوع کرنے سے۔ اگر کوئی شخص اپنی چار بیویوں سے ایک ہی جملہ میں ظہار کرے مثلاً وہ کہے: تم سب مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ یعنی اپنے بیویوں سے جماع کرنے سے پہلے اس پر چار کفارے ادا کرنا ضروری ہے۔ (التہذیب ۶/۱۶۱)

اگر کوئی شخص اپنی بیویوں سے پے در پے ظہار کرے، تو وہ جب دوسری سے جس وقت ظہار کرے گا تو وہ پہلے والی کے ظہار سے رجوع کرنے والا بن جائے گا، تیسری کے ساتھ ظہار کرنے سے دوسری سے رجوع ہو جائے گا، چوتھی سے ظہار کرنے سے تیسری سے رجوع کرنے والا بن جائے گا، اگر وہ ظہار کے بعد چوتھی کو طلاق نہ دے تو چوتھی کو بھی اپنی عصمت میں واپس لینے والا بن جائے گا اور اس پر چار کفارات لازم ہوتے ہیں۔ اگر وہ چوتھی کو طلاق دے تو اس پر تین کفارے لازم ہوتے ہیں۔ (یہ مسلک ہے، اور امام شافعی کا قولِ جدید امام ابوحنیفہ کے مطابق ہے۔ قولِ قدیم یہ ہے کہ اس پر صرف ایک کفارہ ہی لازم ہے، جس طرح وہ قسم کھائے کہ ان کے ساتھ بات نہیں کرے گا پھر بات کر لے تو اس پر ایک ہی کفارہ لازم آتا ہے۔ ''التہذیب'' ۶/۱۶۱)

اسلام امت مسلمہ کو تعلیم دے رہا ہے کہ ہر فرد اپنی زبان کی حفاظت کرے تا کہ وہ اس بات سے واقف ہو جائے کہ جو بھی لفظ وہ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس کی قیمت ہے اور اس کا حساب لیا جائے گا، اگر بات اچھی ہوگی تو اس کو ثواب ملے گا، اگر بری ہے تو اس کو سزا ملے گی۔ تا کہ ہر مسلمان اپنی زبان پر قابو رکھے اور ظہار کا کلمہ بولنے سے باز رہے، کیوں کہ یہ گناہ کبیرہ ہے، اس وجہ سے مسلمان وہی بات کہے جس سے فائدہ ہو اور اس کی عمر بیکار کی باتوں میں ضائع نہ ہو۔

لعان

لعان کے لغوی معنی دھتکارنے اور دور کرنے کے ہیں۔ اس سے یہ جملہ بھی ہے: ''لَعَنَ اللّٰهُ الْكَافِرَ'' یعنی اللہ نے کافر کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور دھتکار دیا۔

لعان کے شرعی معنی: مخصوص کلمات ہیں جن کو ایسے مجبور شخص کے لیے حجت مانا گیا ہے جو اپنا بستر گندا کرنے والی اور عار لازم کرنے والی بیوی پر زنا کا الزام لگائے یا اپنے بچے کی نفی کرنے پر مجبور شخص کے لیے حجت مانا گیا ہے۔ (التہذیب ۶/۱۸۸، شربینی الخطیب ''مغنی المحتاج'' ۵/۱۴۰) کیوں کہ لعان سے پہلے زنا کا الزام لگانا ضروری ہے۔

لعان میں صرف بچے کی نفی ہوتی ہے، مثلاً شوہر اپنی بیوی کے زنا کی گواہی چار مرتبہ دے۔ اور وہ حاملہ ہو تو شوہر بچے کی نفی کے لیے لعان کرے۔

اگر شوہر کو یقین ہو جائے کہ جس بچے کو اس کی بیوی نے جنم دیا ہے وہ اس کا بچہ نہیں ہے اور وہ اس بات کو گواہوں یا دستاویزات کے ذریعہ ثابت نہ کر سکتا ہو، کیوں کہ گواہ بھی نہ پائے جائیں یا دستاویز نہ ہو تو اس صورت میں اسلامی شریعت نے چند کلمات متعین کیے ہیں جن کے ذریعہ شوہر اپنے اس بچہ کے نسبت کی نفی کر سکتا ہے، اگر اس کے پاس گواہ بھی ہوں جن سے تاکید ہو کہ پیدا شدہ بچہ اس کا نہیں ہے تو بھی اس کو اپنی بیوی پر لعان کرنے کا حق ہے۔

گواہوں کے ذریعہ اس کو ثابت کرنا آسان نہ ہونے کی وجہ سے شریعت نے اس بچہ کی نسبت کو اپنے سے نفی کرنے کا ارادہ رکھنے والے کے لیے چند کلمات متعین کیے ہیں جس سے وہ فاحشہ عورت کو اپنے سے دور رکھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ اس وقت ہے جب شوہر کو یقین ہو جائے کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے، مثلاً اس نے اپنی اس بیوی کے ساتھ جماع ہی نہیں کیا ہے جس کو بچہ ہوا ہے۔ یا اس عورت کے ساتھ شادی سے چھ مہینوں سے کم مدت میں

مکمل بچہ پیدا ہو جائے، اس صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ وہ لعان کے ذریعہ اس بچے کی نسبت کی نفی کرے۔

لعان کے احکام کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے: ''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ، إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِيْنَ، وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ، وَيَدْرَءُ وْا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ، إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ، وَالْخَامِسَةُ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ'' (نور ۶-۹) (اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور ان کے لیے خود ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے کسی (مرد) کی گواہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار مرتبہ گواہی دے کہ بے شک وہ سچا ہے، پانچویں بار (یہ کہے) کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو، اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار مرتبہ گواہی دے کہ وہ جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ سچا ہو تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب نازل ہو) جب شوہر اور بیوی لعان سے فارغ ہو جائیں جیسا کہ ان آیات کریمہ میں ہے تو وہ ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتے ہیں اور بیوی سے زنا کی حد اس طرح ساقط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہر پر لعان کرے۔ جیسا کہ سابقہ آیتوں میں آیا ہے۔ (دیکھا جائے ''المحرر الوجیز'' ابن عطیہ ۲۰۲/۴ ''تفسیر ابن کثیر'' ۱۴/۶)

اگر ان دونوں کا بچہ ہو اور شوہر اس کی نسبت کی نفی کرنا چاہے، تو وہ اپنی بیوی سے کہے گا: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی پر جو زنا کا الزام لگایا ہے اس میں سچوں میں سے ہوں، اور یہ بچہ زنا کا ہے، میرا نہیں ہے۔ وہ یہ گواہی چار مرتبہ دہرائے گا۔ (چار مرتبہ گواہی دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چار گواہیاں چار گواہوں کے قائم مقام ہے تاکہ بیوی پر حد قائم کی جائے) اور پانچویں مرتبہ وہ کہے گا: ''أَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ'' اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

شوہر لعان کی کلمات سے فارغ ہونے کے بعد بیوی اپنے سے زنا کی حد ساقط کرنے کے لیے لعان کرے گی، اس پر ضروری ہے کہ وہ اللہ کو گواہ بنا کر کہے کہ شوہر جھوٹوں میں سے

ہے اور یہ بچہ اس کا ہے، زنا سے نہیں ہے۔ اس پر ضروری ہے کہ یہ گواہی چار مرتبہ دہرائے، پھر پانچویں مرتبہ کہے: ''أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ'' اگر وہ سچوں میں سے ہے تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو۔

حدیث نبوی میں لعان کی دلیل یہ ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر الزام لگایا کہ شریک بن سحماء نے اس کے ساتھ زنا کیا ہے۔ یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے ان سے کہا: ''دلیل لاؤ، ورنہ تمھیں کوڑے مارے جائیں گے''۔ ہلال نے کہا: (صحیح بخاری: کتاب الشہادات، باب اذا ادعی اوقذف ۲۵۴۷، صحیح مسلم: کتاب اللعان ۱۴۹۵) اللہ کے رسول! جب ہم میں سے کوئی اپنی بیوی پر کسی شخص کو دیکھے تو وہ گواہ تلاش کرنے کے لیے نکلے؟ رسول اللہ ﷺ نے اپنی یہ بات دہرائی: ''دلیل لاؤ، ورنہ تمھیں کوڑے مارے جائیں گے''۔ ہلال نے کہا: اللہ کی قسم! جس نے حق دے کر آپ کو مبعوث فرمایا ہے، میں سچا ہوں، ضرور اللہ تعالی ایسی آیت نازل فرمائے گا جس سے میری پیٹھ حد سے بری ہو جائے گی۔ جبرئیل نازل ہوئے اور اس بارے میں آیت نازل فرمائی: ''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ'' وہ اور ان کی بیوی نے لعان کیا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں دو مرتبہ لعان ہوا، پہلا لعان ہلال بن امیہ کا اور دوسرا لعان عویمر عجلانی کا جو شعبان نو ہجری میں پیش آیا۔ (بخاری: کتاب الطلاق، باب اللعان ۵۲۵۹، مسلم: کتاب اللعان ۱۴۹۲)

رسول اللہ ﷺ کے عہد کے بعد لعان پھر سب سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ (لعان کو مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ شوہر کے علاوہ کوئی دوسرا الزام لگانے پر مجبور نہیں ہوتا ہے، چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اسلامی ادب یہ سکھاتا ہے کہ زنا کو چھپایا جائے اور تنہائی میں نصیحت کی جائے۔ جہاں تک شوہر کا تعلق ہے تو وہ اپنی اس بیوی کو رسوا کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس نے اس کا بستر گندا کر دیا ہو اور اس کے لیے عار کا سبب بنی ہو۔ یہ شرعی عذر ہے جس کی وجہ سے شوہر کو اپنی بیوی سے علیحدگی کا اختیار رہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس پر مکمل مہر دینا ضروری ہو جاتا ہے اور ہونے والے بچے کی نسبت بھی اس کی طرف کی جاتی ہے، اس لیے طلاق کی صورت میں مسئلہ حل

نہیں ہوتا ہے،اس لیے میاں بیوی کے درمیان عدل وانصاف کی تکمیل کے لیے لعان کو مشروع کیا گیا ہے)

لعان کے ارکان

لعان کے ارکان تین ہیں : دولعان کرنے والے یعنی میاں بیوی ۔ اور صیغہ ۔ صیغہ یہ ہے کہ شوہر چار مرتبہ یہ کہے: ''میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس پر (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرے) زنا کا جو الزام لگایا ہے اس میں سچوں میں سے ہوں ، اگر بیوی حاضر ہو تو اس طرح کہے، اگر اس کے نام ، اوصاف اور نسب کے ساتھ اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہو جائے تا کہ وہ دوسروں سے نمایاں ہو جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے تو ان امور کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ۔ اور پانچویں مرتبہ شوہر کہے: اگر وہ زنا کا الزام لگانے میں جھوٹوں میں سے ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اگر بیوی موجود ہو تو یہ کہے، اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کا نام لینا، اس کے اوصاف کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جن سے وہ دوسری عورتوں سے ممتاز ہو جائے ، جس کی وجہ سے لوگ اس کو جان لیں ۔ اسی طرح اپنے خلاف گواہی دیتے وقت ''مجھ پر'' اللہ کی لعنت ہو کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ وہ سچا ہے۔

اگر بچہ موجود ہو اور شوہر اس کی نسبت کی اپنے سے نفی کرنا چاہتا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ پانچوں گواہیوں میں اس جملہ کا اضافہ کرے: ''زنا کا بچہ ہے''۔ یہ کہنا ہی کافی ہے۔ یہ بات معلوم ہی ہے کہ جب اس نے یہ بات کہہ دی ہے کہ یہ بچہ زنا سے ہے تو وہ اس کا نہیں ہے۔

لعان کے اثرات

لعان کے ذریعہ چھ امور حاصل ہو جاتے ہیں: (''فتح الوہاب'' شیخ الاسلام زکریا ۱۰۲/۲)

۱۔ اگر بچہ موجود ہے تو اس بچہ سے نسب کی نفی ہو جاتی ہے جس کی نفی شوہر نے لعان میں کی ہے ۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو علحیدہ کیا اور بچہ کو ماں کے حوالہ کیا۔

فوراً نفی کرنا ضروری ہے یعنی شوہر پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس بارے میں معلوم ہوتے ہی فوراً بچہ سے اپنے نسب کی نفی لعان کے ذریعہ کرے، البتہ عذر ہو تو الگ بات ہے،

مثلاً اس کو رات کے وقت معلوم ہو جائے تو وہ صبح تک صبر کرے گا، یا اس کے پاس ایسے وقت خبر آئے جس وقت جماعت کی نماز کھڑی ہو رہی ہو، اس صورت میں وہ پہلے نماز ادا کرے گا۔ یا وہ بھوکا ہو تو پہلے کھائے گا اور اس کے فوراً بعد لعان کرے گا اور بچے کے نسب کی نفی کرے گا۔

نسب کی نفی کرنے سے وہ شوہر کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے، اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کی تجہیز و تدفین اس کے ذمے نہیں ہے، اور وہ بچہ شوہر کی دیگر اولاد کے لیے محرم نہیں بنے گا۔

۲۔ بیوی پر لگائے ہوئے الزام کی حد ساقط ہو جائے گی ، اس طرح اگر زانی کا نام لیا ہے تو اس پر بھی زنا کے الزام کی حد ساقط ہو جائے گی ، کیوں کہ جس شوہر نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا ہے اور لعان نہیں کیا ہے تو اس کی بیوی کے صالح ہونے کی وجہ سے اس پر زنا کے الزام کی حد نافذ ہوتی ہے، البتہ اگر وہ لعان کرے تو اس سے حد قذف ساقط ہو جاتی ہے ،شوہر کی طرف سے بیوی پر لعان کرنے کی وجہ سے زانی پر لگائے ہوئے زنا کے الزام کی حد بھی شوہر سے بیوی کے حق کے ساقط ہونے پر قیاس کرتے ہوئے ساقط ہو جائے گی ، جیسا کہ لعان کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ یہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ، اس کی دلیل امام بیہقیؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دولعان کرنے والے کبھی بھی جمع نہیں ہوں گے''۔ (امام بیہقی نے عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت مرفوعاً کی ہے ''السنن الکبریٰ'' ۴۰۹/۷، جب کہ عبدالرزاق نے بھی مرفوعاً روایت کی ہے ۴۲۵/۳) اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک لعان کرے اور دوسرا لعان نہ کرے تو بھی وہ دونوں ایک دوسرے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتے ہیں اور ان کا آپس میں نکاح کبھی بھی صحیح نہیں ہے۔ (کیوں کہ شوافع کے نزدیک لعان کے سبھی احکام صرف شوہر کے لعان کرنے سے ہی شروع ہو جاتے ہیں پھر عورت کے لعان پر کوئی بھی موقوف نہیں رہتا ہے اور نہ حاکم کے فیصلہ پر۔ ''التہذیب'' بغوی ۱۹۰/۶)

۴۔ اگر عورت لعان نہ کرے تو اس پر حد واجب ہو جاتی ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب شوہر اپنی بیوی پر لعان کرے اور عورت شوہر پر لعان نہ کرے تو عورت پر حد نافذ کی جائے

گی۔اس کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَيَدْرَءُ وا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِـاللّٰـهِ ''۔(اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار مرتبہ گواہی دے)اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی پر زنا کی حد قائم کرنا واجب ہوجاتا ہے جس پر اس کے شوہر نے لعان کیا ہو،لیکن وہ جب اپنے شوہر پر لعان کرتی ہے تو اس سے یہ حد دور ہوجاتی ہے۔

۵۔ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے نکاح فسخ ہوجاتا ہے،جس طرح میاں بیوی کے درمیان رضاعت کا رشتہ ہو تو ان کا ظاہری اور باطنی طور پر نکاح فسخ ہوجاتا ہے۔

۶۔شوہر کے حق میں اس کی حفاظت ختم ہوجاتی ہے:شوہر اپنی بیوی سے لعان کرنے سے اس کی پاکیزگی اور عفت کی حرمت اس کے شوہر کے لیے ختم ہوجاتی ہے، چاہے اس عورت نے اپنے شوہر پر لعان کیا ہو یا نہ کیا ہو، جب اس کے بعد آدمی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو وہ تعزیر اور زجر و توبیخ کا مستحق ہوجاتا ہے اور اس پر حد قذف نافذ نہیں کی جائے گی۔

لعان پر مرتب ہونے والے ان امور میں سے دو اصلی امور ہیں جو پہلا اور دوسرا ہے، جہاں تک باقی چار امور کا تعلق ہے تو یہ ان دونوں کے تابع ہیں۔

جس عورت پر شوہر نے لعان کیا ہے اس سے چند احکام متعلق ہوجاتے ہیں، اگر جماع سے پہلے شوہر بیوی پر لعان کرے تو وہ نصف مہر کی مستحق بن جاتی ہے اور اس کی بہن اس کے لیے حلال ہوجاتی ہے، اور جس نے اس پر لعان کیا ہے تو اس کے علاوہ چار بیویوں سے شادی کرنا حلال ہے، لعان کو تین طلاق کا حکم ہے اور اس بیوی کو نفقہ کا حق نہیں ہے چاہے وہ حاملہ ہی کیوں نہ ہو، یہ اس وقت ہے جب وہ اپنے لعان میں بیوی سے کہے: اس کا حمل اس سے نہیں ہے۔

اگر شوہر خود کو جھٹلائے تو نسب ثابت ہوجاتا ہے اور اس پر حد لازم ہوجاتی ہے اور اس صورت میں حرمت ختم نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنے قول میں رجوع کرے اور کہے: میری بیوی پاکیزہ اور پاک دامن ہے، میں نے جھوٹ کہا تھا۔اس کا بچہ میرا بیٹا ہے، اس صورت میں بچہ کا نسب ثابت ہوجاتا ہے اور اس پر حد لازم ہوجاتی ہے، اس کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے اور اس پر اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی ہے، کیوں کہ اس ابدی تحریم کو واجب

کرنے والے اسباب لعان کا نتیجہ ہے، جھوٹ کا اقرار کرنے یا جھوٹا نہ ہونے کا اقرار کرنے سے حرمت زائل نہیں ہوتی۔(''مغنی المحتاج''۵/۱۶۰۔''التہذیب''بغوی ۶/۲۱۴)

آدمی اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورت پر لعان نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ میاں اور بیوی کے درمیان ہی لعان ہوتا ہے، البتہ اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ اس پر زنا کا الزام لگائے اور زنا کے زمانہ کی تعیین اس طور پر کرے کہ وہ اس وقت اس کی بیوی رہی تھی تو اس پر لعان کرسکتا ہے، چاہے وہ بچے کی نفی کرے یا نہ کرے، کیوں کہ لعان کا مقصد یہ ہے کہ بیوی نے شوہر پر اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج کے دوران جو عار لگایا ہے اس کو ختم کرنا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاقِ بائن کے بعد لعان کرے یا اس کے انتقال کے بعد لعان کرے مثلاً شوہر اپنی بیوی پر وقت متعین کیے بغیر زنا کا الزام لگائے یا اپنے ساتھ نکاح ہونے کے بعد اس پر زنا کا الزام لگائے تو شوہر کو لعان کا حق ہے جب ان دونوں کا بچہ ہو جس کے نسب کی وہ نفی کرنا چاہتا ہو، اگر ان دونوں کا بچہ نہیں ہے تو پھر اس کو لعان کا حق نہیں ہے۔

جب کوئی شخص کسی عورت پر الزام لگائے کہ ان دونوں کی شادی سے پہلے اس نے اس عورت کے ساتھ زنا کیا ہے۔یا یہ الزام لگائے کہ اس کو طلاق دینے کے بعد اس کے ساتھ زنا کیا ہے تو اس کو عورت سے لعان کرنے کا حق نہیں ہے، چاہے ان دونوں کا بچہ موجود ہو جس کے نسب کی وہ نفی کرنا چاہ رہا ہو یا بچہ نہ ہو۔

بیوی کو طلاق دینے کے بعد زنا کا الزام لگانے سے شوہر پر حد لازم ہوجاتی ہے، جس نے اس کو طلاق دیا ہے پھر اس پر الزام لگایا ہے۔اگر شوہر اپنی بیوی کو جانے بغیر طلاق دے جو اس عورت سے جو اس کا بچہ ہے وہ زنا کا بچہ ہے، اصلاً اس کا نہیں ہے، پھر یہ بات معلوم ہوجائے اور وہ اس بچہ کے نسب کی نفی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس عورت پر الزام لگا سکتا ہے اور اس سے لعان کرسکتا ہے اور اس لعان کی وجہ سے اس کی حد ساقط ہوجائے گی، اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ جب کوئی کسی عورت کے ساتھ وطی شبہ کرے مثلاً نکاح فاسد میں جماع کرے، اس صورت میں اگر ان دونوں کا بچہ ہے تو اس کے نسب کی نفی کرتے ہوئے لعان کرے گا۔

کوئی شخص اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے لعان نہیں کرسکتا ہے، اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ وہ جس وقت زنا کرنے کا الزام لگا رہا ہے اس وقت وہ اس کی بیوی رہی ہو تو لعان کرسکتا ہے، اور یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عورت لعان کرتے وقت اس کی بیوی ہو۔ اپنی بیوی کے علاوہ دوسری عورت سے لعان کرنا جائز نہ ہونے کے اصول سے یہ شکل بھی مستثنیٰ ہے کہ وہ کسی اجنبیہ سے وطی شبہ کرے یا نکاح فاسد ہوجائے اور اس کے بعد جماع کرے مثلاً وہ عقد میں یہ شرط رکھے کہ بیوی کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہے، جب اس نکاحِ فاسد میں وہ جماع کرے اور اس کے بعد اس پر زنا کا الزام لگائے، کیوں کہ نکاح فاسد میں عورت بیوی نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ اجنبیہ رہتی ہے۔ اسی طرح وطی شبہ میں بھی وہ اجنبیہ ہی رہتی ہے، البتہ وہ اس عورت کے اجنبیہ رہتے ہوئے اس سے لعان اس وجہ سے کرسکتا ہے کہ اس سے جماع کیا ہے، جب اس عورت کو بچہ ہوجائے اور وہ اس کے نسب کی اپنے سے نفی کرنا چاہتا ہو تو وہ اس عورت سے لعان کرسکتا ہے، اس لعان سے اس بچہ کے نسب کی اس سے نفی ہوجاتی ہے اور اس پر حدِ قذف نافذ نہیں ہوتی ہے اور یہ عورت اس کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی ہے، اس لعان کی وجہ سے چوتھا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس عورت پر زنا کی حد نہیں لگتی ہے کیوں کہ اس کے اور اس شخص کے درمیان جس نے لعان کیا ہے کوئی ازدواجی تعلق ہی نہیں ہے، اور وہ لعان بھی نہیں کرے گی کیوں کہ بیوی کے لعان کا مقصد اپنے سے زنا کی حد کو دور کرنا ہے، اور اس عورت پر حد نافذ نہیں ہوتی ہے اور مرد کے لعان کا مقصد اپنے سے بچے کی نفی کرنا ہے اور نسب کا تعلق عورت سے نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ بچہ اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے بارے میں کہے: اس کے ساتھ شبہ سے جماع کیا گیا ہے۔ تو اس صورت میں شوہر کی تعزیر کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اس طرح کی بات سے عورت کو تکلیف ہوتی ہے اور اس پر دھبہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے سے تعزیر کی سزا دور کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی بیوی سے لعان کا حق ہے، چاہے ان دونوں کا کوئی بچہ نہ ہو۔

اگر شوہر اپنے سے تعزیر دور کرنا چاہتا ہے تو اس پر یہ کہنا واجب ہے: "میں اللہ کو گواہ

بنا کر کہتا ہوں کہ جو الزام میں نے اپنی بیوی پر لگایا ہے میرے بستر پر میرے علاوہ دوسرے نے اس کے ساتھ جماع کیا ہے اس میں سچوں میں سے ہوں اور یہ بچہ اس جماع کا نتیجہ ہے"۔ اگر کوئی بچہ نہ ہو تو وہ آخری جملہ حذف کردے گا۔

بار بار قسم صرف لعان اور قسامہ میں ہی کھائی جاتی ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "الحاوی الکبیر" ماوردی ۱۳/۳) لعان میں پانچ مرتبہ قسم کھائی جاتی ہے، اور اس سے شوہر اپنے اوپر نافذ ہونے والی حد کو دور کرتا ہے، یہاں مکرر قسم کھانے کی وجہ اس معاملہ کی خطرناکی کا احساس دلانا ہے۔

قسامہ میں پانچ مرتبہ قسم دہرائی جاتی ہے (قسم کی تفصیلات آرہی ہیں) لعان یا قسامہ کو چھوڑ کر کوئی تیسری شکل ایسی نہیں ہے کہ مدعی سے بینہ سے پہلے قسم کا مطالبہ کیا جاتا ہو۔

لعان کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس پر زنا کا الزام لگایا جائے جس سے حد نافذ ہوتی ہو، مثلاً وہ صریح طور پر کہے: اے زنا کار۔ یا کنایہ کے الفاظ میں کہے: اے فاجرہ عورت۔ زنا کا الزام لگانے کی حد اسّی کوڑے ہیں۔ مرد پر زنا کا الزام لگانا یہ کہنے سے ہوگا: اے زنا کار۔ اے لواطت کرنے والے۔ کنایہ کے الفاظ یہ ہیں: اے مخنث۔ اے خبیث کام کرنے والے۔

اگر زنا کا الزام صریح ہو تو اس میں نیت پائی جانا ضروری نہیں ہے، البتہ کنایہ کی صورت میں نیت شرط ہے۔

جو صراحت کے ساتھ زنا کا الزام لگائے تو اس پر حد نافذ کرنا ضروری ہے، اگر کنایہ و اشارہ میں زنا کا الزام لگائے اور اس کی نیت بھی پائی جائے تو اس صورت میں بھی حد نافذ کرنا ضروری ہے۔

اگر کنایہ کی صورت میں ارادہ اور نیت نہ ہو تو صرف تعزیر کرنا کافی ہے۔

صریح زنا کے الزام یا نیت کے ساتھ کنایہ میں زنا کے الزام کے بعد ہی لعان ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کے علاوہ میں لعان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لعان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے زنا کا الزام لگایا جائے پھر اس کے بعد اس کی حد دور کرنے کے لیے لعان کیا جائے۔

جب زنا کا الزام لگائے تو اس کی حد اور سزا واجب ہوجاتی ہے۔ اس سے چند شکلیں

مستثنیٰ ہیں: (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''التھذیب'' بغوی ۶/۱۹۵)

بیوی کافر ہو۔ یا مکاتب باندی ہو۔ یا ام ولد ہو۔ یا بعض حصہ باندی اور بعض حصہ آزاد ہو۔ یا پاگل ہو۔ یا ایسی چھوٹی ہو جس سے جماع نہ کیا جا سکے، یا اس کو زنا پر مجبور کیا جائے یا اس کے ساتھ شبہ کے بنیاد پر جماع کیا جائے۔ ان تمام صورتوں میں زنا کا الزام لگانے والے پر حد نافذ نہیں ہوگی، بلکہ اس کی تعزیر کی جائے گی۔ کیوں کہ حد قذف اس وقت ضروری ہو جاتی ہے جب زنا کا الزام محصنہ اور پاک دامن عورت پر لگایا جائے۔ محصنہ وہ ہے جو مسلمان، عاقل، بالغ اور آزاد ہو جو خود پر حد واجب ہونے والے جماع سے اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔ جن عورتوں کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے اس پر یہ وصف منطبق نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے ان پر زنا کا الزام لگانے سے تعزیر ضروری ہو جاتی ہے، ان عورتوں سے لعان کا مقصد تعزیر کو دور کرنا ہے۔

اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اس میں تعزیر واجب کرنے کا سبب جھٹلانا ہو، کیوں کہ زنا کا الزام لگانے والے کا ظاہری حال جھوٹ ہے، اس وجہ سے اس کی تعزیر کرنا ضروری ہے، اسی بنیاد پر اگر وہ اپنے سے تعزیر کو دور کرنا چاہتا ہے تو وہ لعان کرے گا۔ اگر تعزیر کا سبب جھوٹ ہو مثلاً ایسی بچی پر زنا کا الزام لگائے جو جماع کے لائق ہی نہ ہو۔ یا عورت کی شرمگاہ میں ہڈی یا گوشت ہو تو اس صورت میں لعان نہیں ہے۔ یا اس کی سچائی عیاں ہو مثلاً کسی ایسی عورت پر زنا کا الزام لگائے جس کا زنا ثابت ہو چکا ہو تو پھر لعان نہیں ہے، کیوں کہ زنا کا الزام لگانے والے نے ایسی عورت پر الزام لگایا ہے جس کا زنا ثابت ہے اور وہ شخص سچا ہے، اس لیے اس کو لعان کا حق نہیں ہے۔

اگر زنا کا الزام چھوٹی بچی پر لگایا جائے تو اس کی وجہ سے اس پر عار نہیں آتا ہے، البتہ اس پر الزام لگانے والے کی تعزیر اس لیے کی جائے گی کہ اس کو ادب سکھایا جائے تاکہ وہ لوگوں کو تکلیف دینے سے باز رہے اور ان پر بے جا الزامات نہ لگائے۔

اگر زنا کا الزام کسی ایسی عورت پر لگائے جس نے زنا کیا ہو اور الزام لگانے والا اپنے دعوی میں سچا ہو اور یہ ثابت بھی ہو چکا ہو تو لعان نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ الزام لگانے والا اپنی

بات میں سچا ہے، بلکہ لعان کا مقصد اس کی سچائی کو ثابت کرنا ہے، البتہ تعزیر کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تکلیف دینے اور ان کو گالی دینے سے اس کو روکا جائے۔

شریعت نے اس شوہر کے لیے لعان جائز کیا ہے جو اپنے بستر سے عار مٹانا چاہتا ہو اور اس بچے سے اپنے نسب کی نفی کرنا چاہتا ہو جس کا باپ ہونے کا وہ اقرار نہیں کر رہا ہے، جب شوہر اپنی بیوی سے لعان کرے تو بیوی کو اپنے شوہر کے لعان کا مقابلہ کرنے کا حق ہے، وہ اس طرح کے وہ اس کے بعد چار مرتبہ کہے: ''میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ جو اس نے مجھ پر زنا کا الزام لگایا ہے وہ اس میں جھوٹوں میں سے ہے''۔ اور پانچویں مرتبہ کہے: ''اگر وہ سچوں میں سے ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو''۔

عورت جب لعان کرے تو اس کے لیے اپنے بیٹے کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ بیٹے کی ماں کی طرف نسبت میں کوئی اختلاف نہیں ہے، شوہر کے لعان کے بعد ہی بیوی کا لعان ہونا ضروری ہے، کیوں کہ شوہر کے لعان کی صورت میں عورت پر حد زنا ضروری ہو جاتی ہے۔ جب عورت لعان کرتی ہے تو اس سے یہ حد دور ہو جاتی ہے۔

لعان کے لیے شرط ہے کہ قاضی اس کا حکم دے اور اس کے الفاظ کی تلقین کرے، لعان کی بہت سی شرطیں ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ایک شرط یہ ہے کہ لعان سے پہلے زنا کا الزام لگانا ضروری ہے۔ یہ بھی شرط ہے کہ لعان قاضی کے حکم سے ہو اور قاضی لعان کے کلمات شوہر کو لفظ بلفظ کہلوائے۔ چار مرتبہ گواہی دینے کے بعد پانچویں مرتبہ قاضی اللہ کے عذاب اور دردناک سزا سے شوہر کو ڈرائے اور اس کو پانچویں گواہی سے منع کرے، اگر وہ قبول نہ کرے تو پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

یہ بھی شرط ہے کہ قاضی بیوی کو لعان کا صیغہ لفظ بلفظ کہلوائے اور پانچویں مرتبہ اس کو اللہ کے عذاب اور سزا سے ڈرائے اور چوکنا کرے۔ اگر وہ قبول نہ کرے تو یہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہو۔ قاضی کے حکم کے بغیر لعان کی کوئی قیمت نہیں ہے، کیوں کہ لعان قاضی کے حکم کے بغیر اور اس کی غیر حاضری میں اور اس کی طرف سے لفظ بلفظ میاں بیوی کو کہلوانے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ہے۔

لعان کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ شوہر کا لعان بیوی کے لعان سے پہلے ہو کیوں کہ وہی بچے کی نفی کرنے والا ہے اور عورت کا لعان اس پر شوہر کی طرف سے لعان کرنے کی وجہ سے حد ضروری ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، میاں بیوی میں سے ہر ایک لعان کی آیتوں میں وارد کلمات کی پابندی کرے گا، یہ بھی شرط ہے کہ گواہیاں پے در پے ہوں جن کے درمیان طویل فصل نہ ہو اور لعان میاں بیوی خود کریں، کسی دوسرے کی طرف سے لعان صحیح نہیں ہے اور نہ اس کے وکیل کی طرف سے، کیوں کہ اللہ تعالی نے اس حکم میں میاں بیوی کو مخصوص کیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

عدت اور استبراء کے مسائل

عدت کے لغوی معنی شمار کرنے کے ہیں، کیوں کہ عدت میں عورت طہر، حیض اور دنوں کو شمار کرتی ہے۔

عدت کے شرعی معنی: وہ مدت جس میں عورت اپنے رحم کے خالی ہونے کے بارے میں جاننے کے لیے یا عبادت کی خاطر یا اپنے شوہر کی وفات پر پہنچنے والی تکلیف کی خاطر انتظار کرتی ہے۔

عدت کے واجب ہونے کے دلائل قرآن، حدیث اور اجماع امت ہیں، قرآن کریم میں جماع سے پہلے طلاق اور جماع کے بعد طلاق اور وفات کے بعد کی عدت کو واضح کرنے والی آیات نازل ہوئی ہیں۔

جماع سے پہلے طلاق کی عدت کے بارے میں اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا إِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَکُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا'' (الأحزاب ۴۹) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو جماع سے پہلے طلاق دو تو ان پر تمہاری کوئی عدت نہیں ہے کہ اس کو گزاریں۔

جماع کے بعد مطلقہ کی عدت کے بارے میں اللہ تعالی فرماتا ہے: ''وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ'' (البقرۃ ۲۲۸) اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین دور تک انتظار کریں۔

آیسہ اور نابالغہ سے جماع کے بعد طلاق کی عدت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ ''وَالّٰتِی یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِسَائِکُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ أَشْهُرٍ وَ الّٰتِی

لَمْ يَحِضْنَ ''(الطلاق ۴) اور جو تمہاری عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینہ ہے، اور (یہی عدت) ان عورتوں کی بھی ہے جن کو حیض آیا ہی نہیں۔

حاملہ مطلقہ کی عدت کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے: ''وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ''(الطلاق ۴) اور حمل والیاں؛ ان کی عدت یہ ہے کہ وہ بچہ جنیں۔

وفات کی عدت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجاً يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ''(البقرۃ ۲۳۴) اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روک کر رکھیں۔

وفات کی عدت میں یہ فرق نہیں ہے کہ جماع کیا ہو یا نہ ہو، ان دونوں صورتوں میں وفات کی عدت وہی ہے جس کو آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے یعنی چار مہینے دس دن۔

حاملہ کی عدت وضعِ حمل سے ختم ہوتی ہے۔ چاہے اس کو شوہر نے طلاق دی ہو یا اس کے شوہر کی وفات ہوئی ہو، شرط یہ ہے کہ یہ عدت حمل والے کی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گزارنے لگے، پھر عدت کے درمیان وطی شبہ کی وجہ سے دوسرے کسی شخص سے حاملہ ہو جائے تو اس عورت پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضعِ حمل کے بعد اپنی عدت مکمل کرے جو حمل غلطی کی وجہ سے دوسرے شخص سے جماع کی وجہ سے ٹھہرا ہوا ہو، اگر کسی کو حمل کی صورت میں طلاق دی جائے یا اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے اور وہ اس شوہر سے حاملہ ہو تو اس کی عدت بچہ جننے سے ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ آزاد ہو یا باندی۔

عدت طلاق یا کسی دوسری وجہ سے علیحدگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً جنون وغیرہ کی وجہ سے ہو یا لعان یا رضاعت یا ارتداد کی وجہ سے ہو۔

جماع یا منی داخل کرنے کے بعد علیحدگی کی صورت میں عدت واجب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے سبھی بیویوں پر عدت لازم کی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ '' (البقرۃ ۲۲۸) اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین دور تک انتظار کریں۔

عدت مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ نسب کی حفاظت کی جائے اور اس میں اختلاط سے حفاظت ہو، تاکہ میاں بیوی، والد اور دوسرے شوہر کے حقوق کی رعایت رکھی جائے، عام طور پر اس میں عبادت کے معنی پائے جاتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حیض سے پاک ہونے سے حمل سے پیٹ خالی ہونے کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے۔ (مغنی المحتاج ۵/ ۱۶۷) قروء کے معنی حیض کے بعد والا طہر ہے۔

جن عورتوں کو جماع سے پہلے طلاق دی جائے تو شریعت نے ان پر عدت ہی نہیں رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا" (الأحزاب ۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو جماع سے پہلے طلاق دو تو ان پر تمہاری کوئی عدت نہیں ہے کہ اس کو گزاریں۔

اگر مرد عورت کی شرمگاہ میں منی داخل کر دے تو اس پر عدت ضروری ہو جاتی ہے، کیوں کہ عورت کی شرمگاہ میں منی داخل کرنے سے عورت کے حاملہ ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

حیض والی آزاد عورت کی عدت تین طہر ہے، یہ اس فرمانِ الٰہی میں بیان کیا گیا ہے: ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ'' (البقرۃ ۲۲۸) اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین دور تک انتظار کریں۔

حیض نہ آنے والی عورت کو جماع کے بعد طلاق دی جائے اور وہ آزاد ہو تو اس کی عدت تین مہینے ہیں، مثلاً اس کو حیض آنا بند ہو جائے یا اس کو ابھی حیض ہی نہ آیا ہو، مستحاضہ متحیرہ کی عدت طلاق کی صورت میں تین مہینے ہیں جب اس کے ساتھ جماع کیا گیا ہو یعنی جس کو اپنی حیض کی عادت کے بارے میں معلوم نہ ہو، اس طرح مستحاضہ غیر متحیرہ کی بھی یہی عدت ہے، اس باب کے مقدمے میں ہم نے ان آیات کو بیان کیا ہے جن میں اس کا شرعی حکم بیان کیا گیا ہے جس کی ابتداء اس آیتِ کریمہ سے ہوئی ہے: ''وَاللَّاتِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ''، اس فرمان تک '' وَاللَّاتِي لَمْ يَحِضْنَ'' (الطلاق ۴) اور جو تمہاری عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینہ ہے، اور (یہی عدت)

ان عورتوں کی بھی ہے جن کو آیا ہی نہیں۔

غیر آزاد حیض والی کے لیے دو طہر عدت ہے چاہے وہ مکمل باندی ہو یا بعض باندی اور بعض آزاد۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کہا ہے: باندی دو طہر عدت گزارے گی، بیہقی نے اس بارے میں کہا ہے کہ باندی دو طہر عدت گزارے گی۔ (بیہقی "السنن الکبریٰ" ۷/ ۴۲۵، یہ بات حضرت علی اور دیگر صحابہ وتابعین سے بھی مروی ہے جیسا کہ مصنف ابن أبی شیبہ میں ہے ۴/ ۱۴۶ رقم ۱۸۷۶۸) اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے احکام میں باندی کو آزاد کا آدھا مقام و مرتبہ ہے، طہر کو آدھا نہیں کیا جا سکتا اس لیے ڈیڑھ طہر عدت نہیں رکھی گئی، اس وجہ سے اس کی عدت دو طہر ہے۔

آزاد عورت کو تین طلاق دی جاتی ہے اور باندی کو دو طلاق، کیوں کہ طلاق کو بھی آدھا آدھا نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو ڈیڑھ طلاق دی جائے، اس وجہ سے باندی کا حق صرف دو طلاق ہے۔

بہت ہی کم مسائل میں باندی کے حقوق آزاد عورت کے حقوق کے برابر ہیں، اگر کوئی مرد نئی شادی کرے تو اس نئی بیوی کا حق باکرہ ہو تو سات دن ہیں چاہے وہ باندی ہو یا آزاد، یہ بیوی ثیبہ ہو تو اس کا حق تین دن ہیں، اس میں باندی اور آزاد یکساں ہیں۔

اگر شوہر جماع سے عاجز ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اگر اس دوران وہ جماع کی طاقت نہ رکھے تو اس کے اخیر میں نکاح فسخ ہو جاتا ہے، اس مہلت میں بیوی؛ باندی یا آزاد ہو تو یکساں ہیں، حیض کی کم سے کم مدت نو سال ہیں چاہے وہ عورت باندی ہو یا آزاد۔ (الإقناع ۲/۴۳۲)

غیر حیض والی باندی کی عدت کی مدت ڈیڑھ مہینہ ہے یعنی جو حیض آنے سے مایوس ہو گئی ہو یا اس کو حیض ہی نہ آیا ہو جب اس کے ساتھ جماع کیا گیا ہو، یہ آزاد عورت کی عدت کی آدھی مدت ہے۔

وفات کی عدت آزاد عورت کے لیے چار مہینے دس دن ہیں چاہے اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو یا منی داخل نہ کی گئی ہو یا وہ چھوٹی ہو، چاہے اس کو حیض آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

اگر باندی ہے تو دو مہینے پانچ دن ہیں، چاہے وہ مکمل باندی ہو یا نامکمل، اس پر یہ

اصول منطبق ہو جائے گا "باندی آزاد عورت کی آدھی ہے"۔ یہ سبھی احکام اس عورت کی عدت کے ساتھ مخصوص ہیں جو حاملہ نہ ہو۔

اگر بیوی حاملہ ہے تو اس کی عدت بچہ جننے پر ختم ہو جاتی ہے، چاہے یہ حمل مردہ نکل آئے یا زندہ، چاہے مکمل حمل کے بعد نکلے (مکمل حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے) یا نامکمل بچہ پیدا ہو چاہے وہ مضغہ ہو، ماہرین نے کہا ہے کہ مضغہ آدمی کی اصل ہے، اگر اس کو پانی میں رکھا جائے تو اس میں چہرے کی تصویر کے خدوخال نظر آتے ہیں جب کہ وہ اپنی تکوین وتشکیل میں تصویر کے مرحلے کو پہنچ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ حاملہ عورت کی عدت بچہ جننے پر ختم ہو جاتی ہے: ''وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' (الطلاق ۴) اور حمل والیاں؛ ان کی عدت یہ ہے کہ وہ بچہ جنیں۔

گوشت کا لوتھڑا جس کو مضغہ کہا جاتا ہے حمل ہی ہے۔ حاملہ کی عدت بچہ جننے پر اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب اس حمل کی نسبت اس شخص کی طرف ہو جس کی وہ عدت گزار رہی ہے، چاہے اس کا احتمال ہی کیوں نہ ہو مثلاً لعان کی وجہ سے نفی کیا ہوا بچہ۔

یہ شرعی اصول اس حاملہ کی عدت پر بھی منطبق ہو جاتا ہے جس کو آلہ تناسل کٹے ہوئے یا خصی کیے ہوئے شوہر کی طرف سے طلاق ہوئی ہو۔ کیوں کہ اس شوہر کی طرف سے حاملہ ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے، اگر تاکیدی شکل میں یا احتمال کی صورت میں صاحبِ حمل کی عدت ہو تو اس صورت میں عورت کی عدت بچہ جننے پر ختم ہو جاتی ہے۔ (''الاقناع'' ۲/ ۴۶۶)

اگر شوہر تین سالہ بچہ ہو تو اس صورت میں اس کا حمل ہونا ناممکن ہے، اس صورت میں بچہ جننے کے بعد چار مہینے دس دن آزاد عورت اور باندی دو مہینے پانچ دن عدت گزارے گی۔

بچہ جننے پر عدت گزرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ مکمل طور پر باہر نکل آئے، اگر دو بچے ہیں تو دونوں نکل آئیں، یہ بات معروف ہے کہ جڑواں بچوں کی پیدائش یکے بعد دیگرے ہوتی ہے، کبھی دونوں کے درمیان فاصلہ چند منٹ رہتا ہے، کبھی فاصلہ بڑھ جاتا ہے تو چند

دن یا مہینہ بھر بھی ہوتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ چھ مہینوں سے زیادہ نہ ہو، اگر فاصلہ کی مدت چھ مہینوں سے زیادہ ہوتو دوسری ولادت نیا حمل ہوگا اور اس کا پہلے حمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ (''التہذیب'' بغوی ۲۴۶/۶)

حاملہ کی عدت مکمل ہونے کے لیے مکمل وضع حمل ہونا ضروری ہے، اگر آدھا حمل باہر آئے اور دوسرا آدھا نہ آئے تو عدت مکمل نہیں ہوگی، باقی حمل باہر آنے تک اور رحم کے حمل سے خالی ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ (''التہذیب'' ۲۴۴/۶)

استبراءِ رحم

استبراء کے لغوی معنی براءت کی درخواست کرنے کے ہیں اور اس کے شرعی معنی یہ ہے کہ عورت باندی ہونے کی وجہ سے ایک مدت انتظار کرے، یا دوبارہ جماع کرنا حلال ہونے کے لیے ایک مدت تک انتظار کرے تاکہ اس کا رحم حمل سے خالی ہوجائے۔ یا اس کا مقصد عبادت ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: واجب اور مستحب۔ (شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں یہی تعریف کی ہے ۲۰۴/۵)

ایک مدت تک انتظار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ باندی کے مادر رحم کے حمل سے خالی ہونے کی تاکید ہوجائے کہ اگر وہ حاملہ ہے تو اس کا آقا اس کے قریب اس وقت تک نہ جائے جب تک وہ بچہ نہ جنے، اگر وہ حاملہ نہ ہو تو رحم بری ہونے کے بعد آقا اس سے جماع کرسکتا ہے۔

اس بنیاد پر استبراء کا مقصد یہ ہے کہ مادرِ رحم حمل سے خالی ہونے کا یقین ہوجائے یا اللہ کا حکم مان کر اور اس کی شریعت کی پابندی کرکے عبادت کی جائے۔

باندی کی مثال یہ ہے کہ زید کسی باندی کو خریدے جس کا نام فضہ ہو، چوں کہ اس کی خریداری نئی ہے، اس لیے زید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک حیض آنے تک انتظار کرے اور اس بات کا یقین ہوجائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے، اس کے بعد وہ اس باندی سے حالتِ طہر میں جماع کرسکتا ہے۔

ملکیت زائل ہونے کی مثال یہ ہے کہ زید اپنی فضہ کو بیچنا چاہتا ہے، اس صورت میں

زید کے لیے ضروری ہے کہ حیض آنے تک انتظار کرے اور اس بات کی تاکید ہوجائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے، اس کے بعد وہ اس باندی کو بیچ سکتا ہے۔

دوبارہ جماع کے حلال ہونے کی مثال یہ ہے کہ زید اپنی دوسری باندی زعفران کو آزاد کردے، اس وقت اگر وہ اپنی سابقہ باندی زعفران جس کو اس نے آزاد کیا ہے سے شادی کرنا چاہے تو اس پر اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے کہ زعفران کو حیض آئے اور اس کا حیض ختم ہوجائے پھر اس سے شادی کرلے۔ یا اس کی مثال یہ ہے کہ جب یہ اپنی باندی کو طلاق دے جو اس کی بیوی ہے اور یہ طلاق اس سے جماع کرنے سے پہلے ہو پھر وہ دوبارہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو اس پر ضروری ہے کہ ایک حیض آ کر ختم ہونے تک انتظار کرے تاکہ اس کے رحم کا حمل سے خالی ہونے کا یقین ہو۔

اگر یہ باندی چھوٹی ہو، جس کی وجہ سے اس کو حیض نہ آتا ہو، یا بوڑھی ہو جس کے حیض آنے کا سلسلہ رک چکا ہو تو اس صورت میں اس پر ایک ماہ انتظار کرنا ضروری ہے۔

ان سب احتیاطات کو شریعت نے بیویوں پر عدت اور باندیوں پر استبراء رحم فرض کرکے اختیار کیا ہے جس کا مقصد نسب کی حفاظت کرنا ہے کہ بچے کی نسبت اس کے والد کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف نہ ہو اور نسب میں اختلاط نہ ہو، جب شریعتِ مطہرہ نے ہر راہ سے نسب کی پاکیزگی اور اس کو اختلاط سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے تو ہمیں نکاح متعہ حرام کرنے کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے کیوں کہ اس میں نسب کے اختلاط کے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں، اسی طرح محارم سے نکاح کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

استبراء کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اوطاس کے قیدیوں کے سلسلہ میں یہ فرمان ہے: ''کسی حاملہ سے جماع نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو بچہ ہوجائے، غیر حاملہ سے بھی ایک حیض آنے تک جماع نہ کیا جائے''۔ ابوداود وغیرہ نے یہ روایت کی ہے۔ (احمد ۱۱۲۲۸، ابوداود: کتاب النکاح، باب فی وطئ السبایا ۲۱۵۷، ''المعجم الوسیط'' طبرانی: ۱۹۷۳، ''السنن الکبری'' بیہقی ۴۴۹/۷، حاکم نے ''المستدرک'' میں اس کو صحیح کہا ہے ۱۹۵/۲) امام شافعی نے قید ہونے والی عورت پر باقی باندیوں کو قیاس کیا ہے۔

اوطاس کے قیدی سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو مسلمانوں نے ثقیف اور ہوازن کے خلاف وادی اوطاس میں جنگ کے دوران قید کیا تھا، اس وجہ سے ان کو اوطاس کے قیدی کہا گیا، یہ بات مشہور ہے کہ کافروں کی جن عورتوں کو جہاد میں قید کیا جاتا ہے تو وہ باندیاں بن جاتی ہیں، اگر کافر مسلمان ہوجائے تو ان کی عورتوں کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا ہے اور نہ ان کی اولاد اور مال کو، لیکن یہ لوگ اپنی عورتوں کے قید ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کرلیا، پھر رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کی عورتیں واپس کردی جائیں، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے درخواست کی کہ وہ ان کی عورتیں واپس کردیں اور سبھوں نے ان عورتوں کو واپس کردیا۔

امام شافعی نے خریدی ہوئی باندی کے حکم کو جہاد میں قید ہونے والی باندی پر قیاس کیا ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو تو اس کے جننے تک انتظار کیا جائے، اگر حاملہ نہ ہو تو ایک حیض آکر پاک ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ (دیکھا جائے ''الام'' ۵/۱۵۱ باب الخلاف فی السبایا) اگر باندی چھوٹی ہو، ابھی حیض نہ آیا ہو، یا جس کا حیض رک گیا ہو اور حیض آنے کی امید ختم ہوچکی ہو تو اس کے لیے ایک مہینہ انتظار کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کا رحم خالی ہونے کا یقین ہوجائے، اس وقت اس کا آقا اس کے ساتھ جماع نہیں کرے گا۔

عورت کے آزادی سے غلامی میں منتقل ہونے کی صورت میں استبرائے رحم کرنا ضروری ہے چاہے اس کے ساتھ جماع نہ کیا گیا ہو، اسی طرح اس کے برعکس میں بھی یعنی وہ غلامی سے آزادی کی طرف منتقل ہوجائے مثلاً آزاد کردہ باندی جب اس سے جماع کیا گیا ہو، اور ام ولد اپنے آقا کے انتقال کے بعد استبرائے رحم کرے گی۔

آزادی سے غلامی کی طرف منتقل ہونے والی یا اس کے برعکس کی صورت میں ایک حیض آکر صاف ہونے تک انتظار کرکے استبرائے رحم کرنا ضروری ہے جیسا کہ اوطاس کے قیدیوں کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

اس کا عکس بھی صحیح ہے۔ یعنی جب عورت غلامی سے آزادی کی طرف منتقل ہوجائے تو بھی استبرائے رحم واجب ہے تاکہ باندی کے بچے اور آزاد کے بچے کے درمیان فرق

ہوجائے، آزاد پر اپنا استبرائے رحم کرنا ضروری ہے، اسی طرح ام ولد باندی اپنے آقا کی وفات کے بعد آزاد ہوجاتی ہے، جب اس کے آقا کا انتقال ہوجائے تو اس پر استبرائے رحم کرنا واجب ہے یعنی وہ ایک حیض آکر ختم ہونے تک انتظار کرے گی پھر اگر چاہے تو شادی کرے گی۔

جب آقا آزاد کرنے سے پہلے اپنی باندی کا استبرائے رحم کرے۔ یعنی باندی کے آزاد ہونے سے پہلے اس کے حیض آکر ختم ہونے تک انتظار کرے، اس کے بعد آزاد کرے تو یہ باندی فوراً شادی کرسکتی ہے، البتہ ام ولد اپنے آقا کی عدت کے بعد آزاد ہوجاتی ہے اور اس کی وفات کے بعد ام ولد پر استبرائے رحم واجب ہوجاتا ہے، کیوں کہ ام ولد عدت واجب ہونے میں بیوی کی طرح ہے، جو باندی استبرائے رحم کرے پھر اس کو آزاد کردیا جائے تو وہ باندی بیوی کی طرح نہیں ہے یعنی شادی شدہ عورت کی طرح نہیں ہے۔

عورت اگر ایک کی غلامی سے دوسرے کی غلامی میں منتقل ہوجائے تو بھی اس پر استبرائے رحم کرنا ضروری ہے مثلاً اس کو خریدا جائے یا وہ وراثت میں تقسیم ہوجائے یا عیب کی بنیاد پر اس کو خرید کر واپس کردیا جائے، جب خریداری کی وجہ سے باندی ایک غلامی سے دوسری غلامی کی طرف منتقل ہوجائے تو اس پر استبرائے رحم ضروری ہے یعنی اس کو ایک مرتبہ حیض آئے اور وہ اس حیض سے پاک ہوجائے۔ اسی طرح باندی کی ملکیت وارث کی طرف منتقل ہوجائے۔ یعنی باپ کی باندی ہو اور اس نے ابھی جماع نہ کیا ہو تو اس باندی پر وارث بیٹے کے لیے حلال ہونے سے پہلے استبرائے رحم ضروری ہوجاتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اس باندی سے جماع کرسکتا ہے۔

جب باندی کو بیچا جائے پھر معلوم ہوجائے کہ اس میں کوئی عیب ہے جس کی وجہ سے بیع فسخ ہوجائے اور وہ اس عیب کی وجہ سے اپنے اصلی مالک کے پاس آئے تو بیچنے والے کو اس سے جماع کرنے سے پہلے استبرائے رحم کرنا واجب ہے، ان تینوں صورتوں میں استبرائے رحم کرنا واجب ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر صورت میں باندی نئی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔ (یہی بات بغوی نے ''التہذیب'' میں کہی ہے ۶/۲۸۲، ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ واجب نہیں ہے)

رضاعت

رضاعت کے لغوی معنی: بچے کا اپنی ماں کے تھن سے دودھ پینے کے لیے چوسنا ہے۔
اصطلاحی معنی یہ ہے کہ عورت کا دودھ، دودھ پیتے بچے کے معدہ میں پہنچ جائے، یہاں دودھ سے مراد خالص دودھ یا اس سے بنائی ہوئی چیز ہے مثلاً مکھن یا دھی وغیرہ جس کو دودھ پلانے والی عورت کے دودھ سے بنانا ممکن ہو۔

جب عورت کا دودھ یا اس سے بنی ہوئی چیزیں بچے کے معدہ میں پہنچ جائے جس کی عمر دو سال سے کم ہو، اور یہ پانچ مرتبہ ہو جائے تو دودھ پیتے بچے اور اس عورت کے درمیان رضاعی رشتہ داری اور محرمیت ہو جاتی ہے۔

نکاح کے باب میں ہم نے رضاعی حرمت، اس کے رشتے داروں کی تفصیلات بیان کر دی ہیں کہ دودھ پلانے والی عورت اس بچے کی ماں بن جاتی ہے اور اس کے بچے اور رشتے دار اس بچے کے بھی رشتے دار بن جاتے ہیں، اس باب میں اس شرعی حرمت کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے احکام کی وضاحت کی جارہی ہے۔

رضاعت کے ارکان

رضاعت کے ارکان تین ہیں: دودھ پلانے والی، دودھ پینے والا بچہ اور دودھ۔
رضاعت کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے اور رضاعت کے احکام اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جب دودھ اس عورت کا ہو جس کی عمر نو سال اسلامی ہوں، اس بنیاد پر شرعی سنِ بلوغ کو عورت نہ پہنچی ہو (بالغ ہونے کی کم از کم عمر نو سال ہے) تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ (''المنہاج'' نووی، دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ص ۲۱۴/۵)

مرد کے دودھ سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے اور نہ خنثی مشکل کے دودھ سے۔

(حرمتِ رضاعت خنثی مشکل کے مرد یا عورت واضح ہونے پر موقوف ہے، اگر اس کا عورت ہونا واضح ہو جائے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے، ورنہ نہیں۔ دیکھا جائے ''مغنی المحتاج ۲۱۴/۵) اسی طرح حیوان کے دودھ سے بھی رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے مثلاً دو بھائی ایک بکری کا دودھ پئیں۔ کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی دودھ رضیع کی ہڈیوں کو پروان چڑھانے والی اصلی غذا شمار نہیں ہوتی ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ بچوں کے لیے مخصوص طور تیار کردہ مصنوعی دودھ کی سبھی قسموں پر جلی حروف میں لکھا رہتا ہے کہ ''یہ ماں کے دودھ سے بے نیاز کرنے والا نہیں ہے''۔ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ جو ماں شریعت میں مقررہ دودھ پلانے کی پوری مدت اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اس سے سینے کے کینسر سے حفاظت ہوتی ہے اور یہ شرعی مدت ۲۴ مہینے ہیں، اس کے باوجود اکثر عوتیں اس شرعی ذمہ داری کو پوری نہیں کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو دودھ پلانے سے باز رہتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے بچوں کو طبعی غذا کے ان کے حق سے محروم کر دیتی ہیں جس سے ان کی بنیادی اور اساسی نشو ونما ہوتی ہے، ساتھ ساتھ وہ خود کو سنیہ کے کینسر کا بھی شکار بناتی ہیں۔

اللہ تعالی نے ماں کا دودھ بچے کے لیے پیدا کیا ہے، اس دودھ کے ساتھ ماں کی محبت اور اس کی شفقت ومہربانی رہتی ہے، اس کا بدل کوئی بھی مصنوعی دودھ نہیں ہو سکتا ہے۔

رضاعت نسب کی طرح ہے، کیوں کہ نسب دو اشخاص کے درمیان ہوتا ہے، اسی طرح رضاعت بھی، اس کے احکام دو اشخاص کے درمیان رہتے ہیں، اس بنیاد پر جب کوئی بچہ کسی پری کا دودھ پیئے تو اس رضاعت سے ان دونوں کے درمیان رضاعت کے شرعی احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ (کیوں کہ مسلک شافعی کا راجح قول یہ ہے کہ انسان اور جن کے درمیان نکاح صحیح نہیں ہے۔ دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۲۱۵/۵) اگر دو بچے ایک ہی حیوان سے دودھ پئیں تو دونوں کے درمیان رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے اور اس رضاعت کی وجہ سے اس کے شرعی احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

دودھ پلانے والی عورت کی عمر کم از کم نو سال رہنا ضروری ہے، اگر نو سال سے کم ہو تو

رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے کیوں کہ اس صورت میں عورت کے دودھ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

رضاعت کے ثابت ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ دودھ بچے کے معدہ یا دماغ میں پہنچ جائے، چاہے کان کے راستے سے ہی کیوں نہ ہو، اس میں اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے کہ بچہ دودھ پینے کے بعد قئے کرلے، کیوں کہ دودھ اس کے معدہ میں پہنچ چکا ہے، اگر دودھ معدہ یا دماغ میں نہ پہنچے تو اس سے شرعی حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے، مثلاً بچہ کے معدہ کے اوپر موجود زخم پر دودھ انڈیلا جائے یا بچہ کی پچھلی شرمگاہ سے دودھ دُبر کے حلقہ میں ڈالا جائے تو یہ رضاعت کے حکم میں نہیں ہوگا۔

رضاعت کا شرعی حکم ثابت ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ بچہ کی عمر پانچویں مرتبہ دودھ پیتے وقت دو سال سے کم ہو، اگر یہ شک ہوجائے کہ بچے نے پانچویں مرتبہ دودھ دو سال مکمل ہونے سے پہلے پیا ہے یا اس کے بعد تو اس سے رضاعت کا شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے، امام بیہقی وغیرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''رضاعت صرف اسی وقت ہے جب دو سال کے اندر ہو''۔ (''سنن الدارقطنی'' ۴/۱۷۴، ''السنن الکبری'' بیہقی ۷/۴۶۲ یہ روایت ابن عباسؓ سے ہے)

یہ بھی شرط ہے کہ جس بچے کو دودھ پلایا جائے وہ زندہ ہو اور اس کے حواس یعنی بصارت، سماعت اور حرکات وغیرہ بحال ہوں، اگر مردہ بچہ کو دودھ پلایا جائے تو اس سے رضاعت کا شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے کیوں کہ یہ زندہ بچے کی غذا ہے، اسی طرح اس بچے کو بھی پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی جو ذبح کیے ہوئے جانور کی حرکت تک پہنچ گیا ہو، کیوں کہ اس کا حکم مردہ کا ہے۔

یہ بھی شرط ہے کہ عورت کی زندگی میں رضاعت مکمل ہو اور اس عورت میں مستقل زندگی پائی جائے، رضاعت کے دوران اس کی بصارت، سماعت اور حرکات وسکنات کام کر رہے ہوں، اگر کوئی بچہ مردہ عورت کا دودھ پیئے تو اس رضاعت کا اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ دودھ مردہ جسم سے نکلا ہوا ہے جس کے لیے نہ حرمت ہے اور نہ حلت، اسی طرح جانور کا بھی

دودھ ہے جس سے نہ رضاعت کی حلت ثابت ہوتی ہے اور نہ حرمت، اگر ایسی عورت کا دودھ پیئے جس میں مرنے سے پہلے ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح حرکت ہو تو اس کے دودھ کا حکم مردہ کے دودھ کے حکم کی طرح ہے۔

یہ بھی شرط ہے کہ پانچ مرتبہ یقینی طور پر دودھ پلایا جائے، اگر تعداد پانچ مرتبہ سے کم ہو تو رضاعت کا شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے، اس وقت بھی رضاعت کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب اس بارے میں شک ہو کہ پانچ مرتبہ پیا ہے یا اس سے کم مرتبہ؛ کیوں کہ شک سے حکم ساقط ہوجاتا ہے، صحیح مسلم میں سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: قرآن میں نازل کردہ آیتوں میں سے یہ بھی ہے ''عَشْرُ رَضُعَاتٍ مَّعْلُوْمَاتٍ یُحَرِّمْنَ'' پھر ان کو منسوخ کرکے پانچ معلوم رضاعت کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس کو قرآن میں پڑھا جاتا تھا۔ (صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب التحریم بخمس رضاعات ۱۴۵۲)

بچے کے دودھ کو عرف سے منضبط کیا جائے گا، کیوں کہ شریعت نے دودھ پیتے بچے کے لیے آسودگی کی حد بیان نہیں کی ہے، اسی طرح لغت میں آسودہ کرنے والی رضاعت کی مقدار متعین نہیں ہے، اگر دودھ پیتا بچہ دودھ پیتے ہوئے تھن کو چھوڑ دے۔ یا دودھ پلانے والی بچہ کو الگ کردے۔ پھر وہ بچہ دوبارہ دودھ پینے لگے تو یہ رضاعت متعدد بار شمار ہوگی چاہے بچہ فوراً دوبارہ پینے لگے یا تھوڑی دیر بعد۔

اگر بچہ کھیلنے کے لیے یا سانس لینے کے لیے چھوڑ دے اور فوراً پینے لگے۔ یا ایک تھن سے دوسرے تھن کی طرف منتقل ہوجائے تو یہ ایک ہی مرتبہ پینا شمار ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں وہ کھانا کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھنے والے کی طرح ہوگا جو ایک کھانے سے دوسرے کھانے کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے یا وہ کبھی گفتگو کرنے کے لیے کھانا روک دیتا ہے، پھر وہ دوبارہ کھانے لگتا ہے، اس وجہ سے وہ ایک مرتبہ کھانے کے بجائے دو مرتبہ کھانے والا نہیں ہوگا۔

دودھ پینے والے بچہ پر جس طرح رضاعی ماں کے رشتے دار حرام ہوجاتے ہیں اسی طرح دودھ والے (دودھ پلانے والی عورت کے شوہر) کے بھی رشتہ دار حرام ہوجاتے

ہیں: یہ دودھ پلانے والی عورت کا شوہر، اس کے بچے، بیٹیاں اور بہنیں ہیں، اور اس کے دوسرے شوہر سے ہونے والی بیٹیاں اور بیٹے بھی محرم بن جاتے ہیں، اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کے قریبی رشتے دار بھی اس بچے کے لیے حرام بن جاتے ہیں، یہ حرمت اس بچے کے لیے ہے جس نے پانچ مرتبہ دودھ پیا ہو، رضاعت سے محرم بننے والے ہر ایک شخص کا تذکرہ ''الفلاح بالنکاح'' کتاب میں موجود ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۱۱/۳۵۷)

دودھ پلانے والی عورت اپنا دودھ پینے والے بچے کے لیے ماں کے حکم میں ہوجاتی ہے، اور اس کا شوہر رضاعت کی وجہ سے اس کا رضاعی باپ بن جاتا ہے، رضاعی ماں کے والد اور والدہ نانا اور نانی کے درجہ میں ہوجاتے ہیں، رضاعی ماں کے بیٹے اور بیٹیاں اس بچے کے بھائی بہن بن جاتے ہیں، رضاعی ماں کے بھائی بہن اس بچے کے ماموں اور خالہ بن جاتے ہیں، دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کا باپ بچے کا دادا بن جاتا ہے، شوہر کا بھائی چچا بن جاتا ہے، اسی طرح دوسرے رشتے دار بھی۔

اس سے لعان کیا ہوا بچہ اور زنا کی اولاد مستثنی ہے اور وہ بھی جس کے باپ کے بارے معلوم ہی نہ ہو کہ کون ہے؛ اگر کوئی بچہ ایسی عورت کا دودھ پئے جس سے اس کے شوہر نے لعان کیا ہو تو یہ بچہ اس کے شوہر، اس کے بچوں اور رشتے داروں کے لیے محرم نہیں بنتا ہے، کیوں کہ لعان سے اس بچے اور اپنی بیوی پر لعان کرنے والے شوہر کے درمیان نسب منقطع ہوجاتا ہے، اسی کی بنیاد پر اس عورت کے شوہر یا اس کے رشتے داروں کے ساتھ اس بچے کا کوئی بھی رابطہ نہیں رہتا ہے، یہی مسئلہ اس بچہ کا بھی ہے جو ایسی عورت کا دودھ پئے جس کا زنا کا بچہ موجود ہو، اس دودھ پیتے بچے اور زانی کے رشتے داروں کے درمیان کوئی بھی تعلق نہیں ہے، اسی طرح اس صورت میں بھی جب اس بچے کے باپ کے بارے میں معلوم نہ ہو تو اس نامعلوم باپ اور اس کی ماں کا دودھ پینے والے بچے کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت سے اس کے شوہر نے لعان کیا ہو تو اس عورت پر

صرف اس کا بچہ حرام ہوتا ہے اور وہ جس نے اس کا دودھ پیا ہو، اور وہ بچہ اس عورت کے رشتہ داروں پر حرام ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ لعان کیا ہوا بچہ اور ولدِ زنا کا نسب ماں سے جوڑا جاتا ہے اور ان دونوں کی باپ سے نفی ہوجاتی ہے جیسا کہ اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں، (مسئلہ کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے "الحاوی الکبیر" (۸/۱۶۳)) یہی حکم ولدِ زنا پر بھی منطبق ہوجاتا ہے جس کی شرعی حرمت صرف اس کی ماں اور ماں کے رشتہ داروں تک ہی محدود رہتی ہے۔ (کیوں کہ اس کے عصبہ اس کی ماں کے عصبہ بنتے ہیں جب کہ اس بارے میں اختلاف بھی گذر چکا ہے) یہ حکم اس بچہ پر بھی منطبق ہوتا ہے جس کے باپ کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ اس لیے اس کی حرمت، اس کے بھائی بہنوں کی رضاعت میں حرمت صرف اس کی ماں اور ماں کے رشتہ داروں تک ہی محدود ہوجاتی ہے۔

جس کی پانچ بیٹیاں ہوں یا پانچ بیویاں ہوں (چار بیویاں اور ایک ام ولد) وہ پانچوں ایک بچہ کو دودھ پلائے۔ مثلاً کسی شخص کی پانچ بیٹیاں ہوں، یا چار بیویاں اور ایک ام ولد، وہ سب بچہ کو ایک ایک مرتبہ دودھ پلائے تو یہ سب آخری مرتبہ دودھ پلانے کی صورت میں اس بچہ پر حرام ہوجاتی ہیں کیوں کہ وہ سب اس کے باپ کی بیویاں اور ام ولد ہیں، البتہ یہ سب عورتیں ماں نہیں بنیں گی کیوں کہ انھوں نے بچے کو پانچ مرتبہ دودھ نہیں پلایا ہے، سوائے پہلی شکل کے یعنی جس کو پانچ بہنوں نے دودھ پلایا ہو، اس لیے کہ وہ عورتیں اس صورت میں اس پر حرام نہیں ہوتی ہیں کیوں کہ وہ اس شخص کا بیٹا نہیں ہے۔

۱۔ یعنی جس کو پانچ بیٹیاں ہوں اور ان میں سے ہر ایک بیٹی بچے کو ایک ایک مرتبہ دودھ پلائے تو یہ بچہ ان میں سے کسی کا بھی رضاعی بیٹا نہیں ہوتا ہے اور ان کا باپ اس بچے کا رضاعی نانا نہیں ہوتا ہے، اس طرح کی رضاعت سے رضاعی باپ کا حکم اس کے لیے ثابت نہیں ہوتا ہے اور بچے کے لیے رضاعی ماں کا بھی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ جس کی پانچ باندیاں ہوں اور وہ سب ام ولد ہوں اور ان میں سے ہر ایک بچے کو ایک مرتبہ دودھ پلائے تو یہ باندیاں اس بچے پر حرام ہوجاتی ہیں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ

دودھ پلانے کی وجہ سے مائیں بنتی ہیں، بلکہ وہ حرام اس لیے ہوجائیں گی کہ وہ اس کے رضاعی باپ کی ام ولد ہیں، کیوں کہ ان میں سے کسی نے بھی اس بچہ کو پانچ مرتبہ دودھ نہیں پلایا ہے، البتہ دودھ والا یعنی ان باندیوں کا مالک اس بچے کا رضاعی باپ بن جاتا ہے۔

۳۔ جو بچہ ایسی عورت کا دودھ پیئے جس کی اولادِ زنا ہو تو وہ اس دودھ پلانے والی عورت، اس کے رشتہ داروں کے لیے محرم بن جاتا ہے، اس طرح کی رضاعت سے دودھ پلانے والی عورت رضاعی ماں بن جاتی ہے۔

۴۔ جس رضاعت کی وجہ سے دودھ پلانے والی عورت رضاعی ماں بن جاتی ہے اور اس کا شوہر رضاعی باپ بنتا ہے، یہ وہ رضاعت ہے جس کو وہ عورت انجام دیتی ہے جس کا ایک بچہ ہو اور اس بچے کا باپ یعنی اس عورت کا شوہر ہو، اس صورت میں دودھ پلانے والی عورت کے رشتہ دار اور اس کے شوہر کے رشتہ دار اس بچے کے رضاعی رشتہ دار بن جاتے ہیں۔

اگر دودھ پیٹ میں انجکشن کے ذریعہ پہنچایا جائے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے کیوں کہ اس سے غذا حاصل نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ رگیں غذا داخل ہونے کی جگہ نہیں ہیں، اور دودھ کی نسبت دودھ والے سے اس وقت ختم ہوجاتی ہے جب اس عورت کو دوسرے شوہر سے کوئی بچہ پیدا ہوجائے، اس صورت میں دودھ دوسرے کا ہوجاتا ہے۔

دودھ والے کا تعلق دودھ سے کبھی بھی منقطع نہیں ہوتا ہے چاہے مدت کتنی بھی زیادہ ہوجائے، چاہے دودھ آنا بند ہوجائے پھر دوبارہ آئے، چاہے عورت کو طلاق ہوجائے اور وہ دوسرے شخص سے شادی کرلے، اس وقت منقطع ہوتا ہے جب اس کو دوسرے شوہر سے بچہ ہوجائے، اس وقت عورت کا دودھ اس کے دوسرے شوہر کا ہوجاتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سعید کی ایک بیٹی اس کی بیوی فاطمہ سے ہے جس بیٹی کا نام عائشہ ہے، اس صورت میں سعید دودھ والا بن جاتا ہے کیوں کہ وہ عائشہ کا والد ہے اور یہ دودھ اس کی بیٹی عائشہ کے لیے آیا ہے، اسی طرح فاطمہ کا دودھ سعید کا ہے چاہے بیس سال تک جاری رہے جب تک بیوی دوسرے سے شادی کرکے اس کو بچہ نہ ہوجائے، فاطمہ کسی

بھی بچے کو دودھ پلائے تو وہ اس بچہ کی ماں بن جاتی ہے اور اس کا شوہر اس کا رضاعی باپ بن جاتا ہے، چاہے سعید سے فاطمہ کو طلاق ہوجائے اور وہ صالح سے شادی کرلے، اس صورت میں اس عورت کے دودھ والا سعید ہی اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اس کو دوسرے شوہر صالح سے بچہ نہ ہوجائے، اس وقت تک وہ اور اس کا پہلا شوہر اس بچہ کا رضاعی باپ اور ماں ہوں گے جس کو فاطمہ دودھ پلائے۔

اگر فاطمہ کو سعید کی طرف سے طلاق ہوجائے اور وہ صالح سے شادی کرلے پھر اس کو بچہ ہوجائے اور اس کا نام سالم رکھا جائے تو سالم کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی وہ اور صالح ہر اس بچے کے رضاعی ماں اور باپ بن جائیں گے جس کو فاطمہ دودھ پلائے، کیوں کہ اس کے دودھ کا تعلق پہلے شوہر سعید کے ساتھ اس وقت منقطع ہوجاتا ہے جب نئے بچے سالم کی پیدائش ہوجاتی ہے۔

ماں کے دودھ کے سلسلے میں فقہی اصول یہ ہے کہ دودھ اس بچے کی خاطر آتا ہے جس کو عورت نے جنم دیا ہے، اس بچے کے لیے نہیں آتا ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو، کیوں کہ بچہ کو زندگی ملنے سے پہلے وہ اپنی ماں کا دودھ نہیں پیتا ہے۔

اگر بیوی عدت کے دوران شادی کرلے پھر وہ اپنا دودھ کسی بچہ کو پلائے تو یہ دودھ اس کے بچے کے تابع ہے، اس لیے وہ بچہ اس شخص کے تابع ہوگا جس کو قیافہ شناسی یا کسی دوسرے طریقہ سے اس شخص کے ساتھ ملایا گیا ہو۔

اگر بچہ ہونے کے بعد یہ عورت کسی دوسرے بچے کو دودھ پلائے تو یہ دودھ پہلے بچے کے تابع ہے یعنی اس عورت کا دودھ اس شخص کا بن جاتا ہے جس کے ساتھ بچے کا نسب قیافہ شناسی وغیرہ سے ملایا جائے۔

مثلاً فضہ کو اس کا شوہر عبید نے طلاق دی، فضہ کو گمان ہوا کہ اس کی عدت ختم ہوچکی ہے، پھر وہ خمیس سے شادی کرے اور اس شوہر سے ایک بچہ زید پیدا ہوجائے، عبید اور خمیس دونوں دعویٰ کریں کہ زید اس کا بیٹا ہے، جب قیافہ شناس بچے کو ان دونوں میں سے کسی کی طرف منسوب

کرے گا تو دودھ اس شخص کے حق میں ثابت ہوگا جس کے لیے بچے کا نسب ثابت ہوا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بچہ عبید کے طرف منسوب کیا جائے گا تو عبید دودھ والا بن جائے گا، اور فضہ اور عبید اس بچے کے رضاعی والدین ہوں گے جس کو فضہ دودھ پلائے گی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب فضہ ابراہیم نامی بچے کو دودھ پلائے تو رضاعت کی وجہ سے وہ ابراہیم کی ماں بنے گی اور عبید اس بچہ کا رضاعی باپ بن جائے گا۔

اگر فضہ اپنے پہلے شوہر سے طلاق ہونے کے چار مہینوں میں ہی دوسرے آدمی سے شادی ہونے کے بعد بچہ جنے تو اس کا دودھ بچے کے پہلے والد کا ہوگا، کیوں کہ حمل چھ مہینوں سے کم مدت میں مکمل نہیں ہوتا ہے، اور حمل کی نسبت شوہر کی طرف اس وقت کی جاسکتی ہے جب اس حمل کی پیدائش شادی کے چھ مہینوں کے بعد ہی ہو۔

نفقات یعنی اخراجات

نفقات نفقہ کی جمع ہے، اِنفاق سے مشتق ہے، اس کے معنی نکالنے کے ہیں۔ اس کا استعمال بھلائی اور خیر کے کاموں میں ہوتا ہے۔ (یہی تعریف شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں کی ہے ۲۳۱/۵) اس کی دو قسمیں ہیں:

۔ انسان خود اپنے اوپر خرچ کرے، جب اس میں اپنے اوپر خرچ کرنے کی طاقت ہو، اپنا خرچ دوسروں پر خرچ کرنے پر مقدم ہے۔ (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اپنی ذات سے ابتدا کرو پھر اس سے جس کے تم ذمہ دار ہو''۔ مسلم: کتاب الزکاۃ، باب الابتداء فی النفقۃ بالنفس ۲۳۱۰، نسائی، کتاب البیوع، باب البیع المدبر ۴۶۶۶)

۔ وہ نفقہ جو انسان پر دوسروں کے حق میں واجب ہوتا ہے۔

اس باب میں بیوی، بچوں، والدین، خادموں اور ان سے متعلق افراد کے نفقہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، نفقہ میں کھانا، لباس اور گھر وغیرہ شامل ہے۔

کسی شخص پر دوسرے کا نفقہ تین میں سے کوئی ایک سبب پائے جانے کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ (ان مباحث کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۳۲۰/۶، ''الوسیط'' غزالی ۲۰۱/۶، ''مغنی المحتاج'' شربینی ۲۳۱/۵، ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۴۱۴/۱۱)

پہلا سبب: نسب، اس میں ماں، باپ، باپ کی بیوی، اولاد کا نفقہ ہے۔ یعنی اپنے اصول کا نفقہ یعنی والدین اور جس کا نفقہ ان کے واسطوں سے واجب ہوتا ہے، یعنی بیٹے پر اپنے والدین کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح اپنی پھوپی اور خالہ کا بھی نفقہ واجب ہو جاتا ہے اگر وہ ضرورت مند ہوں اور ان پر خرچ کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ فروع کے نفقہ میں بیٹا اور بیٹی داخل ہیں، اسی طرح پوتا اور پوتی بھی، اگر وہ ضرورت مند ہوں اور ان پر خرچ کرنے

والا کوئی بھی نہ ہو۔

دوسرا سبب: نکاح، نکاح کی وجہ سے بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے، البتہ شوہر کا نفقہ بیوی پر ضروری نہیں ہوتا کیوں کہ اس کو نکلنا اور کمانا ممنوع ہے۔

تیسرا سبب: ملکیت، اس میں غلام اور باندی ہیں، ان کا نفقہ مالک کے ذمے ہے۔

قرآن کریم میں ماں باپ کے نفقہ کا حکم اس آیت کریمہ میں ہے: ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا'' (لقمان۱۵) (اوران کے ساتھ دنیا میں بہترین سلوک کرو) معروف یعنی بھلائی میں نفقہ بھی شامل ہے۔

بیوی کے نفقہ کی وضاحت اس فرمان الٰہی میں ہے: ''فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' (طلاق۶) (پس اگر وہ (عورتیں) تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دیجئے) جب اللہ نے دودھ پلانے کی اجرت فرض کردی ہے تو اس کا نفقہ بدرجہ اولی واجب ہے۔

والدین کا نفقہ واجب ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ خرچ کرنے والے کے پاس اپنے، اپنی بیوی، اپنے خادم، اپنی بیوی کے خادم، اگر ام ولد ہے تو اس کے نفقہ سے زائد مال موجود ہو، یہاں زائد سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی اور مذکورہ لوگوں کی ایک دن کی غذا سے زائد مال موجود ہو، اگر اس کے پاس ایک دن اور رات کے اخراجات سے کم مال ہو تو اس پر والدین کا نفقہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں اس کے پاس دوسروں پر خرچ کرنے کا اہل بنانے والی صلاحیت نہیں ہے۔

اگر والدین اور دادا وغیرہ اصول کے پاس اپنی ضرورت کی چیزیں موجود ہوں تو بیٹے پر ان کا نفقہ واجب نہیں ہے، اگر والد اپنی ضرورت بھر کمائی کرتا ہو تو پھر بیٹے پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے، اگر باپ کی اتنی کمائی نہ ہو کہ خود اس کے لیے کافی ہوتا ہو تو اس کی اولاد پر اس کا نفقہ واجب ہے، بیٹے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کو کام کرنے پر مجبور کرے، اگر بیٹا کام کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور کام نہ کررہا ہو تو اس صورت میں باپ پر اس کا نفقہ ضروری نہیں ہے بلکہ بیٹے پر کام کرنا ضروری ہے۔

بیوی کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب وہ خود کو مکمل طور پر شوہر کے حوالہ کرے۔ (یہ امام شافعی کا قولِ جدید ہے اور بغوی وغیرہ نے اس کو صحیح کہا ہے، قولِ قدیم یہ ہے کہ نکاح ہوتے ہی نفقہ واجب ہوجاتا ہے اور خود کو حوالہ کرنے سے پائدار بن جاتا ہے۔ شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں اس کا تعاقب کیا ہے ۵/۲۴۶، اس کا مطالعہ ضرور کیا جائے، یہ بڑی مفید بات ہے) اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ'' (نساء۱۹) (اوران کے ساتھ بھلائی سے زندگی گزارو) صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کھاؤ تو اس کو کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اس کو پہناؤ'' ابوداود وغیرہ نے یہ روایت کی ہے۔ (ابوداود: کتاب النکاح، باب فی حق المرأۃ علی زوجھا ۱۸۴۳، مسند احمد میں یہ روایت حکیم بن معاویہ قشیری سے ہے ۲۰۰۱۳)

شوہر کے ذمہ اپنی بیوی کے خادم کا بھی نفقہ ہے اگر وہ ایسی گھر کی ہو جہاں اس کی خدمت کی جاتی ہو یا بیماری و کمزوری کی وجہ سے اس کو خدمت کی ضرورت ہو، بیوی کے لیے خادمہ رکھنا حسنِ معاشرت میں شامل ہے۔

شوہر پر معتدہ (طلاق کی وجہ سے عدت گزارنے والی بیوی) کا نفقہ واجب ہے چاہے وہ آزاد ہو یا باندی، وہ حاملہ ہو یا نہ ہو، یہ اس صورت میں ہے جب وہ اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے تا کہ اس پر شوہر کا کنٹرول باقی رہے۔ یا طلاقِ بائن دے اور وہ حاملہ ہو۔ وفات کی عدت گزار رہی ہو تو نفقہ نہیں ہے۔

معتدہ کے نفقہ کی مقدار بیوی کے نفقہ کی طرح ہی ہے، اس میں پانی اور صابون کی قیمت داخل نہیں ہے، کیوں کہ وہ معتدہ سے لطف اندوز نہیں ہو رہا ہے، طلاق رجعی کی عدت میں نفقہ واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شوہر کو عدت ختم ہونے سے پہلے اس سے جب چاہے رجوع کرنے کا حق ہے۔

اگر طلاقِ بائن دی گئی ہو یا اپنے شوہر سے خلع لے تو ان صورتوں میں صرف حاملہ ہونے کی صورت میں بیوی کو نفقہ کا حق ہے۔

بیوی وفات کی عدت میں ہو تو اس کے لیے نفقہ کا حق نہیں ہے چاہے وہ حاملہ ہی کیوں

نہ ہو، اسی طرح وطی شبہ کی عدت گزارنے والی کے لیے بھی نفقہ نہیں ہے یا عقدِ نکاح کے بعد ہوئے فسخ کی عدت میں بھی نفقہ نہیں ہے، مثلاً شوہر میں کوئی عیب ہو جس کی وجہ سے فسخ ہو جائے، مثلاً شادی کے وقت کہا جائے کہ وہ آزاد ہے۔ پھر معلوم ہو جائے کہ وہ باندی ہے تو ان تمام صورتوں میں شوہر پر نفقہ نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ وفات کی صورت میں، وطی شبہ اور عقد نکاح کے بعد عیب کی وجہ سے فسخ کی عدت میں نفقہ نہیں ہے چاہے وہ حاملہ ہی کیوں نہ ہو۔

طلاقِ رجعی کی عدت میں نفقہ واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عدت کے دوران بیوی کے حکم میں ہی رہتی ہے، طلاقِ بائن کی وجہ سے عدت گزانے والی حاملہ کا نفقہ اس آیت کریمہ کی وجہ سے ہے: ''وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' (طلاق ۶) اور اگر وہ حاملہ ہیں تو ان پر خرچ کرو، یہاں تک کہ وہ بچہ جن لیں۔

وفات کی عدت گزارنے والی عورت کے لیے نفقہ نہ ہونے کی وجہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے: ''اس حاملہ کے لیے نفقہ نہیں ہے جس کے شوہر کی وفات ہوئی ہو''۔ (دار قطنی: کتاب الطلاق والخلع ۴/۲۱، ''السنن الکبری'' بیہقی ۷/۴۳۰، یہ روایت جابرؓ سے ہے)

وطی شبہ کی وجہ سے عدت گزارنے والی کا نفقہ اس لیے واجب نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان کبھی رشتہ ازدواج قائم ہی نہیں ہوا ہے، اسی طرح عیب کی بنیاد پر فسخ کی صورت میں بھی نفقہ نہیں ہے کیوں کہ فسخ کی وجہ سے نکاح ختم ہو چکا ہے۔

غلام اور باندی کا نفقہ واجب ہے، صرف مکاتب غلام اس سے مستثنیٰ ہے جس نے خود کو اپنے آقا سے خرید لیا ہو، کیوں کہ مکاتب کو آزادی رہتی ہے، اس حکم میں انسان اور حیوان دونوں شامل ہیں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''غلام باندی کے لیے اس کا کھانا اور کپڑا ہے''۔ (مسلم: کتاب الایمان، باب اطعام المملوک مما یاکل ۱۶۶۲، مسند احمد ۷۳۶۴، ابن حبان ۴۳۱۳، یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ہے) غلام سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لینا حرام ہے، اسی طرح بھوکا رکھنا بھی حرام ہے، اگر اس کے پاس غلام کو کھلانے کے لیے کچھ نہ ہو تو اس کو بیچنا

واجب ہے تا کہ اس پر عذاب نہ ڈھایا جائے، اگر ایسا جانور ہو جس کا گوشت کھانا شریعت میں جائز ہو تو اس کو کھلانے کے لیے کچھ نہ ہونے کی صورت میں ذبح کرنا واجب ہے۔

اگر مالک اس کو نہ کھلائے اور نہ ذبح کرے اور بیچنے سے بھی انکار کر دے تو حاکم کو اختیار ہے کہ جانور کی مصلحت دیکھ کر فیصلہ کرے مثلاً وہ اس کھلانے یا ایسے شخص کو اجرت پر دینے کے لیے مجبور کرے جو اس کو کھلائے، یا اس کو بیچ دے، کیوں کہ اپنی ملکیت میں موجود انسانوں اور حیوانوں کا خیال رکھنا اللہ نے واجب کیا ہے۔

حدیث میں ان سبھی امور کے متعلق رہنمائی کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک پر واجب کیا ہے کہ جس کو کھلانے سے عاجز ہو تو اس کو بیچ دے چاہے وہ غلام ہو یا حیوان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی مخلوقات کو تکلیف دینے سے منع کیا ہے، اور ان کو عذاب میں مبتلا نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

دودھ دوہتے وقت جانور کے بچے کے لیے دودھ چھوڑ کر دودھ دوھ لے تا کہ بچہ اپنی ماں کا دودھ پہلے پیئے، اسی طرح دودھ دوہنے والے پر واجب ہے کہ وہ اپنے ناخن تراشے تا کہ جانور کو تکلیف نہ ہو، دنبہ کا اون کاٹنے والے پر یہ ضروری ہے کہ جڑ سے نہ کاٹے تا کہ حیوان کو اون کاٹنے سے تکلیف نہ ہو، شہد کے چھتّوں سے شہد نکالنے والے پر ضروری ہے کہ چھتے میں اتنا شہد چھوڑ دے جو مکھیوں کی غذا کے لیے کافی ہو۔ ریشم کے کیڑوں کو پالنے والے پر ضروری ہے کہ وہ ان کی غذا یعنی شہتوت کے پتے مہیا کرائے، اسی طرح کسان پر اپنی کھیتی کی دیکھ ریکھ کرنا ضروری ہے اور کھیتی کو پانی سے محروم رکھنا حرام ہے۔

اسی طرح اپنی ملکیت کی عمارتوں کو حفاظتی انتظامات کے بغیر چھوڑنا مکروہ ہے، کیوں کہ اس میں مال کا ضیاع ہے، جب کہ اسلام نے مال ضائع کرنے کو حرام کیا ہے، اسی طرح انسان یا حیوان کی مدد نہ کرنا بھی حرام ہے، اسی طرح منقولہ مال کو سمندر میں ڈالنا حرام ہے، اگر اس مال کی وجہ سے انسان یا حیوان کی زندگی کو خطرہ ہے تو مال کو سمندر میں ڈالنا جائز ہے۔

عمارتوں اور بلڈنگوں کی تعمیر کرنا جائز ہے، اگر تکبر اور فخر و مباہات کے لیے ہو تو جائز

نہیں ہے، اگر مصلحت ہوتو بڑی عمارتیں تعمیر کرنا جائز ہے، تکبر کے ارادے سے جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''مسلمان کو ہر چیز میں اجر دیا جاتا ہے سوائے مٹی میں خرچ کرنے میں''۔ (مسند احمد ۲۱۶۳، طبرانی ''المعجم الکبیر'' ۳۵۵۱، بیہقی ''السنن الکبری'' ۳/۷۷ ۳۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۲۹۹۹، یہ روایت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے ہے) یہاں مٹی گارہ سے مراد بغیر ضرورت اور فخر ومباہات کے لیے عمارتیں تعمیر کرنا ہے۔

فقہاء نے بیوی کے نفقہ میں مالدار، متوسط اور تنگ دست یعنی فقیر کے درمیان فرق کیا ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کا کہنا ہے: ''آزاد مالدار پر اپنی بیوی کا نفقہ دو مد ہے، اور اس کے خادم کا نفقہ ایک مد اور ایک تہائی مد ہے، متوسط آزاد مالدار پر بیوی کا نفقہ ڈیڑھ مد ہے اور اس کے خادم کا ایک مد ہے، تنگ دست پر اور غلام پر، چاہے وہ غلام مبعض (یعنی تھوڑا آزاد اور تھوڑا غلام) مالدار ہی کیوں نہ ہو، بیوی کا نفقہ ایک مد ہے اور اس کے خادم کا ایک مد ہے''۔ (یہ امام نووی کی عبارت ہے ''المنہاج'' دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۵/۲۳۲)۔ مالدار متوسط اور غریب کے نفقہ کے درمیان فرق کرنے کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے: ''لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ'' (طلاق ۷) (اور وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے) نفقہ میں لوگوں کی عام غذا کا اعتبار ہوگا یعنی جو غذا لوگ پورے سال میں اکثر ایام استعمال کرتے ہوں، نفقہ میں شوہر کی غذا کا اعتبار ہوگا۔

فقہاء نے کہا ہے: جس کی آمدنی اس کے اخراجات سے زائد ہوتو وہ مالدار شمار ہوگا اور جس کی آمدنی اس کے اخراجات کے برابر ہوتو وہ متوسط ہے، جس کی آمدنی اس کے اخراجات سے کم ہوتو فقہاء نے اس کو تنگدست کہا ہے۔ (یہ تفریق بغوی نے اپنے شیخ قاضی حسین سے ''التہذیب'' میں نقل کی ہے ۶/۳۳۳)

نفقہ کی قدرت کے اعتبار سے شوہر کے حال کا ہر دن طلوعِ فجر سے اعتبار ہوگا، اگر وہ اس کے بعد مالدار یا تنگدوست ہوجائے تو اس دن کے نفقہ میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

جس کے پاس اپنی بیوی کا نفقہ نہ ہو، اور اس کا بیٹا اور بیٹی ہوں تو اس کا نفقہ بیٹے اور بیٹی پر برابر برابر تقسیم کیا جائے گا، اس لیے بیٹا اپنے والد کا آدھا نفقہ دے گا اور بیٹی باقی

آدھا، کیوں کہ نفقہ وراثت کے حساب سے نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنا دونوں پر برابر برابر ضروری ہے۔

کوئی فقیر ہو اور اس کا باپ اور بیٹا مالدار ہوں تو اس کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوجاتا ہے، اس صورت میں بیٹا ہو یا بیٹی دونوں کا حکم یکساں ہے، کیوں کہ اس کا نفقہ فرع یعنی بچوں پر واجب ہوتا ہے۔

جس کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس کا سالن، کپڑا اور گھر اور اس کے متعلقات بھی واجب ہوجاتے ہیں، سالن سے مراد لوگوں کی عمومی غذا ہے یعنی روٹی، گوشت کا سالن، مکھن، مچھلی، چاول، گھی، شکر، چائے، سبزی اور پھل وغیرہ، یہ علاقے کے عرف اور شوہر کی صلاحیت پر موقوف ہے، لباس گرمی اور ٹھنڈی کے مناسب دیا جائے، گھر شوہر کے حالات کے موافق ہو اور اس میں بیوی کی سبھی ضرورت کی چیزیں ہوں یعنی پکانے کے ساز وسامان، ایندھن، بیوی کے مناسب پردے یعنی شوہر کی قدرت کے مطابق آرام دہ زندگی مہیا کی جائے۔

عقل مند وہ ہے جو اپنی بیوی بچوں اور والدین پر خرچ کرنے میں اللہ کی رضا مندی تلاش کرے، اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرنے میں بخل اور کنجوسی کرے اور ان کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ذلیل بنا کر چھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو بالکل سچ کہا: ''تم اپنے وارثین کو مالدار چھوڑو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ فقیر چھوڑ دو کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں''۔ (بخاری: کتاب النفقات، باب فضل النفقۃ علی الاھل ۵۳۵۴، مسلم: کتاب الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث ۱۶۲۸، مسند احمد ۱۴۸۸، مسند ابی یعلی ۷۴۷)

عظیم شاعر سعدی شیرازی نے زبانِ فارسی میں ایک خوبصورت شعر کہا ہے جس میں اخراجات میں اعتدال کی اور اسراف یا بخل سے باز رہنے کی ترغیب دی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اتنا نہ کھاؤ کہ کھانا منہ سے واپس آجائے اور اس حد تک بھوکے نہ رہو کہ بھوک کی وجہ سے روح نکل جائے۔

یہ بھی کہا ہے: دو لوگ حسرت سے مرے: جس کے پاس کھانا موجود ہو اور نہ کھائے،

جس کے پاس قدرت ہواور نہ کرے۔ یہ بات حکمت کی ہے: ''جس کی روٹی نہ کھائی جائے تواس کی موت کے وقت اس کا نام نہیں لیا جاتا''۔

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر ختم کرتے ہیں: ''آدمی کے گنہ گار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی کفالت میں موجود لوگوں کو ضائع کردے''۔ (مستدرک حاکم: کتاب الفتن والملاحم ۸۶۰۲، صحیح ابن حبان ۴۲۴۱، ''مسند البز ار'' ۲۴۱۵، یہ حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ہے)

وقت گزرنے سے نفقہ ساقط ہوجاتا ہے، صرف بیوی اور اس کے خادم کا نفقہ شوہر پر قرض رہتا ہے، بیوی کا نفقہ خود کو شوہر کے حوالے کرنے کے مقابلہ میں ہے یعنی اس سے لطف اندوز ہونے کی وجہ سے، بیوی کی طرف سے اطاعت وفرمانبرداری اس کا بدل ہے، اس لیے قرض کے طور پر باقی رہتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم

حضانت یعنی پرورش

اس باب کا موضوع بچے کی دیکھ ریکھ، اس کے امور ومسائل کی انجام دہی، اس کو کھلانے پلانے اور اس کی صحت کی حفاظت ہے۔

ماں اپنے شوہر سے اس کے بچے کی دیکھ ریکھ اور اس کو دودھ پلانے کی اجرت مانگ سکتی ہے، جو ماں اجرت کے بغیر اپنے بچے کی دیکھ ریکھ کرتی ہے اس کو اس عورت پر مقدم رکھا جائے گا جو بچے کی دیکھ ریکھ اور اس کو دودھ پلانے کی اجرت طلب کررہی ہو، اگر بچے کی حضانت اور اس کو دودھ پلانے میں ماں کی صلاحیت کے بارے میں شک ہوتو بچہ ماں کے حوالہ نہیں کیا جائے گا جب تک کہ حاکم کے سامنے ماں کی یہ صلاحیت ثابت نہ ہوجائے کہ وہ یہ ذمہ داری پوری کرسکتی ہے۔

اگر باپ کے رشتے داروں میں بچے کی پرورش کے لیے اجرت کے بغیر صلاحیت والی عورت پائی جائے تو اس کو اجرت مانگنے والی ماں پر مقدم کیا جائے گا، اسلام جس کا مقصد امت مسلمہ کے لیے ہر میدان میں خوش بختی اور سعادت کی تکمیل کرنا ہے، بچے کو اس کی ماں کے حوالہ کرنے سے منع کرتا ہے جو تربیت دینے کے لائق نہ ہو، تاکہ بچپن ہی سے امت مسلمہ کے سبھی افراد کو صحیح تربیت ملے، وہ شخص کیسے مسلمان ہوسکتا ہے جو اپنے بچوں کو ہرا یرے غیرے کے حوالہ کردے! اگر یہ بچے دشمنوں کے ہاتھوں میں تربیت پانے کے نتیجہ میں منحرف ہوجاتے ہیں اور ان کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو وہی خود اپنی اولاد کو ذبح کرنے والا ہے اور وہی خود اس کا ذمہ دار ہے، اس وقت اصلاح وتربیت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

حضانت کے لغوی معنی: یہ لفظ ''**حِضْنٌ**'' سے مشتق ہے؛ کیوں کہ پالنے والی اپنے بچے کو اپنے گود میں رکھتی ہے۔

حضن کے معنی **جنب** یعنی پہلو کے بھی ہیں، کیوں کہ پالنے والی جب اپنے بچے کو اٹھاتی ہے تو اپنے پہلو سے چپکاتی ہے۔

حضانت کی شرعی معنی: جو خود سے اپنے امور کی انجام دہی نہ کرسکتا ہو اس کی حفاظت اور تربیت کرنا، اس صورت میں دوسرے پر اس بچے کی دیکھ ریکھ اور صحیح تربیت کی ذمے داری اٹھانا ضروری ہے، اور عورتیں مردوں کے مقابلہ میں اس ذمے داری کو اٹھانے پر زیادہ قدرت اور صلاحیت رکھتی ہیں۔ (''مغنی المحتاج'' ۵/۲۷۱)

باپ، دادا، ماں کو حضانت کے لیے مقدم کیا جائے گا، اسی طرح اوپر تک یعنی نانی وغیرہ، اگر وہ پرورش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، کیوں کہ ماں میں ممتا کا طاقت ور جذبہ پایا جاتا ہے اور اس میں اپنے بچے کے لیے محبت پوشیدہ رہتی ہے، اسی میں صبر اور اپنے بچے کی دیکھ ریکھ اور ان کے ساتھ پیش آنے میں تحمل کی طاقت زیادہ رہتی ہے، اس وجہ سے بچوں کی پرورش و حضانت میں ماں کا حق باپ پر مقدم ہے جب ماں میں اس مہم کی ادائیگی کی صلاحیت کی سبھی شرطیں پائی جائیں، ممیّز ہونے تک یہ حکم ہے یعنی بچہ تمیز کی عمر کو پہنچ جائے۔

حضانت کی نو شرطیں ہیں: بالغ ہو، عاقل ہو، آزاد ہو، عادل ہو، بچہ کے شہر میں مقیم ہو، اس کا ایسا شوہر نہ ہو جس کو اس بچے کی حضانت کا حق نہ ہو یعنی بچے کے باپ کے علاوہ دوسرا کوئی شخص اس کا شوہر نہ ہو، مسلمان بچے کی حضانت کے لیے مسلمان ہو، اس کو برص کی بیماری نہ ہو اور وہ اندھا نہ ہو۔

اگر بچہ کے والد نے اس کی ماں کو طلاق دیا ہو تو حضانت میں ماں کا حق جاری رہتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس نے کسی ایسے شخص سے شادی نہ کی ہو جس کو اس بچے کی حضانت کا حق نہ ہو یا وہ بچے کے لیے اجنبی ہو۔ (اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک عورت کا اپنے بچہ کی حضانت کے سلسلہ میں اپنے شوہر سے جھگڑا ہوا تو آپ ؐ نے اس سے فرمایا: ''تم اس کی زیادہ مستحق ہو جب تک تم شادی نہ کرلو'' ابوداود: کتاب الطلاق، باب من احق بالولد ۲۲۷۶، دارقطنی: کتاب النکاح، باب المہر ۳/۳۰۵، ''السنن الکبری'' بیہقی ۸/۴-۵، یہ روایت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے ہے)

جو مسلمان بچے کی دیکھ ریکھ کر رہا ہو تو اس کا مسلمان ہونا بھی شرط ہے؛ کیوں کہ تربیت کرنے والے کے اثرات بچے پر بھی پڑتے ہیں۔

پرورش کرنے والی میں یہ بھی شرط ہے کہ وہ نفرت دلانے والے امراض سے محفوظ ہو مثلاً برص، جذام، متعدی امراض سے بھی پاک ہو، یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایسے امراض سے پاک ہو جن کی موجودگی میں بچے کی ذمے داریوں کو پورا کرنے سے عاجز ہو جائے، مثلاً اندھا پن اور ضعیفی و لاغری۔

جب ماں میں یہ شرطیں پائی جائیں تو بچے کی تربیت کی ذمے داری اس کو سونپی جائے گی اور بچہ ممیّز ہونے تک پرورش کا اس کو حق ہے، اگر ان شرطوں میں کمی پائی جائے مثلاً ماں پاگل ہو یا باندی ہو یا فاسقہ ہو یا بچے کو اپنے ساتھ دوسرے شہر لے جائے یا بچے کے لیے اجنبی کسی شخص سے شادی کرے یا وہ اہل کتاب میں سے ہو اور بچہ مسلمان ہو، یا اس کو متعدی بیماری ہو یا وہ اندھی ہو تو اس کو حضانت و پرورش کا حق نہیں ہے۔

اگر ماں باپ میں جدائی ہو اور دونوں میں تربیت کی صلاحیت ہو تو بچے کو ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔

یعنی جب بچہ سن تمیز کو پہنچ جائے تو اس کو انتخاب کا اختیار دیا جائے گا، وہ ماں اور باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا، یہ اس صورت میں ہے جب والدین علحیدہ ہو جائیں اور دونوں میں تربیت کی اہلیت پائی جاتی ہو، یا باپ اور ماں علحیدہ نہ ہوں لیکن باپ ماں کے پاس بہت کم رہتا ہو۔

اگر باپ اور ماں میں بچے کی تربیت کی صلاحیت نہ ہو تو اس کی تربیت کا حق بچے کے دوسرے رشتے داروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اگر ماں میں صلاحیت نہ ہو تو نانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اگر باپ میں صلاحیت نہ ہو تو دادا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

ماں اور باپ میں سے کسی کو اختیار کرنے کی دلیل یہ روایت ہے جس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو اپنے باپ اور ماں

میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا۔ (ترمذی: کتاب الطلاق، باب تخییر الصبی بین ابویہ ۲۳۵۱، ابن ماجہ: کتاب الاحکام، باب تخییر الصبی بین ابویہ ۲۳۵۲، ابوداود: کتاب الطلاق، باب اذا اسلم احد الابوین مع من یکون الولد ۲۲۴۴) حدیث میں لفظ ''**غلام**'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی وہ بچہ ہے جو سنِ تمیز کو پہنچ چکا ہو۔

فائدہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان باپ اور مشرک ماں کے درمیان اختیار دیا تھا، تو وہ بچہ ماں کی طرف منتقل ہوا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! اس کے دل کی رہنمائی فرما''۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کی طرف پلٹ گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے، کیوں کہ مسلمان اور مشرک کے درمیان اختیار نہیں ہے، یا یہ حکم اس پر محمول ہے کہ رسول اللہ نے جان لیا تھا کہ آپ کی دعا قبول ہونے والی ہے۔ (مغنی المحتاج ۵/۲۷۵)

اس وقت ماں کو باپ پر مقدم کیا جائے گا جب ماں کی حضانت اور پرورش میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اگر ان دونوں میں ہر ایک الگ الگ شہر میں رہیں یا عورت شادی کر لے تو باپ کو مقدم کیا جائے گا۔

بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں باپ کو ماں پر مقدم کیا جائے گا کیوں کہ بچے کی پرورش کی ذمے داری اٹھانے میں بیوی کے لیے رکاوٹ رہتی ہے۔ یا ماں اور باپ الگ الگ شہروں میں رہتے ہیں، یا ماں کا شوہر ان لوگوں میں سے ہے جس کو بچے کی پرورش میں کوئی حق نہیں ہے مثلاً کوئی اجنبی شخص یا اس کی شادی کسی ایسے شخص ہو جس کو عمومی طور پر اس کی پرورش کا تو حق رہتا ہے مثلاً اس کا چچا، لیکن وہ اس بات سے انکار کر دے کہ اس کی بیوی بچے کی پرورش اور حضانت کی ذمے داری ادا کرے۔

اگر ماں اور باپ دونوں بچے کی حضانت سے باز رہیں تو ان دونوں کو اس صورت میں مجبور نہ کیا جائے جب بچہ کا نفقہ ان دونوں پر واجب نہ ہو؛ مثلاً بچہ مالدار ہو اور اس کا نفقہ اس کے مخصوص مال سے ہو، اگر بچہ فقیر ہو تو جس پر اس کا نفقہ واجب ہے اس کو پرورش کرنے پر مجبور کیا جائے گا اور اس پر خرچ کرنے پر بھی؛ جب ہم نے یہ بات کہی ہے کہ

باپ اپنے بچے کی حضانت کا زیادہ حق دار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ اپنے بچے کے اخراجات کو برداشت کرے۔

جب ماں میں حضانت کی سبھی شرطیں پائی جائیں اور کوئی بھی رکاوٹ نہ ہو تو بچے کی حضانت میں ماں کو اولیت دی جائے گی، اسی طرح اس حق میں ماں کی رشتے دار عورتوں کو باپ کی رشتے دار عورتوں پر مقدم کیا جائے گا۔

ماں کی وارث رشتے دار عورتوں کو باپ کی وارث رشتے دار عورتوں پر مقدم کیا جائے گا، اس سے اخیافی بہن مستثنی ہے، اس لیے اس پر دادی کو مقدم کیا جائے گا، اسی طرح نانی کو سبھی دادیوں پر مقدم کیا جائے گا اور خالہ کو پھوپھی پر مقدم کیا جائے گا، اس سے صرف اخیافی بہن مستثنی ہے، اس پر دادی کو مقدم کیا جائے گا، او پر تک، صرف قریبی رشتے دار عورتوں کو حضانت کا حق ہے، مردوں کو نہیں، کیوں کہ مردوں کو حضانت کا حق ہی نہیں ہے، اگر عورتیں نہ پائی جائیں تو یہ حق مردوں کو ملتا ہے۔ (''التہذیب'' بغوی ۶/۳۹۶۔ عصبہ مردوں کو حضانت کا حق ملتا ہے مثلاً باپ، دادا، بھائی اور چچا، البتہ اگر وہ حضانت سے انکار کر دیں تو ان کو مجبور نہیں کیا جائے گا، اس سے باپ اور اس کی عدم موجودگی میں دادا کو مستثنی کیا جائے گا، ان کو حضانت پر بھی مجبور کیا جائے گا اور خرچ کرنے پر بھی)

حقیقی بہن کو اولیت حاصل رہتی ہے، اس کے بعد علاتی بہن کو، کیوں کہ اس کی وراثت میں قوت پائی جاتی ہے، ان دونوں کے بعد ان قریبی رشتے دار عورتوں کا نمبر آتا ہے جو وراثت میں شریک نہ ہوں مثلاً ماں کی دادی، نواسے کی بیٹی، اخیافی چچازاد بہن۔

غیر محارم میں سے جن کو وراثت میں حق نہیں ہے ان کو بھی بچے کی حضانت میں حق رہتا ہے، مثلاً چچازاد بہن، پھوپھی زاد بہن، ماموں زاد بہن، خالہ زاد بہن، اسی وقت حق رہتا ہے جب چھوٹے بچے کی حضانت ہو۔

باپ کی غیر موجودگی میں دادا حضانت، میت کو غسل دینے اور اس کی نماز پڑھنے میں باپ کے قائم مقام رہتا ہے۔

جہاد

جہاد کے لغوی معنی: متعین مقصد تک پہنچنے کی راہ میں اپنی طاقت بھر جدو جہد اور کوشش کرنا۔
شرعی معنی: اسلام کی نشر واشاعت اور دعوت کی تبلیغ کے لیے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا۔

اللہ کی راہ میں جہاد رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے ایک سال بعد مشروع ہوا، اس کے دلائل قرآن، حدیث اور اجماع ہیں، اللہ سبحانہ وتعالی کا فرمان ہے: ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ'' (بقرہ۲۱۶) (تم پر جنگ فرض کی گئی ہے) دوسری جگہ فرمان ہے: ''وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً'' (توبہ۳۶) (اور تمام مشرکین کے خلاف جنگ کرو جس طرح وہ تم سب کے خلاف جنگ کرتے ہیں)

صحیح روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا جب تک کہ وہ یہ نہ کہہ دیں: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے''۔

(بخاری: کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ فخلوا سبیلہم ۳۵، مسلم: کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا: لا الہ الا اللہ ۵۶)

اللہ کی راہ میں جہاد کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے، جب سے مسلمانوں نے جہاد کو چھوڑ دیا ہے تو وہ ذلیل ورسوا بن گئے ہیں، جہاد صرف تلوار سے ہی نہیں ہوتا ہے، بلکہ جہاد یہ بھی ہے کہ زبان کے ذریعہ دین حق کی تبلیغ کی جائے، قلم کے ذریعہ جہاد یہ ہے کہ اس بات کی تاکید کی جائے کہ اسلام ہی دین حق ہے، اسی طرح کافروں تک اسلام پہنچانا بھی جہاد ہے۔ (دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ۱۶۷۸/۴)

ہجرت کے بعد جہاد فرض کفایہ ہے:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد اللہ کی راہ میں جہاد فرض

کفایہ ہے، فرض عین نہیں، کیوں کہ اگر جہاد ہر مسلمان پر فرض ہوتا تو لوگوں کی معیشت اور ان کی زندگی کی سبھی ضروریات معطل ہو جاتیں، اگر سبھی مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہوتا تو زراعت، کھیتی باڑی، صناعت اور تجارت وغیرہ میں کوئی مشغول نہیں رہتا، اللہ عزوجل نے سچ فرمایا ہے: ''لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' (نساء۹۵) مومنوں میں سے (جہاد سے) بیٹھے ہوئے لوگ یکساں نہیں۔

یعنی کسی عذر کے بغیر گھر میں بیٹھے رہنے والے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں، جب کہ اللہ نے جہاد کرنے والے مومنوں اور جہاد نہ کرنے والے مومنوں سبھوں کو جنت دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

فرض کفایہ جہاد اس طرح ادا ہو جاتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کافروں کی سرحدوں پر موجود قلعوں، گاؤوں اور خندقوں اور حدود کی حفاظت کے لیے بعض باصلاحیت بہادر فوجیوں کو متعین کر دے اور گورنروں کو مسلمانوں کی سرزمین اور حدود وثغور کی حفاظت کا حکم دے، اور شہروں کی تعمیر کا حکم دے، فرض کفایہ کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ امام یا اس کے نائبین اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے کفر کے شہروں میں داخل ہونے کا حکم دیں تا کہ ہمیشہ کی عزت مسلمانوں کے لیے ہو اور کفار مسلمانوں پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ کریں۔

اس وجہ سے جہاد مسلمانوں پر ہمیشہ فرض کفایہ ہے، اگر بعض مسلمان اس فریضہ کو انجام دیں تو باقی مسلمانوں سے گناہ اٹھ جاتا ہے، اگر سبھی مسلمان جہاد سے بیٹھے رہیں تو سبھی گنہگار ہو جاتے ہیں، کافروں کے خلاف جہاد مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ (''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۱۲۲/۱۴، ''التہذیب'' بغوی ۴۴۸/۷، ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۱۶۷۷/۴)

ایک صورت میں جہاد فرض عین ہوتا ہے:

اس صورت میں جہاد تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے جب کافر مسلمانوں کے کسی علاقے میں گھس جائیں، اس لیے فرض ہے کہ وہاں سے کافروں کو کدھیڑ دیا جائے۔

اس حکم میں اس علاقے کے سبھی مالدار اور فقیر، چھوٹا اور بڑا اور سب آزاد یکساں ہیں جہاں

کافر داخل ہوئے ہوں، اسی طرح اس علاقے کے آس پاس والوں پر بھی فرض عین ہے، اور خودسپردگی کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے، صرف وہی شخص خودسپردگی کرسکتا ہے جس کے پاس جنگ کے وسائل اور ہتھیار موجود نہ ہوں، یا وہ شخص جس کے پاس جنگ کرنے کی طاقت نہ ہو تو اس کو جنگ یا خودسپردگی کے درمیان اختیار ہے، عورت کو اپنی عزت پر حملہ ہونے سے امن ہو تو خودسپردگی کرسکتی ہے۔

۔حربیوں سے پہلے مرتدین سے جنگ کی جائے گی، ان سے اسلام کے علاوہ کوئی بھی چیز قبول نہیں کی جائے گی، اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ان سے جنگ کی جائے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتداد کفر کی بدترین قسم ہے، اسی وجہ سے اسلام نے مرتدین کے خلاف جہاد کو اس شرط کے ساتھ اولیت دی ہے کہ ان کو سب سے پہلے اسلام کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی جائے، اگر وہ انکار کردیں تو ان کے خلاف جنگ ہی کی جائے گی۔ کسی بھی صورت میں صلح صحیح نہیں ہے۔ (''الحاوی الکبیر'' ص۱۳/۴۴۲)

کافروں کے سامنے سب سے پہلے اسلام پیش کرنا ضروری ہے:

یہ واجب ہے کہ سب سے پہلے کافروں کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، یہ اس وقت ہے جب یہ بات معلوم ہو کہ ان کو اسلام نہیں پہنچا ہے۔ (دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۷/۴۶۲، اس کتاب میں بہت ہی مفید تفصیلات تحریر کی گئی ہیں) ان کو تین میں سے ایک کا اختیار دیا جائے گا: سب سے پہلے اسلام قبول کرکے دین میں ہمارے بھائی بننے کے لیے کہا جائے گا، اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہمارے اور ان کے حق یکساں ہوجائیں گے، اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو جزیہ دینے کا مطالبہ کیا جائے گا اور وہ اپنے دین پر ہی باقی رہیں گے مثلاً آسمانی کتابوں کے ماننے والے؛ یہود وعیسائی اور وہ لوگ جن کے پاس آسمانی کتاب ہونے کا شبہ ہے مثلاً مجوسی، اگر وہ اسلام قبول نہ کریں اور جزیہ دینے سے بھی انکار کردیں تو ان کے خلاف جنگ کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں ان کے سامنے راہ کھلی رکھی جائے کہ زمین میں بسنے والے سبھی لوگوں تک دعوتِ اسلامی پہنچائی جائے اور لوگ اسلام کو اس کی

حقیقت کے ساتھ جان جائیں، اگر لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف ہوجائیں گے اور اس بات کو جان جائیں گے کہ اسلام کی پیروی میں دنیا اور آخرت کی خوش بختی ہے تو اس کو قبول کیے بغیر نہیں رہیں گے، اگر وہ اسلام میں داخل ہونے کو قبول نہ کریں تو دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، کیوں کہ ہدایت گمراہی سے واضح ہوگئی ہے۔ ''لَا إِكْـرَاهَ فِـي الـدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (بقرہ ۲۵۶) (دین میں کوئی زور زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے واضح ہوگئی ہے) کیوں کہ حق واضح ہے اور گمراہی واضح ہے اور لوگوں کو ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار ہے، اسلام جس نے اس حقیقت کو موکد کردیا ہے وہ اس دین میں داخل ہونے والوں کی مدافعت کرتا ہے، اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ اسلام کی طرف بلانے کی آزادی دی جائے اور اس کو عام کرنے کے وسائل مہیا کیے جائیں، جو اسلام میں داخل ہونے کو قبول نہ کرے تو اسلام جزیہ کے طور پر تھوڑے سے مبلغ پر حفاظت کرنے کو مقدم کرتا ہے اور جزیہ دینے والوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

کافروں کی قسمیں

کافروں کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم: وہ کافر جو مسلمانوں کے ملک میں ذمی بن کر رہتے ہیں اور جن کو مسلمانوں نے امان دیا ہو۔ دوسری قسم: وہ کافر جن کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہو۔

۔حربیوں کے خلاف جنگ کی جائے گی، البتہ جن کے پاس آسمانی کتاب ہے یا آسمانی کتاب ہونے کا شبہ ہے مثلاً یہود ونصاری یا مجوسی اور زردشتی تو ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ اپنے دینی اعمال بجالائیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ جزیہ دیں۔

مکمل قیدی کے سلسلہ میں امام اور خلیفہ وہی فیصلہ کرے جس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ فائدہ ہو چاہے وہ قیدی بوڑھا شخص ہی ہو یا ایسا جس کی کوئی رائے نہ ہو:

مکمل قیدی وہ شخص ہے جو بالغ، عاقل اور آزاد ہو، امام کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ وہ سلوک کرے جو مسلمانوں اور اسلام کے لیے مفید ہو، چاہے یہ قیدی بہت بوڑھا ہو یا جنگی

تدابیر میں اس کی اپنی کوئی رائے بھی نہ ہو، امام کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ چار میں سے کوئی ایک معاملہ کرے: (ان امور کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے "التہذیب" بغوی ۷/۴۴۷، "عجالۃ المحتاج" ابن ملقن ۴/۱۶۹۲)

۔یا تو اس پر احسان کر کے چھوڑ دے یا ہمارے قیدیوں کے بدلے اس کو چھوڑ دے یا مال لے کر چھوڑ دے۔قتل کرے یا اس کو غلام بنائے، ان میں سے کوئی بھی برتاؤ کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی ہوجاتی ہے، جس قیدی کو مسلمان قیدی کے بدلے چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس کو مسلمان قیدی کے بدلے پیش کرتے وقت اس کافر کا حکم غلام کا ہے ۔البتہ جس قیدی کو غلام بنایا جائے تو وہ دوسرے مالِ غنیمت کی طرح مالِ غنیمت ہے۔

۔اگر خلیفہ کی سمجھ میں نہ آئے کہ مسلمان کے لیے اس قیدی کے بارے میں زیادہ مفید کیا ہے تو اس قیدی کو قید میں رکھے گا یہاں تک کہ اس کی سمجھ میں بہتر برتاؤ سمجھ میں آجائے تو اس کے مطابق کرے گا:

اس شرعی اصول کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام کو مذکورہ چار تصرفات میں سے کسی ایک تصرف کو قطعی شکل دینے میں تذبذب ہو کہ کون سا برتاؤ مسلمانوں اور اسلام کے حق میں زیادہ مفید ہے تو وہ قیدی کو جیل میں اس وقت تک رکھے گا جب تک یہ واضح ہوجائے کہ اس کے ساتھ چار میں سے کون سا برتاؤ کرنے سے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا۔ (کیوں کہ یہ فیصلہ امام کے اجتہاد پر موقوف ہے، اس کی خواہش پر نہیں، اس لیے صحیح برتاؤ کے ظاہر ہونے تک اس معاملہ کو موخر کیا جائے گا، "عجالۃ المحتاج" میں ابن ملقن نے یہ بات کہی ہے ۴/۱۶۹۲)

۔بچہ، مجنون، عورت، غلام؛ تو یہ ناقص قیدی ہیں، یہ قید ہوتے ہی غلام بن جاتے ہیں:
یعنی قیدی میں مذکورہ کمی کے اسباب میں سے کوئی سبب پایا جائے مثلاً وہ چھوٹا بچہ ہو یا پاگل ہو یا وہ عورت ہو یا مخنث ہو یا غلام ہو یا بعض غلام اور بعض آزاد ہو تو گرفتار کرتے ہی ان کو غلام بنایا جاتا ہے۔
۔ناقص پر جہاد فرض نہیں ہے، نہ کافر پر اور نہ غیر مستطیع پر۔

یعنی چھوٹے بچے، پاگل اور غلام پر جہاد فرض نہیں ہے، اسی طرح عورت اور مخنث بھی عام حالات میں جہاد نہیں کر سکتے ہیں، جس طرح کافر سے نماز کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے اسی طرح کافر پر جہاد فرض نہیں ہے، جس میں جہاد کی طاقت اور استعداد نہ ہو تو اس پر جہاد واجب نہیں ہے مثلاً اندھا اور لنگڑا، فالج زدہ، ہاتھ کٹا ہوا، اور حج کرنے سے معذور ہو مثلاً اس کے پاس جانے اور آنے کا ذریعہ نہ ہو۔

جس کے پاس ہتھیار، سواری اور اتنا مال نہ ہو کہ جو اس کے جانے اور واپس ہونے کے لیے کافی ہو تو اس پر جہاد نہیں ہے، البتہ اس کے گھر کے سامنے ہی جہاد ہو رہا ہو تو فرض ہے، اس صورت میں جانے اور واپس آنے کے اخراجات کی ضرورت نہیں ہے۔

۔جس عذر کے پائے جانے سے حج کا وجوب ختم ہوجاتا ہے، اس سے جہاد کا وجوب بھی ختم ہوجاتا ہے، اس سے صرف یہ شکل مستثنی ہے کہ راستہ میں کافروں اور چوروں کا خطرہ ہو یعنی جہاد سے پیچھے رہنے کے لیے یہ عذر مقبول نہیں ہے، کیوں کہ اسلام اپنے فرزندان کو خطرات سے کھیلنے اور جنگ وجدال سے خوف زدہ نہ ہونے کی تربیت دیتا ہے۔

۔قرض خواہ کی اجازت کا اعتبار ہوگا جس کے قرض کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اسی طرح پرخطر سفر میں والدین کی اجازت کا بھی اعتبار رہے۔

شرعی طور پر یہ واجب ہے کہ اگر کوئی جہاد میں جانا چاہ رہا ہو اور اس کے ذمے قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو تو قرض خواہ کی اجازت لی جائے، اگر سفر پرخطرناک ہو تو والدین کی موجودگی میں ان کی اجازت لینا بھی ضروری ہے، اگر سفر میں خطرہ نہ ہو تو پھر والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ (دیکھا جائے: "الوسیط" غزالی ۷/۹، "الاقناع" شربینی الخطیب ۲/۲۵۲، البتہ شرط یہ ہے کہ والدین مسلمان ہوں، اگر کوئی ایک زندہ ہو تو اس کی اجازت کے بغیر جہاد میں نہیں جاسکتا ہے) شرط یہ ہے کہ اس کے جانے سے والدین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔

باغیوں کا حکم

باغی وہ ہے جو امام یا خلیفہ عادل کے خلاف اپنی تاویل کی وجہ سے بغاوت کرے۔
(''التہذیب''بغوی ۷/۲۶۳)

باغیوں کے خلاف جنگ امام کی ذمے داری ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے خلاف جنگ کا حکم دیا اور جزیرۃ العرب سے بتوں کی عبادت کا خاتمہ کیا، ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کے خلاف جنگ کی شروعات کی اور نبوت کے دعوے داروں کا خاتمہ کیا۔ حضرت علیؓ نے باغیوں کے خلاف جنگ کی اور اس بات کو واضح کیا کہ امام حق پر ہے اور جو بھی اس کے خلاف جنگ کرے گا تو وہ باغی بن جائے گا۔

باغیوں کے خلاف جنگ کی دلیل قرآن، حدیث اور اجماع ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا، فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْئَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ'' (حجرات ۹) (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کریں تو ان کے درمیان اصلاح کرو، اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو ان کے خلاف جنگ کرو جو زیادتی کرنے والا ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف عود کر آئے) حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''عمار کا برا ہو، اس کو باغی گروہ قتل کرے گا''۔ (بخاری: کتاب الصلاۃ، ابواب استقبال القبلۃ، باب التعاون فی بناء المسجد ۴۳۸، صحیح مسلم: کتاب الفتن واشراط الساعۃ، باب لاتقوم الساعۃ حتی یمر الرجل بقبر الرجل ۵۳۰۱)

۔باغیوں کے خلاف جنگ کرنے پر امت کا اجماع ہے، چوں کہ باغیوں اور خوارج اور ڈاکوؤں کے خلاف جنگ شریعت میں مشروع ہے، اس لیے ہم ان تینوں کو ایک ہی جملہ میں جمع کر کے کہتے ہیں: مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تین قسمیں ہیں: باغی، خوارج اور ڈاکو۔

اس لیے باغی وہ جماعت ہے جو کسی تاویل کی وجہ سے امام کے اوامر ماننے سے انکار کرے۔

خوارج: بدعتیوں کی ایک جماعت ہے جو کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے، یہ لوگ علی اور معاویہ کے درمیان فیصلہ کے لیے دونوں طرف سے حکم بنائے جانے کے بعد مسلمانوں کے باغی بن گئے تھے۔

ڈاکو: جو راستے میں چھپتے ہیں اور لوگوں کا مال چھین کر ان کو قتل کر دیتے ہیں، یا لوگوں کو گھبراہٹ میں ڈالتے ہیں، وہ آبادی سے ہٹ کر چھپے رہتے ہیں تاکہ خوف کا ماحول پیدا کریں اور لوگوں کو وہاں آنے جانے سے روک دیں۔

اسی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے امام کے حکم پر ان تینوں جماعتوں کے خلاف جنگ کو مشروع کیا گیا ہے تاکہ ان کے شرور وفتن سے لوگوں کو روکا جائے اور ان پر حد قائم کی جائے۔

باغیوں کے خلاف جنگ کے طریقہ کار میں چند امور کی رعایت رکھنا ضروری ہے (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''الوسیط'' امام غزالی ۶/۴۲۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کو دھوکہ سے قتل نہ کیا جائے اور ان سے اس وقت جنگ کی جائے جب وہ مدّ مقابل ہوں، اگر وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جانے لگیں تو ان سے ہاتھ روکا جائے۔

خوارج اگر ہمارے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں یا عادل امام کے اوامر سے بغاوت کریں تو ان سے جنگ کی جائے گی، اگر وہ امام کے احکامات کے خلاف بغاوت نہ کریں اور ہمارے خلاف جنگ نہ کریں تو ان کے خلاف جنگ نہیں کی جائے گی، اگر وہ اپنی بدعت پھیلاتے ہوں تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی تاکہ ان کی بدعت لوگوں میں نہ پھیل پائے۔

ان میں کوئی زخمی ہو جائے تو اس کو مارا نہیں جائے گا، کیوں کہ شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ (حاکم نے ''مستدرک'' میں: کتاب قتال أھل البغی ۳/۱۵۵، اور بیہقی نے ''السنن الکبری'' میں: کتاب قتال أھل البغی، باب أھل البغی اذا فاؤوا ۸/۱۸۲، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعودؓ سے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ اس امت میں سے بغاوت کرنے والوں کے سلسلہ میں اللہ کا کیا حکم ہے؟ ابن مسعود نے کہا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے سلسلہ میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ ان میں سے پیٹھ پھیرنے

والوں کا پیچھا نہ کیا جائے، ان کے قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور ان کے زخمی کو مار کر ہلاک نہ کیا جائے‘‘۔ اس سند میں کوثر بن حکیم متروک الحدیث ہے جیسا کہ ذہبی نے ’’تلخیص المستدرک‘‘ میں کہا ہے ۱۵۵/۲) امام باغیوں کے خلاف اس وقت جنگ کرے گا جب ان کے پاس کسی امانت دار حکیم شخص کو بھیج کر ان سے دریافت کرے کہ ان کے بغاوت کی وجہ کیا ہے تا کہ اگر وہ کہیں کہ ان پر ظلم ہوا ہے تو ان سے ظلم کو ختم کیا جائے۔ یا آپس میں بدگمانیاں ہوئی ہوں تو امام پر ضروری ہے کہ بدگمانیاں ختم کردے، اگر وہ بغاوت پر اصرار کررہے ہوں تو حکمت اور بہترین نصیحت کے ذریعہ ان کو سمجھایا جائے اور ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کر کے دلیل وحجت کے ذریعہ ان پر غالب آجائے، اگر ان کے پاس جواب میں کوئی دلیل نہ ہو اور دوبارہ بغاوت پر اتر آئیں تو امام ان کو بتادے کہ اس کا مطلب جنگ ہے، اگر وہ مہلت مانگیں تو امام ان کے ساتھ ہر وہ کام کرے جس میں مصلحت ہو، اگر ان کے خلاف جنگ پر مجبور ہو تو جنگ کرے اور ان کا مسئلہ ختم کردے، جب جنگ ختم ہوجائے اور ان سے کسی طرح کا خوف باقی نہ رہے تو ان سے لیے ہوئے گھوڑے، ہتھیار اور مال واپس کردے جائیں، اگر دوبارہ بغاوت کا خطرہ ہو تو کچھ بھی واپس نہ کیا جائے۔

ان کی ملکیت کی چیزوں کا استعمال میں لانا جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ سب چیزیں ان کو واپس کرنا ضروری ہے، البتہ اگر ضرورت ہو تو استعمال کیا جاسکتا ہے، ان سے ان کے خلاف جنگ میں قتل ہونے والوں کو دیت دینے یا معاوضہ دینے یا ضائع شدہ ملکیت کا بدل دینے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ یہ چیزیں تو جنگ میں ہوتی ہی ہیں۔

اسلامی انصاف کتنا ہی عظیم ہے جو اپنے پیروکاروں کو عدل وانصاف کو تھامنے اور نصیحت کرنے کا حکم دیتا ہے، یہاں تک کہ باغیوں کے ساتھ بھی، جب کہ ظالموں کو جنگ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ضائع کیے ہوئے مال کا تاوان دینے کو واجب قرار دیتا ہے۔

ان کے خلاف جنگ میں یہ شرط ہے کہ ان کے پاس تاویل بھی ہو اور طاقت بھی (دیکھا جائے ’’التہذیب‘‘ ۲۷۹/۷) یعنی باغیوں اور خوارج کے سلسلہ میں یہ شرعی حکم اس شرط کے ساتھ ہے کہ ان کے پاس دلیل وحجت ہو چاہے ہمارے نزدیک ان کی دلیل باطل ہو، اور ان کے

پاس طاقت وقوت بھی پائی جائے۔

۔ورنہ وہ ڈاکوؤں کے حکم میں ہیں، یعنی اگر ان کے پاس دلیل ومنطق نہیں ہے اور ان کا کوئی قائد نہیں ہے جس کی وہ اطاعت کرتے ہوں تو ان کو ڈاکوؤں میں شمار کیا جائے گا۔

۔ڈاکوؤں کا اس وقت تک پیچھا کیا جائے گا جب تک کہ وہ منتشر ہوجائیں اور ان میں سے زخمی پر وار نہیں کیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکوؤں کا پیچھا کر کے ان کو ختم کیا جائے گا اور ان کی طاقت توڑ دی جائے گی، اس کے باوجود اگر ان میں سے کوئی زخمی ہوجائے تو اس کو مارا نہیں جائے گا بلکہ اس کا علاج کرنا ضروری ہے۔

جہاد کے میدان میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس باب میں جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کریں اور اس بات کو جان لیں کہ خون بہنے سے روکنے کے لیے کیا کرنا ان پر ضروری ہے، کیوں کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہونے والی جنگوں میں مقتولین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے، جن میں ۲۵۰ مسلمان شہید ہوئے اور ۷۵۰ کافر قتل ہوئے، جن جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے ان کو غزوات کہا جاتا ہے اور جن فوجوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ان کو ''سرایا'' کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تعداد ۲۷ ہے، جن میں صرف ۸ میں جنگ ہوئی، وہ یہ ہیں: بدر، احد، مریسیع، خندق، قریظہ، خیبر، حنین اور طائف۔

رسول اللہ کے سریوں کی تعداد ۶۸ ہے، سریہ میں ایک سو سے پانچ سو مجاہد رہتے ہیں، ''منسر'' میں ۵۰۰ سے ۸۰۰ مجاہد رہتے ہیں، جب کہ ''جحفل'' میں ۸۸۰ سے چار ہزار مجاہد رہتے ہیں، بڑی بڑی فوجوں کو خمیس کہا جاتا ہے، خمیس پانچ قسموں سے مل کر بنتا ہے: مقدمہ، میمنہ، میسرہ، قلب اور ساق۔ ہم نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ''غایة المأمول فی سیرة الرسول'' نامی کتاب لکھی ہے، جو مزید معلومات چاہتا ہے تو اس کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔

ہم نے کتاب الجہاد میں جہاد کے احکام کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ جہاد یا تو فرض کفایہ ہوتا ہے یا فرض عین، ہم یہاں جہاد کے ان احکام کو بیان کر رہے ہیں جو سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہیں۔

۔ حربی غیر حربی سے کوئی چیز لے تو وہ چیز کے مالک کو واپس کی جائے گی۔

جہاد میں مسلمانوں کو کافر جنگجوؤں سے مالِ غنیمت ملے تو مالِ غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کافر مسلمانوں کی ملکیت کی چیزوں یا مال پر قابض ہوئے ہیں یا ذمی کافروں کے مال پر، اگر کافر جنگجوؤں نے ان سے یہ مال لیا ہے اور وہ مالِ غنیمت میں موجود ہے تو سب سے پہلے ان کو یہ مال لوٹایا جائے گا پھر اس کے بعد باقی مالِ غنیمت تقسیم کیا جائے گا، اگر مالِ غنیمت تقسیم ہونے کے بعد امام کو معلوم ہوجائے کہ بعض مال غیر حربیوں کا ہے جو مالِ غنیمت کے ضمن میں تقسیم ہوا ہے تو اس پر ضروری ہے کہ غیر حربی کافروں کو ان کے مال کا معاوضہ ادا کرے۔

اگر ان مقبوضہ مالوں کی جنس کا مال موجود نہ ہو تو امام پر ضروری ہوجاتا ہے کہ دوبارہ مالِ غنیمت تقسیم کرے، اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی شریعت کو مالک کے مال کی حفاظت کی کتنا زیادہ حرص ہے۔

جو مال کافر کا سلب مانا جاتا ہے تو اس کو بھی مالِ غنیمت سے الگ کیا جائے گا اور مجاہدین میں سے کافر حربی کو قتل کرنے والے کو دیا جائے گا۔ (اس کی دلیل رسول اللہ کا یہ فرمان ہے: ''جو کسی کو قتل کردے اور اس کے پاس قتل کرنے کی دلیل ہو تو اس کے لیے اس کا سلب ہے''۔ بخاری: کتاب فرض الخمس، باب من لم تخمس الاسلاب ۳۱۴۲، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۸۰۵، یہ روایت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ہے) ہم نے مالِ غنیمت اور مالِ فئی کے باب میں سلب کا مفہوم واضح کیا ہے۔

۔ جنگجوؤں سے زبردستی یا چوری کرکے لیا ہوا یا گرا پڑا ملا مال غنیمت ہے:

مسلمان یا ذمی کافر کا لقطہ (یعنی کہیں گرا ہوا ملا مال) بھی مالِ غنیمت میں ہی شمار ہوتا ہے اگر اس کے مالک کا پتہ نہ چل پائے، اور اس کو مالِ غنیمت کے ضمن میں تقسیم کیا جائے گا، جو حربی کا مال چوری کیا جائے اس کو بھی مالِ غنیمت میں شامل کیا جائے گا، کیوں کہ جس نے حربی کا مال چرایا ہے اس نے خود کو خطرہ میں ڈالا ہے۔

۔ مالِ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، البتہ مالِ سلب قاتل کو دیا جائے گا۔

۔ مالِ غنیمت میں سے دارالحرب میں ضمانت کے بغیر کھانا جائز ہے۔

مجاہدین کے لیے مالِ غنیمت میں سے کھائی جانے والی چیزیں دار الحرب میں قیام کے دوران وہاں پہنچنے تک کھانا جائز ہے جہاں حربی کافروں کا تسلط نہ ہو، حدیث شریف میں ہے کہ عبداللہ بن ابواوفی نے کہا: ''ہمیں رسول اللہ کی معیت میں جنگ میں کھانا ملا تو ہم میں سے ہر ایک اپنی ضرورت بھرلیا''۔ اس حدیث کو ابوداود اور حاکم نے روایت کیا ہے، حاکم نے کہا ہے کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ (ابوداود: کتاب الجہاد، باب فی النہی اذا کان فی الطعام قلة ۲۷۰۳، ''مستدرک علی الصحیحین'' حاکم: کتاب الجہاد ۲۵۱۱)

مجاہدین مالِ غنیمت میں موجو گھاس اور چارہ اپنے جانوروں کو بھی کھلا سکتے ہیں، اسی طرح اپنی گاڑیوں کے لیے ایندھن بھی لے سکتے ہیں، اسی طرح مالِ غنیمت سے اپنے کھانے کے لیے جانوروں کو بھی خرید سکتے ہیں، لیکن مالِ غنیمت کے گھوڑوں پر سواری کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے، اسی طرح مالِ غنیمت کے کپڑوں کو پہننا بھی جائز نہیں ہے، مالِ غنیمت میں سے کھانے کا مطلب وہ روزی ہے جو بقدرِ کفاف ہو، اس میں دوسری ضرورت کی چیزیں داخل نہیں ہیں مثلاً شکر، چائے اور قہوہ وغیرہ، اور مجاہدین سے مالِ غنیمت میں سے کھائی ہوئی چیزوں کی ضمانت طلب نہیں کی جائے گی۔ (''عجالة المحتاج'' ابن ملقن ۱۶۹۶/۴)

۔اگر آبادی میں پہنچنے کے بعد کچھ بچ جائے تو اس کو مالِ غنیمت میں واپس کر دیا جائے گا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدین حربی کافروں کے علاقے سے نکلتے ہی مالِ غنیمت میں سے کھا نہیں سکتے ہیں، مثال کے طور پر ذمی کافروں کے علاقہ میں پہنچ جائیں تو ان پر ضروری ہے کہ وہ مالِ غنیمت میں سے کھانا فوراً چھوڑ دیں۔ (کیوں کہ ذمیوں کا علاقہ اگرچہ دار الاسلام میں شامل نہیں ہے، لیکن وہ دار الاسلام کی طرح ہے کیوں کہ وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور وہ وہاں خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔ دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۸۵/۶)

جو مال انہوں نے مالِ غنیمت میں سے اپنے کھانے پینے کے استعمال کے لیے لیا ہے ان کو مالِ غنیمت میں لوٹا دیا جائے گا۔ کیوں کہ حربی کافروں کے علاقوں یا شہروں سے نکلنے کی وجہ سے ان کے کھانے کی ضرورت ختم ہوگئی ہے اور وہ ذمی کافروں کے علاقے میں کھا

نے پینے کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔

۔جب کافروں سے جنگ ہو جائے تو پلٹنا حرام ہے، البتہ جنگ میں پینترا بدلنے یا دوسری فوجی ٹکڑی سے جا ملنے کے لیے پلٹنا جائز ہے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جس پر جہاد فرض ہے جب وہ عملی جہاد میں شامل ہو جائے تو اس وقت تک اس کو جہاد کی صف چھوڑنے کا حق نہیں ہے جب تک کہ وہ مقابلہ کی طاقت رکھتا ہو، مثلا ایک سو مجاہدین کا مقابلہ دو سو حربی کافروں سے ہو رہا ہو، البتہ اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ کسی کا مجاہدین کی صف سے نکلنے کا مقصد یہ ہے کہ دوسری بہتر جگہ سے جنگ میں لوٹ آئے مثلاً حربی کافروں کی کسی جماعت کی خاطر گھات میں بیٹھے اور ان کا خاتمہ کر دے۔ یا وہ تنگ راستے سے نکل جائے تا کہ دشمن اس کا پیچھا کرے، جب وہ کھلی جگہ پہنچ جائے تو دشمن پر حملہ کر دے، اگر اس کے جہاد کے ساتھی اس بات کو جانتے ہوں تو ان کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے اور نہ ان کے جذبات پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

یا وہ مجاہدین کی صفوں سے دوسری مسلم ٹکڑی کی مدد کے لیے نکلے جن کو مدد و نصرت کی ضرورت ہو، اس صورت میں جہاد کی صفوں سے نکلنے کی اجازت ہے، ان کے علاوہ شکلوں میں مجاہدین کی صفوں سے نکلنا حرام ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ، وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ'' (انفال ۱۵۔۱۶) (اے ایمان والو! جب کافروں سے میدان جنگ میں تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کو پیٹھ مت دکھاؤ، اور جو کوئی اس دن ان کو پیٹھ دکھائے گا تو وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جگہ جا ٹھرا) صحیح روایت میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو''۔ پھر آپ نے ان میں جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کا تذکرہ کیا۔ (مسلم: کتاب الایمان، باب بیان الکبائر ۲۷۲)

البتہ جن پر جہاد فرض نہیں ہے، مثلاً عورتیں تو ان کو جہاد کی صفوں سے نکلنے کی اجازت ہے۔ اگر جہاد کی صفوں میں جنگ نہ ہو مثلاً ایک مسلمان کو راستے میں دو حربی کافر ملیں تو اس

کو ان سے دور رہنے کی اجازت ہے۔ اگر مسلمان مقابلہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں مثلاً ایک سو مسلم مجاہدین خود کو ایک ہزار ہتھیاروں سے لیس حربی کافروں کے درمیان پائیں اور وہ مقابلہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو ان کے لیے مقابلہ سے پیچھے ہٹنا جائز ہے، کبھی مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کے لیے پیچھے ہٹنا مستحب بن جاتا ہے۔

اگر جنگ چل رہی ہو تو اس موقع پر قتل کا خوف نہیں رہنا چاہیے اور کفر کے خلاف ہر مسلمان پر جمے رہنا واجب ہو جاتا ہے کیوں کہ سورہ توبہ نے مجاہدین کی راہ متعین کر دی ہے کہ وہ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ''يَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ'' (وہ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں) یہی جنگ کی فطرت ہے کہ جنگ ہوتی ہے تو فتح حاصل ہوتی ہے یا شکست۔

پیامبروں کو چھوڑ کر ہر کافر کو قتل کر دیا جائے گا، اسی طرح قید کی وجہ سے غلام بنائے گئے کافروں کو بھی قتل نہیں کیا جائے اور نہ ان کو جو جنگ میں شریک نہ ہوں؛ یہ اس فرمانِ الٰہی سے مستثنیٰ ہے: ''وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً'' (توبہ ۳۶)

اور تمام مشرکوں کے خلاف اسی طرح جنگ کرو جیسا کہ وہ تم سب کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

البتہ پیامبروں کو قتل نہیں کیا جائے گا کیوں کہ وہ صلح کے پیغامات لاتے اور لے جاتے ہیں اور وہ خود سپردگی کے رسائل اور جزیہ کی ادائیگی کے خطوط لیتے ہیں، اسی طرح اس شخص کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا جو قید ہوتے ہی غلام بن جاتا ہو مثلاً عورتیں اور بچے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا۔ (بخاری: کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب ۳۰۱۴، باب قتل النساء فی الحرب ۳۰۱۵ مسلم: کتاب الجہاد، باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب ۱۷۴۴، یہ روایت ابن عمرؓ سے ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۱۳۵) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجنون، مخنث، اور غلام کو قتل کرنے سے منع کیا ہے جب وہ جنگجو نہ ہوں۔

۔عمومی وسیلۂ جنگ سے ان مذکورہ لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے: (حرم مکی میں جائز نہیں) لیکن مکروہ ہے اگر ان میں کوئی معصوم ہو اور امام کو اس سے بچنا ممکن ہو:

عمومی وسیلۂ حرب سے مراد ماضی کے اسلحہ میں منجنیق اور یونانی آگ ہے اور نئے ہتھیاروں میں توپ، میزائل اور بم وغیرہ ہیں، اگر حرم مکی میں کافر قلعہ بند ہو جائیں تو ان وسائل

سے ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ اس کے علاوہ ان کی برائیوں کو دور کرنے کے دوسرے وسائل موجود ہوں، ورنہ ضرورت کے وقت ان کو قتل کرنا جائز ہے جب دوسرے وسائل پائے نہ جائیں، البتہ حرم مکی کے علاوہ میں ان وسائل کا استعمال ان کو قتل کرنے کے لیے مکروہ ہے جب حربی کافروں کے ساتھ معصوم الدم ہو مثلاً کوئی ذمی ہو، مگر یہ کہ وہاں کوئی ضرورت رہے۔

۔دشمنوں کے چوپایوں کو کسی ضرورت کی بنا پر مار ڈالنا اور دشمنوں پر تیر چلانا جائز ہے چاہے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنائے ہوئے ہوں:

جہاد کے دوران مجاہدین کو حربی کافروں کے چوپایوں کو مار ڈالنے کی اجازت ہے، اسی طرح خود مسلمانوں کے جانوروں کو بھی اسی وقت کاٹنے کی اجازت ہے جب یہ جانور دشمنوں کے ہاتھ لگنے اور ان کا مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے کا اندیشہ ہو، مسلم مجاہدین کے لیے حربی کافروں پر تیر چلانا بھی جائز ہے چاہے وہ اپنے بچوں کو اپنے لیے ڈھال کے طور پر سامنے کھڑے کریں۔

امام نوویؒ نے کہا ہے کہ ان کافروں کو ضرورت کے وقت نشانہ بنانا جائز ہے جو حربی ہوں اور اپنی عورتوں اور بچوں کے پیچھے کھڑے ہوں اور ان کو ڈھال بنائے ہوئے ہوں۔ (''روضۃ الطالبین'' ۱۰/۲۴۴، یہی بات ماوردی نے کہی ہے ''الحاوی الکبیر'' ۱۴/۱۸۸، ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۴/۱۹۱)

۔امن لیا ہوا شخص ہمارے علاقہ میں انتقال کر جائے تو اس کے وارث کی موجودگی میں اس کا مال وارث کے لیے ہے، ورنہ وہ مالِ فئی ہے:

امن لیا ہوا شخص وہ کافر ہے جس کے ساتھ جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر امن کا معاہدہ کیا گیا ہو۔ یا جو مسلمانوں کے ملک میں حکومت کی طرف سے داخلہ کا پروانہ یعنی ویزا لے کر آ جائے، اسی طرح وہ کافر جن کے اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہو، اگر ان لوگوں کے پاس مال جائداد ہو تو ان کا وارث ان کے مال کے وارث بنیں گے جب ان کی موت مسلمانوں کے علاقہ میں ہو جائے، وارث نہ پائے جانے کی صورت میں یہ مالِ فئی بن جاتا ہے جس پر فئی کے احکام منطبق ہوں گے جن کا تذکرہ فئی اور غنیمت کے باب میں ہو چکا ہے۔

جزیہ کے احکام ومسائل

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۲۸۲/۱۴، ''التھذیب'' بغوی ۴۹۲/۷، ''مغنی المحتاج'' ۹۶/۶، ''اسنی المطالب'' ۲۱۰/۴)

جزیہ کے لغوی معنی: یہ لفظ جزاء سے ہے جس کے معنی بدلہ اور معاوضہ دینے کے ہیں، کیوں کہ مسلمان اہل کتاب اور ان کے شہروں کی حفاظت کرتے ہیں اور معاوضہ کے طور پر تھوڑا سا مال لیتے ہیں جس کو جزیہ کا نام دیا گیا ہے۔

جزیہ آٹھ ہجری میں شروع ہوا جب فتح مکہ ہوا اور اسلام عالمی دین بن گیا، جس کی اپنی ایک طاقت ور حکومت بن گئی۔

جزیہ مشروع ہونے کی دلیل قرآن، حدیث اور اجماع امت ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**وَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ**'' (توبہ۲۹) اور ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ آخرت کے دن پر، اور ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، اور وہ ان لوگوں میں سے حق دین کو دین نہیں مانتے جن کو کتاب دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ ادا کرے۔

کیوں کہ اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے تو خاتم النبیین ﷺ پر بھی ایمان لے آتے، اس لیے بھی کہ وہ ان چیزوں کو حرام نہیں مانتے جن کو اللہ نے حرام کیا ہے مثلاً شراب، اور وہ اسلام میں داخل ہونے سے انکار کرتے ہیں جس کے ذریعہ اللہ نے سابقہ تمام رسالتوں اور ادیان کو منسوخ کر دیا ہے، اس لیے اللہ تعالی نے ان کے خلاف جنگ کو واجب کیا ہے تا کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔

حدیث نبوی میں جزیہ لینے کی وضاحت آئی ہے، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ نے ہَجَر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا۔ (بخاری: کتاب الجزیۃ، باب الجزیۃ والموادعۃ مع اہل الحرب ۳۱۵۶، ترمذی: کتاب السیر، باب ماجاء فی أخذ الجزیۃ من المجوسی ۱۵۸۷، یہ روایت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے ہے) ابوداود نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے جزیہ لیا۔ (ابوداود: کتاب الخراج والامارۃ والفئی، باب فی اخذ الجزیۃ ۳۰۴۱) مجوسیوں اور اہل کتاب کے درمیان صرف ان کے ساتھ معاملات کرنے میں فرق ہے کہ مسلمان کو مجوسی سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ یہود اور نصاری سے جائز ہے۔

یہود اور نصاری اور مجوسیوں سے جزیہ لینے پر امت کا اجماع ہے، جزیہ لینے کی حکمت یہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے سامنے راہ کھول دی جائے اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کے سلوک وبرتاؤ اور اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے کا موقع دیا جائے، اس بات سے واقف ہو جائیں کہ اس دین کا عقیدہ کتنا واضح اور کھلا ہوا ہے، اور بہت ہی آسان احکامات ہیں، دنیا اور آخرت کی سعادت وخوش بختی حاصل کرنے کے لیے اس کی پیروی کی جانی چاہیے، اور اسلام ان کو دینِ اسلام میں داخل ہونے کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

جزیہ کے ارکان

جزیہ کے پانچ ارکان ہیں: صیغہ، مال، عقد کرنے والا، جس کے ساتھ عقد کیا گیا ہو (معقود لہ) اور وہ جگہ جہاں وہ رہ سکتے ہیں۔ (''الوسیط'' ۵۶/۷، ''مغنی المحتاج'' ۹۶/۶)

صیغہ سے مراد وہ اتفاق ہے جو دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے، یعنی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان۔ مال جو جزیہ میں طے کیا جاتا ہے۔ عاقد سے مراد مسلم امام یا خلیفہ۔ معقود لہ یعنی اہل کتاب میں سے وہ شخص جو جزیہ دینے کا عہد کرتا ہے۔ اور جگہ جہاں اہل کتاب رہتے ہوں۔

صیغہ کی مثال یہ ہے کہ امام کہے: میں نے تم کو دارالاسلام میں اس شرط پر ٹھہرایا کہ تم

جزیہ ادا کرو اور اسلامی حکومت کی اطاعت وفرمانبرداری کرو، کافروں کے رہنے سے صرف ایک ہی جگہ مستثنی ہے، وہ ہے حجاز، جہاں وہ رہ نہیں سکتے ہیں۔لیکن اس بارے میں اختلاف نہیں ہے کہ سفارت یا تجارت کے لیے گزرنے کی ممانعت نہیں ہے،لیکن شرط یہ ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی ایک جگہ نہ ٹھہریں اور داخل ہونے اور نکلنے کے دن کا حساب نہیں ہوگا،اس سے صرف مکہ مستثنی ہے، وہاں جانا مطلقاً ممنوع ہے، وہاں کافر نہ گزرتے ہوئے داخل ہوسکتا ہے اور نہ سفارت کی غرض سے، بلکہ کافر سفیر کے پاس مسلمان اس کی بات سننے کے لیے جائیں گے، کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا '' (توبہ ۲۸) (پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ ہوں) یہ سختی مدینہ میں نہیں ہے۔ (''الوسیط'' ۷/۶۷-۶۸) جزیہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ کافر اسلامی ملکوں میں رہیں، بلکہ جزیہ کے معاہدہ میں یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے شہروں میں ہی رہیں اور ان کے شہروں میں ان کو کوئی بھی نہ چھیڑے۔

اسلامی احکام کی پابندی سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمارے نزدیک اور خود ان کے نزدیک کسی حرام فعل کا ارتکاب نہ کریں مثلاً قتل، زنا اور چوری وغیرہ۔ان کے علاوہ بھی اسلامی احکام کا احترام کرنا ان پر ضروری ہے جو اسلامی شریعت کی خصوصیات میں سے ہوں مثلاً نماز، روزہ اور زکوۃ وغیرہ عبادتیں، ان کے علاوہ جو چیزیں ان کے نزدیک مباح ہیں تو وہ ان کا استعمال کرسکتے ہیں مثلاً شراب، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ علی الاعلان نہ کریں اور صرف اپنے گھروں میں ہی استعمال کریں۔

کم از کم جزیہ آزاد بالغ اور عاقل مرد کے لیے ایک دینار ہے جو اہل کتاب میں سے ہو یا ان میں سے جن کے پاس کتاب ہونے کا شبہ ہو:

ہر آزاد، بالغ اور عاقل مرد پر کم از کم جزیہ ایک مثقال سونا ہے۔ (عمرؓ نے ایک مثقال سونا یا ۱۲ درہم کے درمیان اختیار دیا ہے۔ یہ بات غزالی نے ''الوسیط'' میں بیان کی ہے ۷/۶۹) جو آسمانی کتاب مثلاً انجیل اور تورات کو ماننے والے ہو یا اس دین سے تعلق رکھتا ہو جس کے پاس آسمانی

کتاب ہونے کا شبہ ہو مثلاً مجوسی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معاذؓ کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: ''ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے بقدر کپڑا لو''۔ابوداود وغیرہ نے یہ روایت کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (ابوداود: کتاب الزکاۃ، باب فی زکاۃ السائمۃ ۱۳۵۸، ابن حبان: کتاب السیر، باب الذمی والجزیۃ، ذکر الخبر المفسر لقولہ تعالی: حتی یعطوا الجزیۃ عن ید ۴۹۶۴، مستدرک حاکم: کتاب الزکاۃ ۱۳۸۷)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جزیہ نقد بھی ادا کیا جاسکتا ہے یا مال کی شکل میں بھی جو ایک دینار کے بقدر ہو، جزیہ عورتوں سے نہیں لیا جاتا ہے، جزیہ صرف آزاد مردوں سے ہی لیا جاتا ہے، کیوں کہ ان کے خون کی حفاظت کی خاطر لیا جاتا ہے۔ (بچہ کا خون محفوظ ہے، اس لیے بچے سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور اس کی حفاظت اس کے باپ کے تابع ہے، بالغ ہونے تک اپنے والد کی امان میں رہتا ہے، اس لیے باپ سے زبردستی اس کو الگ نہیں کیا جائے گا، اگر وہ اپنے والد کا جزیہ قبول کرے تو اس کو باقی رکھا جائے گا۔ یہ بات بغوی نے ''التہذیب'' میں کہی ہے ۷/۵۱۰)

غلام قید ہوتے ہی مسلمانوں کا غلام بن جاتا ہے اور اس کا خون ہدر نہیں ہوتا ہے یعنی اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اور پاگل سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، کیوں کہ وہ مکلّف نہیں ہے۔

اسلام آنے کے بعد اپنے دین پر باقی رہنے والے اہل کتاب سے اس کے باوجود جزیہ لیا جائے گا کہ اسلام نے ابراہیمؑ کے صحیفوں سے لے کر عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتاب انجیل تک کی سبھی شریعتوں کو منسوخ کردیا ہے۔اسی طرح ان لوگوں سے بھی جزیہ لیا جائے گا جن کے پاس آسمانی کتاب ہونے کا شبہ ہو مثلاً مجوسی، اس کی دلیل مذکورہ آیت اور بخاری کی روایت ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا خون نہ بہایا جائے، البتہ جو لوگ آسمانی ادیان میں اسلام آنے کے بعد ان ادیان کے منسوخ ہونے کے بعد داخل ہوجائیں مثلاً ہندوستان اور افریقہ وغیرہ کے عیسائی (یورپ کے عیسائیوں کو چھوڑ کر دیگر سبھی عیسائی) تو ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا، اسی طرح بتوں، آگ، سورج اور چاند کے پجاریوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

۔فقیر کے علاوہ دوسروں پر ٹیکس لگانا مسنون ہے تاکہ متوسط سے دو دینار اور مالدار

سے چار دینار لیے جائیں:

غریبوں کے علاوہ دوسروں یعنی متوسط اور مالدار پر جزیہ زیادہ کرنا مسنون ہے تا کہ متوسط کے لیے دو دینار جزیہ ہو اور مالدار کے لیے چار دینار، یہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ اختلاف سے نکلنے کے لیے ہے، ان کے نزدیک متوسط کا جزیہ دو مثقال سونے سے کم ہونا اور مالدار کا جزیہ چار مثقال سونے سے کم ہونا جائز نہیں ہے۔ (حنفی مسلک کی تفصیلات دیکھنے کے لیے رجوع کیا جائے ''البحر الرائق'' ابن نجیم ۱۱۹/۵، امام شیرازی نے اس کو اولی کہا ہے جیسا کہ ان کی ''التنبیہ'' میں ہے ص ۲۴۸)

۔اگر جزیہ کا عقد زیادہ میں کیا جائے تو ان پر زیادہ لازم ہو جاتا ہے چاہے وہ عقد کے وقت ایک دینار ہونے کے جواز کے بارے میں ناواقف ہوں:

ہر آزاد بالغ اہل کتاب مرد پر ایک دینار سے زیادہ جزیہ کا عقد کرنا صحیح ہے، چاہے وہ عقد کے وقت نہ جانتا ہو کہ غیر فقیر کے لیے جزیہ سالانہ ایک دینار ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اس وقت بیع صحیح ہو جاتی ہے جب کوئی کسی سامان کو مقررہ قیمت سے زیادہ دے کر خرید لے چاہے وہ اس کی قیمت کے بارے میں جانتا ہو اور اس کو دھوکہ ہوا ہو۔

۔اگر وہ زیادہ دینے سے انکار کر دیں تو عہد کو توڑنے والے ہیں۔

اگر عقدِ جزیہ پر دستخط کرنے والے ایک مثقال سونے سے زائد مقررہ مقدار کو دینے سے انکار کر دیں، کیوں کہ وہ متوسط طبقہ کے ہیں یا مالدار ہیں تو وہ عہد توڑنے والے شمار ہوں گے۔ (یہی بات بغوی نے ''التھذیب'' میں لکھی ہے ۴۹۹/۷، نووی نے اس کو صحیح کہا ہے جیسا کہ ''مغنی المحتاج'' میں ہے ۱۰۶/۴، ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۲۱۶/۴) اور وہ مسلمانوں کے ذمے اور امان سے نکل جاتے ہیں، اور ان سے جنگ کرنا ضروری ہے تا کہ وہ اپنے عہد کا احترام کریں۔

اگر وہ اللہ تعالی یا اس کی کتاب کا ایسا تذکرہ کرے جس کا وہ عقیدہ نہ رکھتا ہو یا کسی نبی یا اس کے دین کا نامناسب تذکرہ کرے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے چاہے نکاح کے نام پر ہی کیوں نہ ہو، یا کسی مسلمان کو اس کے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں ڈال دے یا ڈاکہ ڈالے یا حربیوں کو مسلمانوں کا کوئی راز بتا دے یا ان کے کسی جاسوس کو پناہ دے اور

اس کی وجہ سے معاہدہ ٹوٹنے کا تذکرہ کیا گیا ہو تو معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے، ورنہ نہیں ٹوٹتا۔

اگر وہ ایسے جملے کہے جن کی ان کی شریعتوں میں اجازت ہے۔ مثلاً کہے: اللہ تین میں سے ایک ہے۔ یا کہے: باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے شروع کرتا ہوں، تو اس وجہ سے ان کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ اس کا اظہار اور اعلان نہ کریں۔

اگر دستخط کرنے والوں میں سے کوئی اللہ کا تذکرہ ایسے انداز میں کرے جو اس کے دین میں نہیں ہے۔ مثلاً وہ خالق کا انکار کر دے یا اللہ کو گالی دے تو اس کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ میں مذکورہ باتوں یا کاموں میں سے کسی کام کو کرنے سے عقد فسخ ہونے کا تذکرہ نہ ہو تو معاہدہ فسخ نہیں ہوگا، لیکن ان کی تادیب کرنا ضروری ہے تا کہ وہ دوبارہ اس طرح کی باتیں یا کام نہ کریں۔

۔ہمارے درمیان کسی بھی منکر اور گناہ کے اظہار سے ان کو روک دیا جائے گا، یہ واجبی حکم ہے، اسی طرح ہمارے ملکوں میں گرجے قائم کرنے، بغیر اجازت مسجد میں داخل ہونے، کسی مسلمان کو شراب پلانے یا خنزیر کا گوشت کھلانے، گھوڑے پر سوار ہونے وغیرہ سے روکا جائے گا اور ان کو اپنے کپڑوں پر زُنار پہننے کے لیے کہا جائے گا۔

اگر کافر ہمارے بیچ رہتے ہوں تو ان کو منکر کے اظہار مثلاً شراب سامنے لے جانے، اس کو نمایاں کرنے، ناقوس بجانے اور اپنی عیدوں کو علی الاعلان کرنے سے روکا جائے گا، اسی طرح ہمارے شہروں میں گرجا گھر بنانے سے بھی روک دیا جائے گا، اگر ہم ان کے شہروں میں سے کوئی شہر فتح کر لیں اور یہ طے ہو جائے کہ وہ شہر ہمارا ہے تو ان کو وہاں گرجا گھر تعمیر کرنے سے روکا نہیں جائے گا۔

بغیر اجازت ان کو مسجدوں میں جانے سے روکا جائے گا، اگر مسلمانوں میں سے کوئی ان کو داخل ہونے کی اجازت دے تو روکا نہیں جائے گا۔

مسلمانوں کو شراب پیش کرنے یا خنزیر کا گوشت کھلانے سے روکا جائے گا۔

ہمارے شہروں میں ان کو گھوڑوں پر سوار ہونے سے روکا جائے گا اور سواریوں پر

چراغ رکھنے سے بھی روکا جائے گا، اسی طرح لوہے کے رکاب کے استعمال سے بھی منع کیا جائے گا، وہ لکڑی کے رکاب استعمال کر سکتے ہیں، ان کو اپنے کپڑوں پر مسلمانوں سے ممتاز کرنے والی علامت رکھنے کے لیے کہا جائے گا؛ عیسائیوں کے لیے ہرا یا ہلکا ہرا، یہودیوں کے لیے پیلا رنگ اور مجوسیوں کے لیے لال یا کالا رنگ، ان کو زُنار باندھنے کا بھی حکم دیا جائے گا، یہ لمبا پٹہ ہے جس کے بیچ میں متعدد رنگ رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کو یاد کرنا ضروری ہے کہ رنگ برنگ کپڑے سے بنے ہوئے مختلف رنگ کے ٹکڑے جن کا استعمال نصرانی، یہودی اور مجوسی کے درمیان فرق کے لیے ہوتا تھا آج وہی فوجی رتبوں پر دلالت کرنے والی علامتیں اور اسٹار بن گئے ہیں اور ان کو عزت وفخر کے طور پر کندھوں پر لگایا جاتا ہے جب کہ یہی علامتیں قدیم زمانہ میں ذلت کی تھیں، یہ عجیب وغریب بات ہے کہ مسلمان خود اپنی تاریخ کو جانتے نہیں ہیں، اس لیے مسلمان ہی اس بارے میں غیروں کی تقلید کر رہے ہیں۔

امام بیہقیؒ نے ابوعبیدہ بن جراحؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاز کے تعلق سے جو آخری بات کہی وہ یہ ہے: ''یہود کو حجاز سے نکال دو''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الجہاد، من قال لا تجتمع الیہود والنصاری مع المسلمین فی مصر ۳۲۳۴۲، ''السنن الکبری'' بیہقی: کتاب الجزیۃ، جماع ابواب الشرائط التی یاخذہا الامام علی اہل الذمۃ، باب لا یسکن ارض الحجاز ۱۷۴۲۹) کافر کو حجاز میں رہنے نہیں دیا جائے گا؛ حجاز سے مراد مکہ، مدینہ اور یمامہ، ان تینوں کے راستے اور گاؤں ہیں۔

یمامہ یمن سے قریب شہر ہے، اس کے اور مکہ کے درمیان ۳۲ فرسخ کا فاصلہ ہے، طائف اور اس کے درمیان کی مسافت ۱۶ فرسخ ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالو'' (بخاری: کتاب الجزیۃ، باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب ۳۰۱۳، مسلم: کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شئی یوصی فیہ ۳۱۷۴) صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ضرور بالضرور یہود اور نصاری کو جزیرۃ العرب سے نکالوں گا''۔ (مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب اخراج الیہود ۳۴۰۰)

۔امام کی اجازت سے ذمی کو وہاں سے گزرنے، اور داخل ہونے اور نکلنے کے دنوں کو چھوڑ کر تین دن رہنا جائز ہے۔

۔اس کو حرم مکی میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا، اگر وہ وہاں جائے اور وہیں اس کا انتقال ہو جائے تو وہاں تدفین نہیں کی جائے گی، اگر دفن کیا جائے تو اس کا جنازہ کھود کر نکالا جائے گا تا کہ اس کا جسم دوسری جگہ منتقل کیا جائے۔

حرم مکی کے حدود مندرجہ ذیل ہیں:

مدینہ کی طرف تین میل، عراق کی طرف سات میل، جعرانہ کی طرف نو میل اور جدہ کی طرف دس میل۔ اگر حرم مکی میں کافر کا جسم مرنے کے بعد محلول ہو جائے تو اس کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔

صلح (هدنة)

هُـدْنة کے لغوی معنی مصالحت کے ہیں۔شرعی معنی حربی کافروں کے ساتھ صلح کرنا جس کا مقصد جنگ بندی کرنا اور ایک متعین مدت تک کے لیے معاوضہ کے ساتھ یا بغیر معاوضہ جنگ وجدال سے باز رہنا ہے۔

صلح کی دلیل قرآن،حدیث اور اجماع امت ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:''بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ''(توبہ۱) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے براءت ہے۔

اللہ عزوجل نے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان صلح کی مدت چار مہینے متعین کی ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:''وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ''(انفال۶۱) اگر وہ صلح کے لیے جھک جائیں تو آپ بھی اس کے لیے جھک جائیں۔

حدیث نبوی میں اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ہجری کو قریش کے ساتھ صلح حدیبیہ کی۔جیسا کہ بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے۔(بخاری: کتاب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب وکتابۃ الشروط ۲۶۰۱، مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب صلح الحدیبیۃ فی الحدیبیۃ ۳۴۲۵)

صلح کی شرطیں:

۔امام یا اس کا نائب مصلحت کی بناء پر چار مہینے یا اس سے کم مدت کے لیے صلح کرے گا؛

اگر صلح عام ہے یعنی سبھی کافروں کے ساتھ صلح کی جارہی ہو تو امام ہی یہ صلح کرے گا، دوسرا نہیں کرے گا، اگر اسلامی حکومتوں میں سے کسی حکومت اور اس سے متصل کافر حکومت کے درمیان معاہدہ ہو تو اس حکومت کا حاکم ہی چار مہینوں کے لیے صلح کرے گا، کیوں کہ سورہ توبہ کی بعد والی آیت یہ ہے:''فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ ''(توبہ۲)(پس زمین میں

چار مہینے گھومو پھرو) رسول اللہ نے صفوان بن امیہ کو چار مہینے کی مہلت دی تاکہ اس مدت کے دوران مسلمان ہوجائے، لیکن وہ چار مہینے گزرنے سے پہلے ہی اسلام لے آئے، فتح مکہ کے سال یہ واقعہ پیش آیا۔(بیہقی: کتاب الجزیۃ، باب مہادنۃ من یقوی علی قتالہ''السنن الکبری''۹/۲۲۵)

۔یا کافروں کے ساتھ اس شرط کے ساتھ صلح کرے کہ جب بھی سمجھ میں آئے تو معاہدہ توڑ دے گا، اگر ہم میں کمزوری ہو تو دس سال تک کے لیے مدت بڑھانے کی اجازت ہے۔

یعنی خلیفہ یا اس کے نائب یا اسلامی حکومتوں کے کسی ایک حکومت کے حاکم کے لیے کافروں کے ساتھ اس شرط پر صلح کرنا جائز ہے کہ وہ جب چاہے اس معاہدہ کو توڑ دے جب یہ معاہدہ مسلمانوں کے مفاد میں نہ ہو، اگر مسلمان کمزور ہوں تو امام دس سالوں تک کے لیے صلح کرسکتا ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ دس سالوں کے لیے صلح کی تھی۔(ابوداود: کتاب الجہاد، باب فی صلح العدو ۲۷۶۶، یہ مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت ہے۔ بخاری: کتاب الصلح، باب الصلح مع المشرکین ۲۷۰۰، یہ روایت براء بن عازب ؓ سے ہے)

۔خراج دینے کی شرط پر صلح کرنا جائز نہیں ہے اور مسلمان کے لیے اپنے خون کی حفاظت کی خاطر مشرک کو مال دینا جائز نہیں ہے۔

یعنی امام یا اس کے نائب کے لیے کافروں کو خراج دینے کی شرط پر صلح کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:''فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ''(محمد۳۵) پس تم ایسے کمزور نہ پڑجاؤ کہ صلح کی دہائی دینے لگ جاؤ، اور تم ہی سربلند ہو۔

یعنی صلح کے لیے مسلمانوں کا مطالبہ قوت کے موقف میں ہونا چاہیے، کمزوری کی دلیل نہیں بننی چاہیے۔(''الوسیط''۷/۸۹) حقیقت یہ ہے کہ پورے قرآن میں مسلمانوں کے لیے عزت کا حکم ہے، کمزوری اور مدارات کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے مثلاً مظلوم کو قید سے نکالنے کے لیے یا خود کو قید سے نکالنے کے لیے یا اپنے حق کو حق ثابت کرنے کے لیے رشوت دے، یہ امور اگرچہ مکروہ ہیں، البتہ حرام نہیں ہیں، جہاں تک رشوت کا تعلق ہے تو اس سے حقوق ضائع ہوتے ہیں یا باطل کی مدد ہوتی ہے۔

۔اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ وہ دشمنوں میں گھر جائے ،یا اس کو قید کر دیا جائے یا اس پر قصاص ضروری ہو جائے تو وہ دیت دے کر اپنی سزا معاف کرا سکتا ہے:

یعنی مسلمان کے لیے اس وقت مال دینا جائز ہو جاتا ہے جب وہ خود کو دشمنوں کے گھیرے میں پائے ،یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جائے ،تا کہ وہ خود کو چھڑالے یا جس کافر کو اس نے قتل کیا ہے اس کی دیت ادا کرے تا کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔(الوسیط ۸۹/۷)

۔اگر خلیفہ کافروں کے ساتھ نا جائز شرط پر صلح کرے تو شرط فاسد ہو جائے گی:

یعنی خلیفہ یا مسلمانوں کے قائد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ غیر جائز معاوضہ کے بدلے صلح کرے مثلاً وہ مسلمان قیدیوں کو نہ چھوڑنے پر موافقت کر لے۔یا دشمنوں نے مسلمانوں کا جو مال لیا ہے اس سے دست بردار ہو جائے یا اس بات پر صلح کر لے کہ وہ حجاز میں رہیں یا حرم میں داخل ہو جائیں یا علی الاعلان شراب پئیں تو یہ سب شرطیں فاسد ہو جائیں گی ،اگر صلح میں یہ شرطیں شامل کی جائیں تو صلح ہی فاسد ہو جائے گی۔

۔اگر ان میں سے کوئی غلام یا عورت مسلمان بن کر آئے تو اس کے آقا کو اس کی قیمت نہیں دی جائے گی اور نہ اس کے شوہر کو اس کا مہر دیا جائے گا ،کیوں کہ غلام کے اسلام لانے سے اس کے کافر آقا کے پاس اس کو لوٹانا ممنوع ہے ،اگر عورت مسلمان ہو جائے تو اس کو کافر شوہر کے پاس واپس کرنا منع ہے۔اگر غلام کا آقا اس کو چاہتا ہے یا عورت کا شوہر اپنی بیوی کو چاہتا ہے تو دونوں کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے ،اس صورت میں غلام آقا کے حوالے کیا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کو لوٹا دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:"وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا "(ممتحنہ ۱۰)یعنی جو عورتیں مسلمان ہوئی ہیں ان کے شوہروں کو ان پر خرچ کیا ہوا مال واپس کر دیا جائے اگر وہ کافر ہی باقی ہوں اور اپنی بیویوں کے اسلام لانے کے باوجود اسلام نہ لائیں۔

۔سابقہ حکم اس فرمانِ الٰہی کی وجہ سے منسوخ ہے:"فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ "(ممتحنہ ۱۰)پس ان عورتوں کو کافروں کے پاس مت لوٹائیے۔

رسول اللہ ﷺ نے کفار شوہروں کو مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ آنے والی ہر عورت کا مہر دیا تھا ،صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کفارِ قریش کے پاس مکہ والوں میں سے مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ آنے والے ہر مسلمان کو لوٹائیں گے۔(دیکھا جائے "تفسیر ابن کثیر" ۹۴/۸۔۹۵ "التہذیب"،بغوی ۵۲۰/۷)لیکن آپ ﷺ مسلمان عورتوں کو ان کے کافر شوہروں کے پاس واپس نہیں کرتے تھے ،جو اس مسئلہ میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ہماری تفسیر "**صفوة العرفان**" سے رجوع کرے۔

۔اگر کافر عہد توڑ دیں اور وہ ہمارے علاقے میں ہوں تو ان کو ان کی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے گا پھر وہ ہمارے لیے حربی بن جائیں گے:

اگر کافر امن معاہدہ توڑ دیں یا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ کی مدت ختم ہو جائے ،اور بعض کافر مسلمانوں کے علاقے میں ہوں تو یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان کو اپنے علاقے سے نکال کر ان کے علاقے میں امن کے ساتھ پہنچا دیں۔یا جب کافر معاہدہ توڑ دیں یا مسلمانوں سے خیانت کریں یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں۔یا دشمنوں کو مسلمانوں کی کمزوریوں کی اطلاع دیں۔یا ان کے جاسوسوں کو پناہ دے یا نبی ﷺ کی اہانت کریں تو یہ سب شکلیں صلح توڑنے کی مانی جائیں گی۔اس کا حکم بھی یہ ہے کہ سب سے پہلے ان کو امن کے ساتھ ان کے علاقے میں پہنچایا جائے پھر اس کے بعد ان کے ساتھ حربیوں کا سا معاملہ کیا جائے۔

۔ہر مختار مسلمان کی طرف سے دی ہوئی امان جائز ہے جو بچہ یا پاگل یا قیدی نہ ہو:

مسلمان چند کافروں کو امان دے سکتا ہے۔(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "الوسیط" غزالی ۴۳/۷،"التہذیب" بغوی ۴۷۵/۷)البتہ شرط یہ ہے کہ وہ لوگ ہمارے قیدی نہ ہوں اور جاسوس نہ ہوں یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی سرگرمیاں انجام دینے والے نہ ہوں ،یہ بھی شرط ہے کہ یہ مسلمان مختار ہو یعنی وہ مجبور کیا ہوا نہ ہو ،بالغ ،عاقل ہو اور کافروں کی قید میں نہ ہو۔

امان کے عہد کے لیے یہ شرط ہے کہ یہ عہد چھوٹے گاؤں کے رہنے والوں کے لیے

ہو، مسلمان بچہ یا پاگل کافر کو امان نہیں دے سکتے ہیں، کوئی بھی مسلمان کافروں کی بہت بڑی تعداد کو امان نہیں دے سکتا ہے، بلکہ چھوٹی تعداد کو ہی دے سکتا ہے، سبھی کافروں کو امان نہیں دے سکتا ہے، کیوں کہ اس سے اسلام کو عام کرنے کے لیے جہاد کا دروازہ بند کرنا ہوگا، کسی جاسوس کو امان دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے کو امان دینا صحیح نہیں ہے۔

مسلمان کسی کے مجبور کرنے کی وجہ سے امان دے تو باطل ہے، امان کی مدت چار مہینوں سے زیادہ ہونا بھی جائز نہیں ہے، چار مہینوں سے زیادہ کی مدت امام کی خصوصیت ہے جس کو دس سال تک کافروں کے ساتھ معاہدہ کرنے کا اختیار ہے۔ (غزالی نے دس سالوں سے زیادہ کے جائز ہونے کا بھی ایک قول نقل کیا ہے جب کوئی مفاد پایا جائے۔ دیکھا جائے ''الوسیط'' ۷/۹۰)

۔اگر دو ذمی نکاح یا دوسرے کسی معاہدہ میں مسلمانوں کو حکم بنائیں، یا ایک مسلمان اور ایک ذمی، یا ایک مسلمان اور دوسرا معاہدہ میں موجود شخص، یا معاہد اور ایک ذمی تو ان کے درمیان فیصلہ کرنا ہم پر ضروری ہے۔ (حدیث نبوی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو زنا کرنے والے یہودیوں کو رجم کیا: مسلم: کتاب الحدود، باب رجم الیہود اہل الذمۃ فی الزنا ۱۶۹۹، ابن ماجہ: کتاب الحدود، باب رجم الیہودی والیہودیۃ ۲۵۵۶، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۴۳۱، یہ روایت ابن عمرؓ سے ہے، اس صورت میں اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''وان احکم بینهم بما انزل الله'' (مائدہ ۴۹))

مسلمانوں پر دو حربی کافروں یا دو معاہد یا ان دو اشخاص کے درمیان فیصلہ کرنا ضروری نہیں ہے جن کے اور ہمارے درمیان معاہدہ ہو۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۳/۱۶۷)

خراج

خراج مال کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو مال کے فرائض میں سے نکالا جاتا ہے، یہ مالِ فئ کے معنی میں آتا ہے اور ٹیکس کو بھی کہتے ہیں، جزیہ کو بھی اور کرایہ کو بھی۔ (دیکھا جائے "تهذيب اللغة" ازھری ۷/۴۷)

مجاہدین کافروں کی جن زمینوں پر قبضہ کرلیں مثلاً مصر، شام اور عراق کی زمین تو یہ مجاہدین کے لیے مالِ غنیمت ہے، مجاہدین کو راضی کرنے کے بعد حاکم اس زمین کو وقف کرسکتا ہے اور اجرت پر بھی دے سکتا ہے تاکہ اس کے کرایہ سے حاصل آمدنی مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کی جائے۔

امام اس زمین میں مجاہدین کا حصہ وقف کرسکتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ راضی ہوں تاکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کیا جائے، امام کو یہ حق ہے کہ وہ مجاہدین کی رضامندی سے مالِ غنیمت میں سے ان کا حصہ بیچے اور اس کی قیمت کو ان کے درمیان تقسیم کردے۔

یہاں مصر اور عراق سے مراد ان دونوں کے پایۂ تخت ہیں جو زبردستی ان سے لیے گئے اور ان کو حملہ کرکے فتح کیا گیا، البتہ ان دونوں حکومتوں کے گاؤں اور دوسرے علاقے صلح کی بنیاد پر فتح ہوئے تھے اور وہاں کی زمین وہاں کے رہنے والوں کی ملکیت تھے، آج جو زمین وہاں کی قوموں کے پاس ہے وہ ان ہی کی ملکیت ہے کیوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ ان کے پاس یہ زمین مالِ غنیمت پانے والوں کے توسط سے پہنچی ہو۔

۔یا صلح کی بنیاد پر حاصل ہوئی ہو مثلاً مکہ کی سرزمین، اور ہمارے لیے وہی شرط ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یعنی جو زمین مسلمانوں کے پاس کفار کی طرف سے جنگ کے بغیر صلح کی وجہ سے حاصل ہوئی ہو اور شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت بن گئی ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ جو مسلمانوں کی طاقت صرف کر کے حاصل ہو جائے تو وہ مالِ غنیمت پانے والوں کی ملکیت ہے اور یہ مالِ غنیمت ہے، لیکن مجاہدین نے یہ زمین ان ہی کے مالکوں کو دے دی جس کی وجہ سے یہ زمین اور گھر آج تک ان ہی کی ملکیت میں رہ گئے، ان کی ملکیت میں کوئی جھگڑا نہیں ہے اور ان کو اس میں خرید و فروخت کا حق اور اختیار ہے۔

۔یا ان کے لیے شرط رکھی جائے کہ وہ اس کے بدلے ہر سال خراج ادا کریں تو یہ جزیہ کی طرح بن جائے گا:

یعنی جو زمین کافروں کی طرف سے مسلمانوں کے پاس آئی ہے اس کے سلسلہ میں یہ شرط رکھی جائے کہ زمین کافروں کے پاس ہی باقی رہے اور وہ ہر سال اس کا خراج سالانہ جزیہ کے ساتھ ادا کریں جس کی مقدار ہر شخص کی طرف سے سالانہ ایک مثقال سونا ہے، یہ جزیہ سبھوں کی طرف سے ادا کیا جائے، صرف مالدار اور متوسط پر ہی نہ ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حکم ان پر ان کے اسلام لانے سے پہلے منطبق ہوتا ہے، البتہ جب وہ اسلام لے آئے تو یہ شرط باقی نہیں رہتی ہے۔ (کیوں کہ جو اسلام لے آتا ہے تو اس پر سے خراج ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ "الوسیط" میں ہے ۷/ ۸۷، خراج کے احکام میں مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے " کتاب الخراج" ابو یوسف القاضی، "الاستخراج لأحکام الخراج" ابن رجب حنبلی)

مسابقہ اور تیراندازی کے احکام

اس باب کو فقہ میں سب سے پہلے شامل کرنے والے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو بڑے ماہر تیرانداز تھے۔ (دیکھا جائے "مناقب الشافعی" بیہقی ۲/ ۱۲۷-۱۲۹، اس کتاب میں بیہقی نے امام شافعی کی تیراندازی اور گھڑسواری کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں) وہ دس میں سے نو تیر نشانے پر مارتے تھے اور دسویں مرتبہ نشانہ عمداً خطا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو حسد نہ ہونے لگے۔ (دیکھا جائے "الأم" ۴/ ۲۳۰)

جنگِ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو یکے بعد دیگرے بارہ تیر دیے اور ان سے فرماتے جاتے تھے: "تیر مارو، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں"۔ (بخاري، كتاب المغازي، باب "إذا همت طائفتان منكم أن تفشلا والله وليُّهما" (آل عمران ۱۲۲) ۲۹۰۵، مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب في فضل سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه ٢٤١١) امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیراندازی کرو اور سواری کرو"۔ (ترمذي : أبواب فضائل الجهاد، باب ماجاء في فضل الرمي في سبيل الله ١٦٠٤) تیراندازی کی اہمیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے تیراندازی سیکھی پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں۔ یا کہا کہ اس نے نافرمانی کی"۔ (مسلم: كتاب الإمارة، باب فضل الرمي والحث عليه ٣٦٣٥) آج سبھی آلاتِ جنگ تیراندازی کی قسم میں سے ہے۔

گھوڑے، اونٹ، ہاتھی، خچر، گدھے پر مسابقہ صحیح ہوتا ہے، اسی طرح تیراندازی، نیزہ بازی، پتھر بازی اور کسی بھی جنگی آلہ میں مسابقہ جائز ہے اور جنگ میں استعمال ہونے والے وسائل مثلاً توپ، بندوق، رائفل اور میزائل وغیرہ میں بھی مسابقہ صحیح ہے، حدیث

میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسابقہ صرف دھار والے ہتھیار یا کھر والے جانور میں ہی ہے"۔ امام شافعی وغیرہ نے یہ روایت کی ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔(شافعي "المسند" ۲/۱۲۸- ۱۲۹، أبوداود: كتاب الجهاد، باب فی السبق ۲۵۷٤، ترمذی: كتاب الجهاد، باب ماجاء في الرهان و السبق ۱۷۰۰، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے: کتاب السیر، باب السبق ۴۶۹۰، سبھوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے) یعنی مسابقہ صرف تیراندازی، اونٹ اور ان جانوروں میں ہوتا ہے جن کے کُھر ہوں مثلاً گھوڑا اور خچر وغیرہ، اس پر جنگی وسائل کو قیاس کیا جائے گا، جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جن کو جنگ میں استعمال نہیں کیا جاتا ہے مثلاً پرندوں کا مقابلہ، فٹ بال کا مسابقہ، کشتیوں کا مسابقہ، تیرا کی وغیرہ، تیرا کی سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے، اسی طرح چھوٹی کشتیوں کے درمیان مسابقہ، دوڑنے کا مسابقہ اور شطرنج کا مقابلہ، البتہ شرط یہ ہے کہ کسی معاوضہ کے بغیر ہو، البتہ تیراندازی، گھوڑسواری میں عوض رکھنا جائز ہے، ان میں مقابلہ امام وغیرہ کی طرف سے ہوگا مثلاً امام کہے: تم میں سے کوئی فرد نشانہ پر تیر لگائے اور نشانہ لگ جائے تو میں اس کو انعام دوں گا۔ یا کہے: تم میں سے جو کوئی گھڑسواری یا گاڑیوں کے مسابقہ یا جہاز کے مقابلہ میں کامیاب ہوجائے تو میں اس کو انعام دوں گا، کیوں کہ اسلام اپنے پیروکاروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ میدان کے مرد مجاہد بنیں، جنگجو اسلحہ سے لیس رہیں، عورتوں کی طرح نہ بنیں کہ صرف لطف اندوزی اور راحت کے لیے کوشاں رہیں۔

اگر زید اور عمرو مقابلہ کریں اور ان میں سے ایک کہے: ہم میں سے ہر ایک ہزار روپئے دے گا اور جو کامیاب ہوگا تو اس کو یہ روپئے دئے جائیں گے تو یہ جُوا بن جائے گا جو کہ حرام ہے، البتہ اگر ان دونوں کے ساتھ مقابلہ میں کوئی تیسرا شامل ہوجائے تو اس صورت میں اگر وہ جیت جاتا ہے تو اس کو انعام ملے گا، اگر دونوں میں سے کوئی جیت جاتا ہے تو ان میں سے کسی کو کچھ نہیں ملے گا یا ان میں سے کوئی ایک تیسرے کے ساتھ مقابلہ کرے تو اس صورت میں ایک ہزار دینے والا جیت جائے تو اس کا مال اس کو مل جائے گا۔ اگر تیسرا اور دوسرا شخص

جیت جائے تو وہ دونوں دوسرے شخص کے ایک ہزار درہم کو آپس میں تقسیم کرلیں گے۔

۔اگر یہ تیسرا دونوں پر سبقت لے جائے تو وہ دونوں کا مال لے گا، اگر یہ دونوں اس کے ساتھ جیت جائیں اور ایک ساتھ پہنچ جائیں یا ان دونوں میں سے کوئی دوسرے پر سبقت نہ لے جائے تو ان میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا، یا تیسرا شخص ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ آئے تو اس کا مال اس کو مل جائے گا اور ہارنے والے کا مال محلل یعنی تیسرے شخص کو اور اس کے ساتھ آنے والے کو ملے گا، ورنہ ہارنے والے کا مال پہلے کو ملے گا۔

یہ ضروری ہے کہ گھڑسواری میں مقابلہ کرنے والے ابتدا کی لائن اور انتہا کی لائن کو جان لیں اور تیراندازی کے مقابلہ میں نشانہ کی جگہ اور وقت کو اور مقابلہ کی مدت سے واقف رہیں، کیوں کہ تیراندازی کے وسائل کی ہر قسم کے لیے ایک مدت متعین رہتی ہے۔ اور جیتنے والے کے لیے انعام مقرر ہو اور سبھوں کو معلوم ہو، مقابلہ کے لیے معاوضہ یا رہن یا ضمانت متعین کرنا جائز ہے۔

مقابلہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مقابلہ دو یا دو سے زائد افراد کے درمیان ہو۔ اگر کوئی کہے: تم دس میری طرف سے تیر چلاؤ اور دس اپنی طرف سے۔ اگر تمہاری دس تیروں میں سے نشانہ زیادہ صحیح لگے تو میں تم کو اتنا انعام دوں گا۔ تو یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے: تم اپنے دس تیر چلاؤ اور میرے دس تیر۔ اگر تمہارے تیر نشانے پر زیادہ لگے تو تمھیں میری طرف سے ایک ہزار درہم کا انعام۔ یہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ شخص اس صورت میں خود سے مقابلہ کر رہا ہے۔

۔دوسرے یا تیسرے نمبر پر آنے والے کے لیے بھی انعام مقرر کرنا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ بعد میں آنے والے کے لیے انعام پہلے آنے والے سے کم ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب مقابلہ ہوجائے جس میں زید، عمرو و بکر شریک ہوجائیں۔ کوئی صاحبِ خیر اس موقع پر کہے: اول آنے والے کو ایک ہزار درہم، دوم آنے والے کو نو سو درہم اور سوم آنے والے کو آٹھ سو درہم دوں گا۔ تو یہ جائز ہے۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ تیسرے نمبر پر آنے والے کا انعام دوسرے نمبر پر آنے والے سے زیادہ ہو یا دوسرے نمبر پر آنے والے کا پہلے نمبر پر

آنے والے سے یا تیسرے نمبر پرآنے والے کا پہلے اور دوسرے نمبر پرآنے والوں سے زیادہ ہو۔البتہ پہلے اور دوسرے آنے والے کے انعام کی قیمت یکساں ہواور تیسرے نمبر پرآنے والے کی کم تو جائز ہے۔مثلاً پہلے اور دوسرے نمبر پرآنے والوں کے لیے ایک ایک ہزار مقرر کیے جائیں جب کہ تیسرے نمبر پرآنے والے کے لیے۹۹۹ درہم طے کئے جائیں۔

مقابلہ کی ابتدا اور انتہا کی جگہ سبھی مقابلہ میں شریک افراد کے لیے ایک ہی ہونا اور گھڑ سواری کے مقابلہ میں گھوڑوں کے برابر درجہ کا ہونا اور تیراندازی میں مسافت مناسب اور معلوم رہنا ضروری ہے، مقابلہ کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مقابلہ کے گھوڑے معلوم ہوں اور ان کے مکمل اوصاف بیان کیے جائیں، تیراندازی میں نشانہ کی لمبائی، چوڑائی اور مسافت معلوم رہنا ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ أعلم

حدود کے مسائل

اس باب میں حدود کے احکام،اسباب اور مقدار کو بیان کیا گیا ہے۔

''حدود'' حد کی جمع ہے،جس کے لغوی معنی منع کرنے کے ہیں۔

شرعی معنی متعین گناہ کے مرتکب کے لیے مقررہ سزا ہے۔اور حدود کو مشروع کرنے کا مقصد دین، جان، عقل،نسب اور مال کی حفاظت کرنا ہے۔

دین کی حفاظت کے لیے مرتد کے قتل کو مشروع کیا گیا ہے اور جان کی حفاظت کے لیے قصاص کو مشروع کیا گیا ہے، عقل کی حفاظت کے لیے شراب کی حد مقرر کی گئی ہے، مال کی حفاظت کے لیے چوری کی حد مشروع کی گئی ہے اور ان پانچ امور کو''**الکلیات الخمس**'' پانچ اصول کہا جاتا ہے۔(عظیم فقہاء اور اصولیین میں سے اس باب میں بڑی وسعت اختیار کرنے والے امام عزالدین بن عبدالسلام ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ''قواعدالاحکام فی مصالح الانام'' تحریر کی ہے اور امام شاطبی نے بھی ''الموافقات میں بڑی تفصیلات بیان کی ہے)

حدود کی تین قسمیں ہیں: قتل،کوئی عضو کاٹنا اور کوڑے مارنا چاہے پھانسی کے ساتھ ہو یا جلاوطنی کے ساتھ۔قتل کے ساتھ پھانسی کی سزا ڈاکو کی حد ہے کیوں کہ وہ قتل بھی کرتا ہے اور مال بھی لیتا ہے۔کاٹنے کی سزا چور کی ہے مثلاً اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے،کوڑے مارنے کی سزا غیر شادی شدہ زانی کی حد ہے، اس کو ایک سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کیا جائے گا، وہ یہ مدت دور کہیں اجنبی بن کر گزارے گا۔

چار موقعوں پر مجرم کو قتل کیا جاتا ہے؛ مرتد ہونے کی صورت میں جیسا کہ مرتد کے حکم کی سزا میں گزر چکا ہے،شادی شدہ زنا کرنے کی صورت میں جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔(مسلم: کتاب القسامۃ ، باب مایباح بہ دم المسلم ۱۶۷۶،صحیح بخاری: کتاب الدیات ، باب قول اللہ تعالی: ''ان النفس

بالنفس ۶۸۷۸، یہ روایت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے) جس روایت میں شادی شدہ زانی کو رجم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، سستی کی وجہ سے نماز چھوڑنے والے کو قتل کیا جائے گا، مرتد کے مسئلہ میں آیا ہے کہ اس سے توبہ کے لیے کہنا ضروری ہے، جب کہ سستی کی وجہ سے نماز چھوڑنے والے کے لیے کہنا ضروری نہیں ہے۔

آدمی **مُحصن** اس وقت مانا جائے گا جب وہ آزاد، بالغ، عاقل اور صحیح نکاح میں جماع کیا ہو۔

۔یہ صفات نکاحِ صحیح میں اور زنا دونوں حالتوں میں معتبر ہوں گی۔اس بنیاد پر باندی سے جماع کرنے سے آدمی مُحصن شمار نہیں ہوگا اور نہ شبہ کی بنیاد پر جماع کرنے سے، اور نہ نکاح فاسد میں جماع کرنے سے مثلاً محلل کے نکاح میں۔

دو مجرموں کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، چوری میں اور ڈاکہ ڈالنے میں جب ڈاکو حفاظت میں رکھی ہوئی چیز کسی شبہ اور شک کے بغیر لے، اور مال چوری کے نصاب تک پہنچا ہو جس کی تفصیلات اس کے باب میں آرہی ہیں، چوری کا نصاب پاؤ دینار ہے، حفاظت یہ ہے کہ مال مسافر کی اٹیچی میں ہو یا اس کے سامان کے بیگ میں رکھا ہوا ہو۔

۔تین موقعوں پر کوڑے مارے جاتے ہیں: کوئی ایسی چیز پیئے جس کے زیادہ پینے سے نشہ آتا ہو، اس کی سزا چالیس کوڑے ہیں یا کسی دوسری چیز سے چالیس مرتبہ مارنا، کیوں کہ رسول اللہ نے شراب پینے پر کھجور کی ٹہنیوں اور جوتوں سے چالیس مار مارے۔(بخاری: کتاب الحدود، باب الضرب بالجرید والنعال ۶۴۰۵، مسلم: کتاب الحدود، باب حد الخمر ۳۳۰۵)

مکلّف آزاد مسلمان شخص کی طرف سے کسی پاک دامن پر زنا کا الزام لگانے، باندی کے ساتھ حرام جماع کرنے اور اپنی بیوی کے ساتھ پچھلی شرمگاہ میں جماع کرنے کا الزام لگانے کی صورت میں اسّی کوڑے مارنے کی سزا ہے جیسا کہ اس فرمانِ الٰہی میں ہے: ''وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ'' (نور۴) (اور جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں) محصنات سے مراد پاک دامن عورتیں ہیں، ان کا مسلمان، بالغ اور عاقل ہونا ضروری ہے، جیسا کہ اس فرمان

الٰہی میں ہے: ''فَاِذَا اُحْصِنَّ'' (نساء ۲۵) (پس جب وہ نکاح میں لے آئی جائیں) محصنات سے مراد آزاد بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے تذکرہ کیا ہے کہ باندیوں کی حد آزاد عورتوں کی حد کی آدھی ہے، اس کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں ہے: ''فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ'' (نساء ۲۵) پس ان (باندیوں) پر اس کا آدھا ہے جو آزاد عورتوں پر ہے۔

محصنات کا لفظ شادی شدہ عورتوں کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ'' (نساء ۲۴) (اور شادی شدہ عورتیں) یہ کلمہ نکاحِ صحیحہ میں جماع کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ اس فرمان الٰہی میں ہے: ''مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ'' (نساء ۲۴) نکاح کا رشتہ قائم کرنے کے لیے، مستی نکالنے کے لیے نہیں۔

۔غیر شادی شدہ کی طرف سے زنا کی صورت میں بھی کوڑے مارے جاتے ہیں، اس کی سزا سو کوڑے ہیں جیسا کہ اس فرمان الٰہی میں ہے: ''اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِاَةَ جَلْدَةٍ'' (نور ۲) (زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورت؛ ان میں سے دونوں کو سو کوڑے مارو) اس کے دلائل احادیث نبویہ میں بھی ہیں جن کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔(بخاری: کتاب الحدود، باب الاعتراف بالزنا ۶۴۵۳، مسلم: کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنا ۳۲۹۶)

۔غلام یا باندی ہو تو اس کی سزا آزاد کے مقابلہ میں آدھی ہے، اگر سزا کے دوران کوئی مرجائے تو اس کا خون ہدر ہے یعنی سزا دینے والے سے قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی، اسی لیے باندی کو زنا کرنے، شراب پینے اور دوسرے پر زنا کا الزام لگانے کی صورت میں آزاد عورت کی آدھی سزا دی جائے گی۔یعنی اگر غیر شادی شدہ باندی زنا کرے تو اس کو پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔اگر وہ کسی پاکدامن عورت پر زنا کا الزام لگائے تو اس کو چالیس کوڑے مارے جائیں گے۔

۔حاملہ پر حد نافذ نہیں کی جائے گی چاہے وہ زنا کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہو، بچہ ہونے تک انتظار کیا جائے گا۔(یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے: مسلم: کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ الزنا ۱۶۹۵، ابو داود: کتاب الحدود، باب المرأۃ التی أمر النبی ﷺ برجمها من جهينة ۴۴۴۰) اور حاملہ

عورت دودھ بھی پلائے گی۔ جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہوجائے گی تو بچہ کی دیکھ ریکھ کرنے کے لیے اس کو حق دار ولی کے حوالہ کیا جائے گا اور اس کو دوسری عورت کا دودھ اور غذا دی جائے گی یا کسی پالتو جانور کا دودھ مہیا کیا جائے گا جس کا دودھ پینا حلال ہو۔

۔کوئی شخص نشہ میں ہو تو نشے سے باہر آنے تک اس پر حد نافذ نہیں کی جائے گی اور بیہوش پر ہوش میں آنے سے پہلے حد نافذ نہیں کی جائے گی، اور ایسی بیماری میں بھی حد نافذ نہیں کی جائے گی جس سے شفا یابی کی امید ہو، اگر شفا یابی کی امید نہ ہو تو کھجور یا کسی درخت کی ایسی ٹہنی سے ایک مرتبہ مارا جائے گا جس پر سو شاخیں ہوں، اس طرح مارا جائے گا کہ سبھی ٹہنیاں اس کے جسم کو چھو جائے یا ایک دوسرے پر گر جائیں۔

سخت گرمی یا سخت ٹھنڈی میں حد نافذ کی جائے گی۔

اگر قتل یا سنگ ساری کی سزا ہو تو سخت ٹھنڈی اور سخت گرمی میں حد نافذ کی جائے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو سنگ سار کیا جاتا ہے یا قتل کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس کو ٹھنڈی یا گرمی میں مارا جائے، حدود نافذ کرنا واجب ہے۔ (ایک قول یہ ہے کہ اگر اقرار کی وجہ سے حد ثابت ہو تو اس کو موخر کیا جائے گا، کیوں کہ کبھی وہ پتھر مارنے کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔ دیکھا جائے: ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۴/۱۶۲۹)

البتہ کوڑے مارنے کی سزا میں سخت گرمی یا سخت ٹھنڈی ختم ہونے تک انتظار کرنا ضروری ہے، اسی طرح چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کو بھی موخر کرنا واجب ہے، اگر حد ایسے شہر میں نافذ کی جا رہی ہو جہاں ہمیشہ سخت ٹھنڈی یا سخت گرمی رہتی ہو تو پھر موخر نہیں کیا جائے گا۔

۔جلاوطنی کی سزا مخنث کو دی جاتی ہے۔

مخنث یعنی وہ مرد جو چال ڈھال یا کپڑوں یا بات کرنے کے انداز یا دوسرے کے ساتھ پیش آنے میں نزاکت وغیرہ میں عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے (جو مردوں کے لائق نہ ہو) کی سزا جلاوطنی ہے تاکہ یہ دوسرے کے لیے سامانِ عبرت بن جائے، مخنث کے مظاہر میں سے یہ ہے کہ ہتھیلیوں میں اور پیروں میں کسی عذر کے بغیر مہندی لگائے یا اس

کے مشابہ کوئی دوسرا کام کرے، اس کا لواطت کرنا شرط نہیں ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں میں سے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والوں اور عورتوں میں سے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔ (بخاری: کتاب اللباس، باب اخراج المشتبهين بالنساء من البيوت ۵۵۵۴)

یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کا لباس پہنتی ہیں۔ (ابوداود: کتاب اللباس، باب فی لباس النساء ۳۵۹۲، ترمذی: ابواب الادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی المشتبهات بالرجال من النساء ۲۷۷۹) امام ابوداود نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی جس طرح عورتیں لگاتی ہیں۔ آپ نے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ آپ سے کہا گیا: اس نے عورتوں کی مشابہت اختیار کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقام نقیع جلاوطن کیا۔ یہ مدینہ سے ۱۶/فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔ (ابو داود : كتاب الادب، باب فی الحكم فی المخنثين ٤٣٠١)

مخنث کی طرح ایسی معصیت کا ارتکاب کرنے والا بھی ہے جس کے لیے کوئی حد اور کفارہ مقرر نہ ہو، مثلاً وہ ڈاکو جو نہ چوری کرتا ہو اور نہ کسی کو قتل کرتا ہو۔ اس کی سزا شہر سے جلاوطن کرنا ہے اور جلاوطنی کی مدت کا تعین حاکم کرے گا، کوئی مدت متعین نہیں ہے۔

غیر شادی شدہ آزاد زانی کی جلاوطنی کی مدت ایک سال ہے، اگر وہ غلام ہے تو آدھی مدت ہے یعنی چھ ماہ۔ (مسلک کا یہی اُصح قول ہے، یہی بات بغوی نے کہی ہے "التھذیب" ۷/ ۳۱۸ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جب تم میں سے کسی کی باندی زنا کرے تو اس پر بطورِ حد کوڑے لگاؤ"۔ بخاری ۲۱۵۲، مسلم ۱۷۰۳۔ آپ نے جلاوطن کرنے کا حکم نہیں دیا، جلاوطنی کی سزا عار دلانے کے لیے ہے اور غلام کے لیے اس میں کوئی عار نہیں ہے، کیوں کہ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس کے منافع آقا کے لیے ہوتے ہیں، اگر اس کو جلاوطن کیا جائے گا تو اس کے آقا کا نقصان ہے۔ التھذیب ۷/ ۳۱۷) چاہے وہ غلام مبعّض ہو یعنی جو آدھا آزاد اور آدھا غلام ہو۔ جرائم کی صورت میں غلام کے آقا کے حقوق کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،

اگرغلام اسلام لانے کے بعد مرتد ہوجائے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

۔زنا کی طرح لواطت بھی ہے۔اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان فرق کیا جائے گا۔(کیوں کہ اللہ تعالی نے اس عمل کو"فاحشہ" کہا ہے،فرمانِ الٰہی ہے:"ولوطاً إذقال لقومه أتأتون الفاحشة " (الأعراف ۸۰) اوراللہ تعالی کا یہ بھی فرمان ہے:" قل إنما حرم ربی الفواحش"(الأعراف ۳۲)دیکھا جائے"کفاية الأخيار " تقی الحفی ۲/۲٤٥۔ "التهذيب" بغوی ۷/۳۲۱) اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو سنگ سار کیا جائے گا، اگر غیر شادی شدہ ہے تو ایک سو کوڑے مارے جائیں گے۔البتہ جس کے ساتھ لواطت کی گئی ہے اس کو سو کوڑے مارے جائیں گے اوراس کوایک سال جلاوطن کیا جائے گا چاہے وہ شادی شدہ ہی ہو،لواطت ثابت ہونے کے لیے چار گواہوں کی گواہی ضروری ہے جس طرح زنا کے ثابت ہونے میں ہے۔

۔جانوروں کے ساتھ فحش کام کرنے کی صورت میں تعزیر ہے:

مادہ جانور کے ساتھ فحش کام کرنے کی صورت میں تعزیر ہے۔(مسلک کا یہی قول اظہر ہے، یہی بات نووی نے کہی ہے اور دوسروں نے بھی یہ بات کہی ہے، کیوں کہ اس قبیح عمل کی زجر وتوبیخ حد سے نہیں ہوتی ہے، دیکھا جائے "عجالة المحتاج" ابن ملقن ۴/۱۶۲۳) کیوں کہ فطرت سلیمہ اس عمل سے نفرت کرتی ہے اوراس طرح کے گھٹیا لوگ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں،اسی وجہ سے اس کی حد مقرر نہیں کی گئی ہے،سزا کی مقدار متعین کرنے کا حق قاضی کا ہے،جس گناہ کی سزا یا کفارہ شریعت میں نہیں ہے تو اس کی سزا تعزیر ہے۔

حد اور تعزیر کے درمیان تین فرق ہیں: اول یہ کہ حدود میں سبھی لوگ یکساں ہیں،البتہ تعزیر میں لوگوں کے اعتبار سے الگ الگ سزائیں دی جاسکتی ہیں،بعض لوگوں پر اگر عوام کے سامنے تھوک دیا جائے تو دوسرے کو مارنے سے بھی زیادہ عار کی بات ہوتی ہے اوراس پر زیادہ اثر ہوتا ہے،بعض لوگوں پر مار اثر کرتی ہے اور بعض لوگوں پر تاوان اثر انداز ہوتا ہے،بعض لوگوں کے لیے قید مؤثر ہوتی ہے،مقصد یہ ہے کہ وہ گناہ سے باز رہے۔

۲۔حدود میں سفارش نہیں چلتی،اوراس پر حد نافذ کرنا ضروری ہے جس پر حد لازم

ہوگئی ہے جب کہ تعزیر میں سفارش اور واسطہ بننا جائز ہے۔

۳۔حدود معاف نہیں ہوتے ہیں،البتہ تعزیر میں معافی جائز ہے،تعزیر میں یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی حد سے کم سزا ہو،اور کم سے کم حد شراب کی ہے یعنی چالیس کوڑے۔

معلم اپنے شاگرد کو مار کر تنبیہ کرسکتا ہے،البتہ افضل یہ ہے کہ طالبِ علم کو بھلائی کی ترغیب دے، یہ بھی ممکن ہے کہ معلم اپنے شاگرد کو ایک سے زائد مرتبہ اپنا درس لکھنے کا پابند بنائے،مارنے اور تعزیر کرنے کے مقابلے میں یہ طریقہ بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی أعلم

چوری کے احکام اور اس کی سزا

"سرقۃ" کے لغوی معنی مال کو چپکے سے لینے کے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں مال کو چپکے سے ظلم کر کے لینا، جس کی چند شرطیں ہیں: وہ مال نصاب کو پہنچے اور حرزِ مثل (یعنی حفاظت) میں رکھا ہوا ہو اور چوری کرنے والے کی ملکیت یا بیٹا ہونے کا شبہ نہ ہو۔

اسی وجہ سے مال دوسرے شخص کے ہاتھ سے چھیننے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اسی طرح کسی کے ہاتھ سے مال لے اور بھاگ جائے تو بھی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، امانت میں خیانت کرنے سے بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ہاتھ کاٹنے کے لیے یہ شرط ہے کہ چوری کیا ہوا مال پاؤ دینار یا اس کی قیمت کے بقدر چیز ہو:

چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے یہ شرط ہے کہ چوری کیا ہوا مال خالص سونے کا پاؤ دینار ہو یا قیمت میں اس کے برابر ہو، کیوں کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"چور کا ہاتھ پاؤ دینار سے کم میں نہیں کاٹا جائے گا"۔ (بخاری: کتاب الحدود، باب قولہ اللہ تعالی "والسارق و السارقة فاقطعوا أيديهما" (مائدة ۳۸) ۶۴۱۹، مسلم: کتاب الحدود، باب حد السرقۃ ونصابہا ۳۲۷۶)

چور نے مال حرزِ مثل سے لیا ہو:

چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس نے یہ مال حرزِ مثل سے لیا ہو مثلاً سونا اس کی حفاظت کے لیے مخصوص صندوق سے نکال لے۔ یا کتاب اس کے لیے مخصوص کی ہوئی الماری سے لے، یا برتن مطبخ سے لے۔ اس بنیاد پر اگر کوئی سونا وہاں سے لے جہاں کتابیں رکھی جاتی ہیں، یا کتاب گھر کے باہر پڑی ہوئی ہو اور وہ اٹھالے تو اس صورت میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں چوری کیا ہوا مال حرزِ مثل یعنی اس چیز کی حفاظت کے

لیے تیار کردہ جگہ سے نہیں لیا ہے۔

چوری کیا ہوا مال حرزِ مثل سے لینا واجب ہونے کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

''جانوروں میں سے کسی میں بھی ہاتھ کاٹنا نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کو باڑھ میں رکھا گیا ہو، جو کوئی پھل اس کو گودام میں رکھنے کے بعد چوری کرے اور اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا''۔ (ابوداود: کتاب اللقطۃ، باب التعریف باللقطۃ ۱۷۱۰، طحاوی ''شرح معانی الاثار'' ۶۵/۴ ''معجم الوسیط'' طبرانی ۱۹۸۳، یہ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے ہے)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جانوروں اور پالتو جانوروں کی چوری کرنے کی صورت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے، البتہ اگر اس کو رات کے وقت رکھی جانے والی جگہ سے چرایا جائے تو ہاتھ کاٹنا ہے۔

اسی طرح پھل چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اسی وقت کاٹا جائے گا جب پھل پختہ ہونے کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کی جگہ پر رکھا جائے اور اس کی قیمت تین درہم ہو جائے، امام شافعی کے زمانے میں ایک مثقال سونے کی قیمت ۱۲ درہم تھی، البتہ سونے کی قیمت کو آج کے قیمت سے اندازہ لگانا ضروری ہے، کیوں کہ زمانہ اور جگہ کے اعتبار سے سونے کی قیمت بدلتی ہے، اسی طرح حرزِ مثل میں بھی ہر زمانے کے حالات کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی ہے اور اس میں رکھے جانے والے کے اعتبار سے بھی فرق پڑتا ہے، اسی طرح حالات بھی بدلتے رہتے ہیں، اس لیے مامون زمانے اور غیر مامون زمانے میں فرق ہے، اعتبار شہر کے عرف کا ہوتا ہے۔ (یہی بات امام نووی نے ''روضۃ الطالبین'' میں کہی ہے ۴۳۴/۸)

اس میں شبہ نہ ہو، یہ شبہ ملکیت کا ہوتا ہے چاہے وہ مال مشترک ہو، اور شبہ بچہ ہونے سے ہوتا ہے، زوجیت کے شبہ کا اعتبار نہیں ہے:

اگر چور ہونے میں شبہ ہو جائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، شبہ کی مندرجہ ذیل دو قسمیں ہیں:

۱۔ ملکیت کا شبہ مثلاً چوری کیا ہوا مال چوری کرنے والے کا ہو جس کو اس نے اس شخص

کے پاس رہن کے طور پر رکھا ہو جس کے پاس سے چوری ہوا ہے، پھر وہ اس مال کو چوری کرے تو چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیوں کہ باوجود رہن میں رہنے کے ابھی تک اس کی ملکیت میں ہی ہے۔ اسی طرح اگر اجرت پر دینے والا اجرت میں دی ہوئی چیز میں سے چوری کرے تو چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیوں کہ اجرت کے عقد کی وجہ سے اجرت دینے والے کی ملکیت سے وہ مال نہیں نکلا ہے اور اس مال میں ملکیت کا شبہ ہے۔ (فقہاء شافعیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے دلیل دی ہے: ''جتنا ہو سکے تم مسلمانوں سے حدود کو دور کرو''۔ حاکم: کتاب الحدود ۴/۳۸۵، انہوں نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۵/۵۳۴)

جب چوری میں چوری کی سبھی شرطیں پائی جائیں تو اس کا داہنا ہاتھ سب سے پہلے کاٹا جائے گا، کاٹنے کی جگہ ہتھیلی اور کلائی کے درمیان کا جوڑ ہے، چاہے اس کے ہاتھ میں عیب ہو یا نہ ہو، چاہے اس کا ہاتھ شل ہی کیوں نہ ہو، البتہ شرط یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی وجہ سے اتنا خون نہ نکلے کہ اس کی زندگی کے لیے خطرہ پیدا ہو۔ اگر اس کے داہنے ہاتھ میں دو یکساں ہتھیلیاں ہوں تو دونوں ہتھیلیوں کو ایک ساتھ کاٹا جائے گا، اس کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے: ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا'' (مائدہ ۳۸) اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔

۔اگر داہنا ہاتھ کاٹنے کے بعد وہ دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا پھر اس کا بایاں ہاتھ پھر اس کا داہنا پاؤں کاٹا جائے گا، اگر اس کے بعد بھی وہ چوری کرے تو اس کی تادیب اور تعزیر کی جائے گی۔

دوبارہ کاٹے جانے کی صورت میں ہاتھ کلائی تک کاٹا جائے گا۔ البتہ پاؤں قدم کے جوڑ سے کاٹا جائے گا اور کٹی ہوئی جگہ کو گرم تیل میں ڈال دیا جائے گا تا کہ خون آنا بند ہو جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں سب سے بری چیز کسی برے کام کا عادی ہونا ہے، کیوں کہ عادت پڑنے کے بعد اس سے باز رہنا بڑا ہی دشوار بن جاتا ہے، میں نے بھروسہ مند آدمی

سے سنا ہے کہ اس نے ایک ایسے چور کو دیکھا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے، وہ اپنے منہ سے کسی گھر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ گھر میں داخل ہو کر چوری کرے۔

ایک ضعیف قول یہ ہے کہ اگر کوئی داہنے ہاتھ کے بجائے بایاں ہاتھ آگے بڑھائے، یا پاؤں کے بجائے ہاتھ، یا اس کے برعکس تو اس کا کاٹنا صحیح ہے۔ (بغوی نے اس کو صحیح کہا ہے ''التہذیب'' ۷/۳۸۶)

اسی طرح اگر پاؤں کے بدلے ہاتھ یا ہاتھ کے بدلے پاؤں کاٹا جائے تو یہ بھی کافی ہے۔ قول معتمد یہ ہے کہ کافی نہیں ہے، اور کاٹنے میں مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے داہنا ہاتھ کاٹا جائے گا پھر بایاں پاؤں پھر بایاں ہاتھ پھر داہنا پاؤں۔ اس صورت میں اگر چور داہنے ہاتھ کے بدلے بایاں ہاتھ آگے بڑھائے اور اس کو کاٹ دیا جائے تو یہ ہدر ہوگا اور داہنا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

۔چوری کیا ہوا مال اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے اگر وہ مال باقی ہو، ورنہ اس کا معاوضہ دیا جائے گا جس طرح غصب کیے ہوئے مال کا حکم ہے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہاتھ کاٹنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے، بلکہ چور جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے چوری کیا ہوا مال مالک کو واپس کر دے گا، اگر چوری کیا ہوا مال موجود نہ ہو تو قیمت کے اعتبار سے اس کا بدل پیش کرے گا، اس کا حکم غصب کیے ہوئے مال کے حکم کی طرح ہے جس کو مالک کے پاس لوٹانا یا اس کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔ (یہی بات بغوی نے کہی ہے اور یہی ایک قول نقل کیا ہے ''التہذیب'' ۷/۳۸۶)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو چوری کیا ہوا مال واپس کرنا ضروری نہیں ہے، اگر وہ چوری کیا ہوا مال لوٹا دے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ (ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہاتھ کاٹنے اور تاوان دینے کو جمع نہیں کیا جائے گا، دیکھا جائے ''بدائع الصنائع'' کاسانی ۶/۳۶)

امام مالک کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ جس چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو اس کے مالدار ہونے کی صورت میں چوری کیا ہوا مال واپس کرنا ضروری ہے، اگر فقیر ہے تو اس کا کٹا ہوا ہاتھ چوری کیے ہوئے مال کا تاوان مانا جائے گا اور چوری کیا ہوا مال لوٹانا ضروری نہیں ہے۔ (''بدایۃ

المجتہد‘‘ ابن رشد ۲/۱۷۳) شوافع کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا اور یہ اللہ کا حق ہے، جس کا مقصد لوگوں کے مال کی حفاظت ہے، جہاں تک چوری کیا ہوا مال ہے تو وہ صاحبِ مال کا حق ہے، مال لوٹانا واجب ہونے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ’’ہاتھ پر وہ ضروری ہے جو لے‘‘۔ (مسند احمد ۲۰۰۹۸، ابوداود: کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ ۳۵۶۱، یہ روایت سمرہ بن جندبؓ سے ہے) البتہ اگر جس کا مال ہے وہ چور پر صدقہ کردے تو الگ بات ہے۔

یہ بات جاننا ضروری ہے کہ دوسرے شخص کا مال مذاق کے طور پر بھی چوری کرنا حرام ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ’’مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ مسلمان کو گھبراہٹ میں ڈالے‘‘۔ (مسند احمد ۲۳۱۱۴، ابوداود: باب من یأخذ الشئی علی المزاح ۵۰۰۴) ایسے مذاق سے چوکنا رہنا چاہیے، کیوں کہ یہ قضیہ حاکم تک پہنچ سکتا ہے اور اس وقت یہ دعوی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ اس نے مذاقاً چوری کی تھی، کیوں کہ جب قضیہ حاکم کے پاس پہنچتا ہے تو جس کا مال چوری کیا ہے اس کے معاف کرنے سے بھی معافی قبول نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکہ کے احکام ومسائل

’’قطع‘‘ کے لغوی معنی الگ کرنے کے ہیں۔ اور شرعی معنی کسی کا مال ظلم کرکے لینے کے لیے سامنے آنا ہے چاہے قتل کرکے مال لے یا راستے میں گذرنے والوں کو گھبراہٹ میں ڈال کر، وہ مدد کی جگہ سے دور رہ کر اپنی طاقت وقوت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ کام کرے۔ (دیکھا جائے: ’’أسنی المطالب‘‘ شیخ الاسلام زکریا ۴/۱۵۴، ’’اللباب‘‘ محاملی ۱/۳۷۵)

ڈاکہ ڈالنے کی حرمت کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے: ’’إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا‘‘ (مائدہ ۳۳) ان لوگوں کا بدلہ جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔

آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جو یہ کام کرتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والا ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو قتل کردیا جائے یا پھانسی دی جائے یا اس کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں یا اس کو جلاوطن کردیا جائے۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ڈاکوؤں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

۔ اگر ڈاکو قتل نہ کرے اور مال بھی نہ لے تو قید کرکے یا دوسری سزا کے ذریعہ اس کی تعزیر کی جائے۔

حاکم اس کو قید کرے گا یا اس کو کوڑے لگائے گا، یہ اس وقت ہے جب ڈاکو نے کسی کو قتل نہ کیا ہو اور کسی کا مال نہ لیا ہو، اس نے صرف گزرنے والوں کو ڈرایا ہو، کیوں کہ کوئی شخص ایسا کوئی کام کرتا ہے جس کی کوئی حد یعنی سزا نہ ہو اور نہ کفارہ ہو، اس کے شہر کے علاوہ دوسرے کسی شہر میں اس کو قید کرنا بہتر ہے تاکہ وہ توبہ کرلے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے۔

۔ اگر اس نے عمداً کسی معصوم الدم کو قتل کیا ہو اور لیا ہوا مال نصاب کی حد تک نہ پہنچا ہو تو

اس کو قتل کر دیا جائے گا یعنی جب ڈاکو کسی بالغ عاقل مسلمان کو عمداً قتل کرے تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

۔اگر اس کے برعکس کرے یعنی حرزِ مثل سے حد نصاب کو پہنچنے والا مال کسی شبہ کے بغیر لے اور قتل نہ کرے تو اس کا داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا۔ یہاں شبہ سے مراد ملکیت یا بچہ ہونے کا شبہ ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

اگر صاحبِ مال اپنا مال طلب کرے تو اس کا مال لوٹانا واجب ہے، اگر مال موجود نہ ہو تو ڈاکو اس کا ضامن ہوگا، صاحبِ مال اپنا چھینا والا مال معاف کر سکتا ہے، لیکن داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا ضروری اور لازم ہے کیوں کہ یہ اللہ کے حدود میں سے ایک حد ہے جس میں نہ کوئی سفارش چلتی ہے اور صاحبِ مال کے مطالبہ یا عدم مطالبہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

۔اگر وہ قتل کرے اور مال لے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا پھر غسل دینے اور کفن پہنانے اور نماز پڑھنے کے بعد تین دن تک سولی پر چڑھایا جائے گا، اس کو پھانسی دینے کا مقصد سزا میں سختی کرنا ہے تاکہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔

اگر پکڑے جانے سے پہلے ڈاکو توبہ کرے تو اس کی وہ سزا معاف ہو جاتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے:

توبہ کی وجہ سے جو سزا معاف ہوتی ہے وہ صرف ہاتھ پاؤں کاٹنے کی ہے، اگر ڈاکو پر قصاص ہو تو اس کو قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا، اسی طرح جو مال لیا ہے اس مال کو لوٹانا بھی توبہ کی وجہ سے معاف نہیں ہوتا ہے، یہ مال صاحبِ مال کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اگر حد زنا حاکم کے سامنے ثابت ہو جائے تو وہ ساقط نہیں ہوتی ہے، اسی طرح زنا کا الزام لگانے کی حد اور چوری کی حد بھی ساقط نہیں ہوتی ہے، توبہ کی وجہ سے جو حد ساقط ہوتی ہے وہ صرف مرتد ہونے اور نماز چھوڑنے کی حد ہے، اگر مرتد توبہ کرے تو اس کی حد ساقط ہو جاتی ہے۔

۔اللہ تعالی نے ڈاکو کے بارے میں بیان کیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے

خلاف جنگ کرنے والا ہے، اسی وجہ سے شریعت نے ڈاکو کے لیے جو سزا مقرر کی ہے وہ دو وجوہات کی بنا پر ہے؛ پہلی وجہ ڈاکہ ڈالنے کی ہے اور دوسری وجہ حقوق العباد کو پامال کرنے کی ہے، اگر ڈاکو کسی بری شخص کو قتل کر دے تو اس کو قصاص میں قتل کرنا شرعی طور پر واجب ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس نے ڈاکہ ڈالنے کے دوران ایک معصوم کو قتل کیا ہے۔ دوسرے اعتبار سے خون کے اولیاء کے چند حقوق ہیں، ان کا سب سے پہلا حق قصاص لینے یا دیت لینے کا ہے اگر وہ قصاص معاف کر دے، وہ مکمل دیت سے یا دیت کے کسی حصہ سے بھی دست بردار ہو سکتے ہیں، لیکن قتل کی حد ڈاکو سے ساقط نہیں ہوتی ہے کیوں کہ اس میں خون کے اولیاء کی معافی کا دخل نہیں ہے، مسافر ڈاکو کے حق میں اپنے مال سے دست بردار ہو سکتا ہے، لیکن حد باقی رہتی ہے اور اس کو نافذ کرنا ضروری ہے۔

۔ڈاکو میں طاقت ہونا شرط ہے، اس لیے ڈاکو میں اچکنے والا شامل نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکو مسلح ہو، البتہ اگر کوئی راستہ میں بیٹھتا ہو اور مسافر کے سامان میں سے کوئی چیز اچک لیتا ہو تو اس کو ڈاکو میں شمار نہیں کیا جائے گا، اگر اس کو پکڑا جائے تو صرف اس کی تعزیر کی جائے گی اور اس پر چور کی حد نافذ نہیں کی جائے گی۔

حیال اور جانوروں کی ضمانت کے احکام

(مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے "التهذیب" بغوی ۷/۴۳۱، "مغني المحتاج" ۶/۱۹، "أسنى المطالب" ۴/۱۶۶)

حِیال کے لغوی معنی کسی چیز پر حملہ کرنے کے ہیں۔شرعی اور اصطلاحی معنی کسی حق کے بغیر کسی مخصوص چیز پر حملہ کرنے کے ہیں۔

ہر شخص کو اپنے اوپر حملہ کرنے والے کا جواب دینے کا حق ہے اور کسی بھی مظلوم کے لیے اپنا دفاع کرنا جائز ہے چاہے حملہ آور زیادتی کرنے والا مسلمان ہو یا کافر، آزاد ہو یا غلام، مکلّف ہو یعنی بالغ اور عاقل ہو یا غیر مکلّف یعنی بچہ یا پاگل، اگر ان میں سے کوئی کسی شخص پر ظلم کرنے لگے تو اس کو اپنے دفاع، اپنے اعضاء اور مال کے دفاع کا حق ہے چاہے مال کم ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح اپنی چیزوں مثلاً گھر اور جانوروں کا بھی دفاع کرنے کا حق ہے، دوسروں کی ملکیت کی چیزوں مثلاً دوسروں کے گھر، حیوان اور شرافت اور عزت کا بھی دفاع کرنے کا حق ہے۔اسی طرح شرافت وعزت پر زیادتی کے پیش خیمہ مثلاً بوس وکنار اور گردن میں ہاتھ ڈالنے کی صورت میں بھی دفاع کا حق ہے۔

اس کا اصول وقاعدہ یہ ہے کہ ہر شخص ظلم وزیادتی کے کسی بھی مظہر کے خلاف دفاع کا حق رکھتا ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ”فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ“ (البقرة ۱۹۴) (پس جو تم پر زیادتی کرے تو اس پر اسی طرح زیادتی کرو جس طرح کہ اس نے تم پر زیادتی کی ہے) اس میں یہ بھی شامل ہے کہ حقوق کا دفاع کیا جائے اور ظلم وزیادتی سے روکا جائے تاکہ حقوق چھینے نہ جائیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ

ظالم ہو یا مظلوم"۔(بخاري: كتاب المظالم والغضب، باب: أعن أخاك ظالماً أو مظلوماً ۲۴۴۳، ترمذي: كتاب الفتن ۲۲۵۵) صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے تو وہ شہید ہے، اور جو اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے تو وہ شہید ہے، اور جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے تو وہ شہید ہے"۔

(بخاري: كتاب المظالم، باب من قتل دون ماله ۲۳۶۸، ترمذي: أبواب الديات عن رسول الله ﷺ، باب ماجاء فيمن قتل دون ماله فهو شهيد ۱۳۷۹)

اگر حملہ آور سے اپنے مال اور جان کا دفاع کرتے ہوئے کوئی قتل ہو جائے تو وہ شہید ہے، البتہ اس دفاع میں شروع میں ہی حملہ آور کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہلکا وار کیا جائے گا، پھر تھوڑا سخت، اگر قتل کے بغیر وہ ہٹنے والا نہ ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا، اس صورت میں نہ اس پر قصاص ہوگا اور نہ دیت ہوگی۔

یعنی دفاع کی صورت میں شروع میں ہی حملہ آور کو قتل نہ کرے بلکہ اس سے بھاگنے کی کوشش کرے، پھر سخت زبان استعمال کرے، اگر وہ نہ ہٹے تو مدد کے لیے دہائی دے، اگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو تو وہ اس کو ڈنڈے سے مار سکتا ہے، اگر اس سے بھی باز نہ آئے تو تلوار کا استعمال کر سکتا ہے، اگر حملہ آور اپنا دفاع کرے تو پہلے ہلکا وار کیا جائے پھر سخت وار کیا جائے، اگر دفاع کرنے والا حملہ آور کو مارنے اور قتل کرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کا خون ہدر ہے اور مارنے والے پر نہ دیت ہے، نہ قصاص اور نہ اس پر قتل کا کفارہ ہے۔

اگر حملہ آور معصوم الدم نہ ہو مثلاً وہ حربی کافر ہو یا مرتد ہو تو شروع میں ہی اس کو قتل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا خون معصوم نہیں ہے، اگر دفاع کرنے والا دیکھے کہ حملہ آور اجنبی عورت پر زیادتی کر رہا ہے تو اس کو قتل کر سکتا ہے کیوں کہ عزت کا دفاع کرنے میں تاخیر نہیں ہے۔

اگر دفاع کرنے والے اور حملہ آور کے درمیان لڑائی ہو جائے اور دفاع کرنے والے کو اس کا قتل کیے بغیر چارہ نہ ہو تو دفاع کی مذکورہ ترتیب کی پابندی کیے بغیر اس کو قتل کر سکتا ہے۔(شیخ الاسلام زکریا کی بات کا یہ خلاصہ ہے "أسني المطالب" ۴/۱۶۷)

جرائم کے احکام ومسائل

اس باب میں کسی کے جسم پر زیادتی کرنے کے احکام بیان کیے گئے ہیں، جب کہ اس سے پہلے غصب کے باب میں مال پر زیادتی، چوری کے باب میں مال کی چوری کر کے اس پر زیادتی اور ڈاکہ کے باب میں ڈاکہ ڈال کر مال پر زیادتی کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

جرم میں زخمی کرنا اور کاٹنا دونوں شامل ہے، اسی طرح جادو یا تلوار یا کسی بھاری چیز مثلاً پتھر اور گولی سے مارنا یا بھوکا رکھ کر مار ڈالنا یا زہر دے کر مارنا یا دوسرے سے قتل کرانا داخل ہے، ان سبھی صورتوں میں قصاص کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "الوسیط" غزالي ٦٥١/٦، "روضة الطالبين" ١٢٢/٩، "اللباب "محاملي ٣٣٨/١، "فتح الوهاب "شيخ الاسلام زكريا ١٢٦/٢)

جرائم کے باب کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ" (بقرة ١٧٨) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر قصاص فرض کردیا گیا ہے۔

صحیح احادیث میں بھی اس کے دلائل ملتے ہیں مثلاً بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے سوائے تین میں سے ایک صورت میں: شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان اور اپنے دین کو ترک کرنے والا جماعت کو چھوڑنے والا"۔ (بخاري: كتاب الديات، باب قول الله تعالى: أن النفس بالنفس والعين بالعين ٦٨٧٨، مسلم: كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، باب مايباح به دم المسلم ١٦٧٦)

جان میں قصاص واجب ہے؛ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو قصاص میں اس کا قتل واجب ہے۔ عضو میں قصاص واجب ہے؛ اگر کوئی کسی کا ہاتھ کاٹ دے تو قصاص میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ معنی یعنی صفت میں قصاص واجب ہے: مثلاً مارنے کی وجہ سے

بصارت چلی جائے؛ اگر کوئی شخص دوسرے کی آنکھ کی بصارت کسی بھی ذریعہ سے ختم کردے تو قصاص واجب ہے، معنی سے مراد معنوی امور ہیں، اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ یا کان یا ناک یا زبان میں کوئی عمل کرے جس کی وجہ سے بصارت یا سماعت یا سونگنے کی صلاحیت یا چکھنے کی صلاحیت ختم ہوجائے یا اس کے حواس میں سے احساس کی کوئی طاقت چلی جائے تو یہ کام کرنے والے سے قصاص کے شرائط کے مطابق قصاص لیا جائے گا، اسی طرح اگر کسی کو زخمی کرے تو اس میں بھی قصاص ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ مقتول قاتل کے برابر ہو۔ جان میں یہ ہے کہ مجرم مظلوم کے مقابلہ میں آزادی یا اسلام یا اصل یا سیادت میں بڑھا ہوا نہ ہو۔

یعنی جان، عضو، عضو کی صلاحیت اور زخم میں قصاص واجب ہونے کے لیے چند شرطیں ہیں، ایک شرط یہ ہے کہ مقتول کی معصومیت، اس لیے ذمی کو کافر حربی کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ حربی کافر کے لیے عصمت نہیں ہے، اسی طرح قاتل اور مقتول کے درمیان برابری پائی جانی ضروری ہے؛ اگر قاتل آزادی یا اسلام یا اصل ہونے یا آقا ہونے کی وجہ سے مقتول سے افضل ہو تو اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

مثلاً اگر کوئی آزاد غلام کو قتل کردے تو آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، مسلمان اگر کافر کو قتل کردے تو مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، اصل یعنی باپ دادا کو فرع یعنی اولاد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، اگر باپ یا ماں بیٹے کو یا پوتے کو قتل کردے تو ان کو اس کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، سیادت کی مثال یہ ہے کہ آقا اپنے غلام کو قتل کردے تو آقا کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔

ان لوگوں کے حق میں قتل کرنا ممنوع ہے۔ البتہ ان کی تعزیر کرنا جائز ہے چاہے ان کو عمر قید کی سزا دی جائے، یہ سزا قاضی کے اختیار میں ہے، قاضی جانتا ہے کہ مصلحت کس میں ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ قاتل کو سزا دیے بغیر چھوڑنا صحیح نہیں ہے۔

عضو اور عضو کی صلاحیت میں بھی برابری شرط ہے کہ تخلیقی سلامتی میں مجرم مظلوم سے افضل نہ ہو۔

اعضاء میں بھی برابری شرط ہے، اسی طرح معنی یعنی اعضاء کی صلاحیت میں قصاص لینے کے لیے برابری شرط ہے کہ مجرم آزادی، اسلام، اصل ہونے اور آقا ہونے میں مظلوم سے افضل نہ ہو۔

اسی بنا پر غلام کے ہاتھ کے بدلے آزاد کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا، کافر کے ہاتھ کے بدلے مسلمان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، بیٹے کے ہاتھ کے بدلے ماں کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا، غلام کے ہاتھ کے بدلے آقا کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا، فالج زدہ ہاتھ کے بدلے صحیح ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔

مخصوص نام میں بھی برابری شرط ہے یعنی بائیں ہاتھ کے بدلے داہنا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا، معنی میں بھی برابری شرط ہے، یعنی ہاتھ شل کرنے کی صورت میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، بلکہ اس کے ہاتھ پر ایسی مار ماری جائے گی کہ اس کی حرکت کرنے کی صلاحیت اور طاقت ختم ہو جائے، کیوں کہ معنی میں ہاتھ موجود ہے، لیکن اس کی طاقت ختم ہوگئی ہے۔

اگر جرم کسی عضو میں کیا گیا ہو، مثلاً کسی نے دوسرے کی آنکھ نکالی ہو تو اس کے بدلے میں مجرم کی آنکھ نکالی جائے گی، البتہ معنی میں آنکھ اپنی حالت پر باقی ہو تو مظلوم کی آنکھ کے مقابلے میں مجرم کی آنکھ کی بصارت ختم کی جائے گی۔

مذکورہ شرطیں ہی زخم میں بھی منطبق ہوتی ہیں یعنی آزاد ہونا، مسلمان ہونا، اصل، سیادت وغیرہ، اگر مجرم اور مظلوم دونوں برابر ہیں تو زخم کے حجم کا اعتبار ہوگا، اگر زخم ایک انچ کے برابر ہو جس کی تعیین سر میں اسکیل کے ذریعہ کی گئی ہو تو کسی آلہ کے ذریعہ مجرم کے سر میں اتنا ہی زخم کیا جائے گا اور زخم کے حجم کی تاکید ضروری ہے۔

قتل اور جرم کی تین قسمیں ہیں:

واجب، مباح اور حرام۔

قتل واجب کی مثال یہ ہے کہ حربی کافر، مرتد، ڈاکو، شادی شدہ زانی اور تارکِ نماز کو قتل کیا جاتا ہے۔

جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرے تو اس کا قتل واجب ہے، اسی طرح مرتد، ڈاکو

اور شادی شدہ زانی کا قتل بھی واجب ہے، تارکِ نماز اگر توبہ نہ کرے اور نماز کے انکار پر اصرار کرے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے۔

مباح قتل کی مثال یہ ہے کہ جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو تو اس کو قتل کرنا واجب نہیں ہے؛ کیوں کہ مقتول کے اولیاء قصاص کے بدلے دیت لے سکتے ہیں اور قصاص کے ساتھ دیت کو بھی معاف کر سکتے ہیں۔ (حدیث نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''جس کا کوئی شخص قتل کیا جائے تو اس کو دو میں سے بہتر کا اختیار ہے: یا تو وہ قصاص لے یا اس سے دیت لے''۔ بخاری: کتاب اللقطۃ، باب کیف تعرف لقطۃ اہل مکۃ ۲۴۳۴، مسلم: کتاب الحج، باب تحریم مکۃ وصیدھا ۱۳۵۵۔ ۴۴۷، یہ روایت ابو ہریرہؓ سے ہے)

حرام قتل: کسی حق کے بغیر قتل کرنا حرام ہے مثلاً اسلامی ملک میں امان لے کر داخل ہونے والے کافر کو قتل کرنا، اسی طرح کسی حق کے بغیر مسلمان کو قتل کرنا۔

بغیر حق کے خون بہانا حرام ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا'' (نساء: ۹۳) (اور جو کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا) صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کو قتل کرنا اللہ کے نزدیک دنیا اور اس میں موجود سبھی چیزوں کے ختم ہونے سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے''۔ (نسائی: کتاب الاعتکاف: تعظیم الدم ۳۳۳۰، المعجم الاوسط طبرانی: ۴۴۴۴، السنن الکبری بیہقی: باب تحریم القتل ۸/۲۲، مسند بزار: ۶/۳۰۵)

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے: ''جو کوئی مومن کو کسی حق کے بغیر قتل کر دے تو اس کے لیے توبہ نہیں چاہے وہ توبہ کر لے''۔ (بخاری: کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب قولہ: ''والذین لا یدعون مع اللہ الٰہا آخر ولا یقتلون'' ۴۴۹۱۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: الزواجر: ابن حجر ہیتمی ۲/۹۰)

حق کے بغیر ظلم کر کے قتل کرنا کبیرہ گناہوں میں بھی بہت بڑا گناہ ہے، یہ دین سے مرتد ہونے کے بعد سب سے بڑا گناہ مانا جاتا ہے۔ (یہی بات بغوی نے ''التہذیب'' ۷/۴۷ میں اور ابن حجر نے ''الزواجر'' ۲/۹۴ میں کہی ہے) ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے آدھے لفظ سے مومن کے قتل پر تعاون کیا تو وہ اللہ سے اس حال میں

ملے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا : اللہ کی رحمت سے مایوس شخص‘‘۔(ابن ماجہ: کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً ۲۶۲۰، السنن الکبری للبیہقی: کتاب النفقات، باب تحریم القتل من السنۃ ۲۲/۸، مسند ابی یعلی: ۱۰/ ۲۰۶، بویصری نے ’’الزوائد‘‘ میں اس کو ضعیف کہا ہے: ۲/۳۳۴)

جرم کی تین قسمیں ہیں: عمد، شبہِ عمد اور خطا۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ’’الوسیط‘‘ غزالی ۶/۲۵۴۔ مغنی المحتاج‘‘ ۵/۲۹۲)

عمد: ارادہ کے ساتھ کوئی جرم کرے اور وہی شخص مقصود ہو اور ایسی چیز سے جرم کرے جو عام طور پر ضائع کرنے والی ہو۔

جنایہ عمد سے مراد عمداً جرم کرنا اور وہی شخص مقصود ہو جس پر جرم کیا گیا ہو اور ایسی چیز سے جرم کرے جو عام طور پر ضائع کرنے والی ہو مثلاً زید کو قتل کرنے کے ارادہ سے تلوار سے مارے، یا زید کا ہاتھ کاٹنے کے ارادہ سے تلوار سے مارے۔ تلوار سے مارنے میں عام طور پر قتل ہوتا ہے اور ہاتھ کٹ جاتا ہے، اگر کوئی شخص زید کو قتل کرنے یا اس کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کرے اور اس کو تلوار سے مارے تو اس کو جنایہ عمد کہا جائے گا اور اس سے قصاص واجب ہوجاتا ہے۔

شبہ عمد یہ ہے کہ کام یا شخص کا ارادہ ایسی چیز سے کرے جو عام طور پر ضائع کرنے والی نہ ہو۔

جنایہ شبہ عمد سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان پر ایسی چیز کے ذریعہ جرم کا ارادہ کرے جو عام طور پر قتل تک پہنچانے والی نہ ہو، مثلاً کسی شخص کے سرین میں سوئی گھسائے اور اس کی وجہ سے اس شخص کی موت ہوجائے، اس صورت میں یہ شبہ عمد ہوجائے گا، کیوں کہ اس نے ایسے ذریعہ سے جرم کا ارادہ کیا جس سے بہت ہی کم قتل ہوتا ہے، یا کسی شخص کو ہلکے ڈنڈے سے مارے اور اس کی وجہ سے موت ہوجائے، کیوں کہ ہلکے ڈنڈوں سے عام طور پر موت نہیں ہوتی ہے اور نہ کبھی کبھار موت ہوتی ہے، یہ اس وقت ہے جب ڈنڈے سے ایسے شخص کو مارے جس کو مار برداشت کرنے کی قوت ہو اور اس کو مسلسل اور زور سے نہ مارا جائے، شبہِ عمد میں قصاص نہیں ہے۔ (اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت ہے)

خطا یہ ہے کہ کام کرنے کا مقصد نہ ہو یا وہی شخص مقصود نہ ہو: قتل خطا سے مراد کام کرنے کا ارادہ نہ ہو، مثلاً کسی آدمی کا پیر پھسل جائے اور وہ کسی دوسرے شخص پر گر جائے اور اس وجہ سے وہ مر جائے۔ یا پرندے کا نشانہ لے کر گولی چلائے اور وہ گولی کسی انسان کو لگ جائے، جس کی وجہ سے اس کا انتقال ہوجائے، یا دور سے سایہ دیکھے اور اس کو درخت گمان کرکے تیر چلائے۔ یعنی اس کا مقصد وہ کام کرنے کا تو ہو لیکن وہی شخص مقصود نہ ہو، اس صورت میں قتل خطا میں استعمال کیے جانے والے آلہ کا اعتبار نہیں ہے کہ وہ قتل کرنے والا ہے یا نہیں، کیوں کہ قتل خطا میں قصاص نہیں ہے۔

عمد اور خطا میں قصاص نہیں ہے، البتہ دیت واجب ہوجاتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ’’وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلٰى أَهْلِهِ‘‘ (نساء۹۲) اور جو کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو ایک مومن غلام/ باندی آزاد کرے اور اس کے گھر والوں کو دیت ادا کرے۔

امام ابوداود وغیرہ کی روایت کردہ صحیح حدیث میں ہے جس کو ابن حبان نے بھی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’خطأ شبہ عمد کا مقتول کوڑے اور ڈنڈے کا مقتول ہے: اس میں ایک سو اونٹ ہیں جو مقتول کے اولیاء کو دیے جاتے ہیں‘‘۔ (ابوداود: کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطأ شبہ العمد ۳۹۶۲، صحیح ابن حبان: کتاب الدیات، ذکر وصف الدیۃ فی قتیل الخطأ الذی یشبہ العمد ۶۱۰۲)

عمد میں قصاص واجب ہونے پر اجماع ہے جس کے لیے چند شرطیں ہیں یعنی یہ جرم بغیر حق کے ہوا ہو، مجرم اور مظلوم میں برابری پائی جاتی ہو، مظلوم معصوم الدم ہو اور شرعی احکام کی پابندی کرنے والا ہو، اس سے چودہ مسائل مستثنی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اصل اپنی فرع کو قتل کردے: اصل مثلاً ماں اور باپ اوپر تک، فرع مثلاً بیٹا اور بیٹی نیچے تک، اگر باپ اپنی بیٹی کو قتل کردے تو بیٹی کے بدلے باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا، اس کی دلیل امام حاکم کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’بیٹے کے قتل کا قصاص اس کے باپ سے نہیں لیا جائے گا‘‘۔ (ترمذی: أبواب الدیات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب

ماجاء فی الرجل یقتل ابنہ یقاد منہ أم لا ۱۳۵۷، مستدرک حاکم: کتاب الحدود، ۸۱۷۲) کیوں کہ ماں اور باپ
بچے کے وجود میں آنے کے اصل ہیں اور بچہ اپنے باپ کے معدوم ہونے کا سبب نہیں بنتا
ہے۔ (دیکھا جائے "التھذیب" بغوي ۱۸/۷، امام مالک نے اس میں یہ قید لگائی ہے کہ اگر وہ بیٹے کو ایسی
صورت میں قتل کرے کہ اس میں کوئی شبہ نہ ہو، مثلاً اس کو تیر وغیرہ سے مارے، اگر اس کو لٹا کر ذبح کردے یا اس
کا پیٹ پھاڑ دے تو اس صورت میں اس سے قصاص لیا جائے گا)

اسی طرح باقی اصول بھی ہیں مثلاً دادا اور دادی، نانا اور نانی، یہ سب باپ کے حکم میں
ہیں، پوتا اور نواسا اور نواسی فرع کے حکم میں ہیں۔

۲۔کوئی اپنی فرع کے مورّث کو قتل کردے، یعنی اپنے فرع کو وارث بنانے والے
اصل کو قتل کردے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اپنی بیوی سے بیٹا ہو، اگر وہ اپنی اس بیوی کو
قتل کردے تو اس پر قصاص نہیں ہے، کیوں کہ اس نے اپنے بیٹے کے مورث کو قتل کیا ہے،
اس لیے بھی کہ اگر باپ اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے تو اس پر قصاص نہیں ہے، اسی طرح وہ اپنے
بیٹے کی ماں کو قتل کرتا ہے تو اس پر قصاص نہیں ہے کیوں کہ قصاص اس کے بیٹے کا حق ہے۔

۳۔مقتول کی تھوڑی وراثت اس کی طرف منتقل ہونے کی صورت میں مثلاً دو بھائیوں
میں سے کوئی ایک اپنے والد کو قتل کردے اور دوسرا ماں کو قتل کردے، اور بیوی باقی ہو تو باپ کو
قتل کرنے والے کو قتل نہیں کیا جائے گا اور ماں کو قتل کرنے والے کو قتل کردیا جائے گا،
کیوں کہ باپ کے قاتل کو باپ کی طرف سے اس کی وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔
(کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "قاتل کے لیے کچھ بھی نہیں ہے"۔ السنن الکبری للبیہقی: باب لا یرث
القاتل ۲۱/۶، المعجم الاوسط طبرانی: ۸۸۴، یہ روایت عمرو بن شعیب سے ہے) ماں اور دوسرا بیٹا باقی رہتے
ہیں، جو یہ دونوں ہی مقتول کی وراثت لیتے ہیں، جب دوسرا ماں کو قتل کرتا ہے تو باپ کے
قاتل کو ماں سے وراثت ملتی ہے اور منجملہ میراث جو اس کی طرف منتقل ہوتی ہے اس میں
قصاص کا حق بھی ہے، اور وہ خود سے قصاص نہیں لیتا ہے، اسی لیے اس سے قصاص ساقط
ہوجاتا ہے، وہ دیت کے آٹھ میں سے سات حصوں کا وارث بنتا ہے جس کی ادائیگی اپنے

بھائی اور اس کے بعد کے ورثاء کو دینا اس پر ضروری ہے، لیکن جس بھائی نے ماں کو قتل کیا
ہے وہ ماں کا وارث نہیں بنتا ہے اور ماں کی طرف سے اس کی وراثت اس کے بھائی کی
ہوجاتی ہے، اس وجہ سے باپ کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا اور ماں کے قاتل کو قتل
کردیا جائے گا، اس کے برعکس مسئلہ میں یعنی دو بھائیوں میں سے ایک ماں کو قتل کردے
اور اس کے بعد دوسرا باپ کو قتل کردے تو ماں کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا اور باپ کے
قاتل کو قتل کردیا جائے گا۔

۴۔آقا اپنے غلام کو قتل کردے، چاہے وہ غلام مکاتب ہو یا ام ولد ہو یا وہ غلام کے
بعض حصہ کا مالک، کیوں کہ قاتل اور مقتول میں برابری نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے آزادی
میں ان دونوں کے درمیان برابری نہ ہونے کی وجہ سے آقا سے قصاص نہیں لیا جائے گا، ہم
نے یہ بات پہلے بتادی ہے کہ اگرچہ غلام کو قتل کرنے کی صورت میں آقا سے قصاص نہیں لیا
جائے گا اور بیٹے کو قتل کرنے کی صورت میں ماں اور باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا البتہ
ان کی تعزیر کرنا ضروری ہے، اس کی تعیین قاضی اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق کرے گا۔

۵۔حربی کافر کسی کو قتل کرے چاہے وہ امان لیے ہوئے ہو، کیوں کہ وہ ہمارے احکام کا
پابند نہیں ہے، اس لیے حربی کافر غیر حربی کو قتل کرے تو قصاص نہیں ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں
کے امان میں کسی کافر کو قتل کردے، کیوں کہ حربی کافر اسلامی احکام کا پابند نہیں ہے، اس کی
دلیل یہ ہے کہ وحشی بن حرب جب کافر تھے تو وہ حربی تھے، انہوں نے سید الشہداء حمزہؓ کو قتل
کیا، وہ مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور اسلام قبول کیا تو
رسول اللہ ﷺ نے قصاص نہیں لیا اور ان سے فرمایا: "ہم سے اپنا چہرہ چھپادو"۔ (بخاری:
کتاب المغازی، باب قتل حمزۃ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ۴۰۷۲، مسند امام احمد: ۱۶۰۷۷، المعجم الکبیر
طبرانی: ۲۹۴۹، یہ روایت عبید اللہ بن عدی بن خیار رضی اللہ عنہ سے ہے)

وحشی بن حرب مسلمان ہونے کے بعد کہا کرتے تھے: اگر میں نے لوگوں میں افضل
شخص کو قتل کیا ہے جو سیدنا حمزہؓ ہیں تو میں نے لوگوں میں سب سے بدترین شخص کو بھی قتل کیا

ہے، اور وہ ہے **مسیلمہ بن کذاب**۔ (یہ بات ان سے ثابت ہے اور ضیاء مقدسی نے "المختارة" میں اس کو صحیح کہا ہے ۱/۳۴۱، دیکھا جائے "البداية والنهاية "ابن کثیر ٦/٣٢٥)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "ہم سے اپنا چہرہ چھپاؤ" میں بہت سی حکمتیں ہیں، کیوں کہ جب قاتل کو معاف کر دیا جائے اور وہ وہیں پر رہ رہا ہو جہاں مقتول کے اولیاء رہتے ہوں اور اس کو دیکھتے رہتے ہوں تو یہ ممکن ہے کہ ان میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو جائے، وہ اس کو قتل کر دیں، اس کے بعد قتل کرنے والوں سے قصاص لینا واجب ہو جاتا ہے اور اس میں بہت بڑا فتنہ ہے۔

٦۔ مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے، چاہے وہ مقتول ذمی ہی ہو تو اس میں قصاص نہیں ہے، اس کی دلیل بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا"۔ (بخاري: كتاب الديات، باب العاقلة ٦٩٠٣) اس لیے بھی کہ کافر مسلمان کے برابر نہیں ہے، البتہ اس سے تین صورتیں مستثنیٰ ہیں:

ذمی ذمی کو زخمی کر دے یا مرتد ذمی کو زخمی کر دے یا مرتد مرتد کو زخمی کر دے پھر زخمی کرنے والا مسلمان ہو جائے، اس کے بعد زخمی شخص اس زخم کی وجہ سے مر جائے، کیوں کہ اس حالت میں زخمی کرنے والا مسلمان ہے اور مجروح غیر مسلم ہے، اس کے باوجود قصاص لیا جائے گا، کیوں کہ شرعی اصول کہتا ہے: کسی کی حالت کے کمال کی طرف تبدیل ہونے سے ہر قابلِ ضمانت زخم نا قابلِ ضمانت نہیں بن جاتا ہے۔ (دیکھا جائے "القواعد الفقهية" ابن رجب حنبلي ٣١١)

٧۔ مکمل آزاد یا بعض آزاد شخص غلام کو قتل کر دے، اس صورت میں مکمل آزاد یا بعض آزاد سے قصاص نہیں لیا جائے گا کیوں کہ ان دونوں کے درمیان برابری نہیں ہے، البتہ اس سے دو شکلیں مستثنیٰ ہیں۔

کوئی غلام دوسرے غلام کو زخمی کر دے پھر زخمی کرنے والا آزاد ہو جائے پھر زخمی اس زخم کی وجہ سے انتقال کر جائے یا مجہول النسب غلام کو قتل کر دے پھر اس کے غلام ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

پہلی شکل یہ ہے کہ کوئی غلام دوسرے غلام کو زخمی کرے پھر زخمی کرنے والا آزاد کر دیا جائے پھر مجروح کی موت اس زخم کی وجہ سے ہو جائے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، کیوں کہ شروع معاملہ میں دونوں کا مرتبہ ایک ہی ہے یعنی دونوں غلام ہی ہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مجہول النسب شخص غلام کو زخمی کر دے اور وہ اس کے بعد اقرار کرے کہ وہ فلاں کا غلام ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

٨۔ کوئی معصوم الدم شخص مرتد کو قتل کر دے تو اسلام کی وجہ سے **معصوم الدم شخص** کو مرتد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ مرتد کا قتل شریعت میں واجب ہے۔

٩۔ یا مسلمان حربی کو قتل کر دے تو اسلام کی وجہ سے **معصوم الدم شخص** کو حربی کافر کے بدلہ قتل نہیں کیا جائے گا۔

١٠۔ یا شادی شدہ زانی کو قتل کر دے تو قصاص میں اس شادی شدہ زانی کے بدلے معصوم الدم مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ شرط یہ ہے کہ مقتول کو رجم کی سزا سنائی جا چکی ہو۔ (مسلک کا یہی منصوص قول ہے کیوں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی حد کو پورا کر دیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا، کیوں کہ اس پر حد پورا کرنے کا حق امام کا ہے "مغني المحتاج" ٥/٣١١)

١١۔ نماز چھوڑنے والے کو قتل کر دے، اسی لیے اگر کوئی مسلمان نماز چھوڑنے والے ایسے شخص کو قتل کر دے جو نماز نہ پڑھتا ہو اور نماز فرض ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو تو اس کے بدلے مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

١٢۔ ایسے ڈاکو کو قتل کر دے جس کے قتل کا فیصلہ صادر ہو چکا ہو، اسی طرح اگر کوئی مسلمان ایسے ڈاکو کو قتل کر دے جس کا قتل یقینی ہو یعنی اس نے ڈاکہ ڈالا ہو اور اپنے برابر کسی شخص کو قتل کر دیا ہو تو اس کے قتل کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

ان پانچ صورتوں میں قصاص لینا برابری اور کفو نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، کیوں کہ ان کو قتل کرنا اللہ کا حق لینے کے مقصد سے ہے، جب کہ اللہ نے ان کے قتل کو واجب کر دیا ہے، اگر چہ کہ قصاص واجب نہ ہونے سے تعزیر کی نفی نہیں ہوتی ہے یعنی ان کو قتل

کرنے والوں کی تعزیر کی جائے گی۔

۱۳۔ کوئی شخص کپڑے میں لپٹا ہوا ہو اور قتل کرنے والا اس کو انسان کے علاوہ کوئی دوسری چیز یا مردہ گمان کرے اور اس کو دو ٹکڑے کر دے تو اس صورت میں کفن میں موجود شخص کو دو ٹکڑے کرنے کی وجہ سے قصاص نہیں ہے۔ اگر وہ یہ بات کہے کہ جس کو میں نے دو ٹکڑوں میں کیا ہے وہ مردہ تھا۔ اگر میت کا ولی قسم کھائے کہ وہ زندہ آدمی تھا تو اسی کی بات مانی جائے گی اور اس وقت دیت کا مستحق بن جائے گا۔ (دیکھا جائے، "الحاوي الكبير" ورد ١٨٥/١٢، "مغني المحتاج" ٣٤٥/٥)

۱۴۔ کسی مسلمان کو کافروں کے علاقہ میں حربی کافر سمجھ کر قتل کر دے یا وہ کافروں کی صف میں ہو، کیوں کہ یہاں عذر واضح ہے اور مقتول نے وہاں رہ کر اپنی جان کی حرمت ختم کر دی ہے، اسی بنیاد پر اگر کوئی دار الحرب میں رہنے والے مسلمان کو حربی کافر سمجھ کر قتل کر دے یا حربیوں کی صفوں میں رہنے کی وجہ سے قتل کر دے مثلاً کافر اس کو ڈھال بنائیں اور قاتل کو اس کے مسلمان ہونے کے بارے میں معلوم نہ ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، کیوں کہ یہاں ان صورتوں میں قاتل کا عذر واضح ہے، البتہ مقتول کے اولیاء کو دیت لینے کا حق ہے۔ ("الوسيط" ٢٣/٧)

سبب بننے کی وجہ سے بھی قصاص واجب ہے جیسا کہ خود سے قتل کرنے کی صورت میں قصاص واجب ہے، یعنی اس شخص سے قصاص لینا واجب ہے جو دوسرے کے قتل کا سبب بنے، جس طرح اس شخص سے قصاص لیا جاتا ہے جو خود سے قتل کر دے، مثلاً کوئی ثقہ آدمی گواہی دے کہ زید نے عمرو کو قتل کیا ہے اور اس کی گواہی کی وجہ سے زید کو قتل کر دیا جائے۔ پھر یہ ثقہ آدمی آ کر کہے: اس نے جھوٹ کہا ہے، زید نے عمرو کو قتل نہیں کیا ہے، اس صورت میں وہ زید کے قتل کا سبب بنا ہے، اس لیے زید کے قتل کا قصاص اس سے لیا جائے گا۔

حق کے بغیر کسی کے قتل پر مجبور کرنے والے سے قصاص لیا جائے گا مثلاً کوئی کہے: اس کو قتل کر دے ورنہ میں تم کو مار ڈالوں گا، مثلاً خالد اپنی تلوار پکڑے اور زید سے کہے: عمرو کو قتل کر دو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ اس کی وجہ سے زید عمرو کا قتل کرنے پر مجبور ہو جائے تو بھی اس صورت میں خالد کے حق میں قصاص نافذ ہوگا۔ (مکمل فائدے کے لیے دیکھا جائے "التهذيب" بغوی ٦٤/٧)

قتل واجب کرنے والے امور

کبھی قتل کرنے کی وجہ سے کوئی بھی چیز قاتل پر لازم نہیں آتی ہے کیوں کہ قتل کرنا واجب یا مستحب ہوتا ہے مثلاً مرتد یا اس ڈاکو کو قتل کرنا جس نے کسی کا قتل کیا ہو یا دوسرے شخص کو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے، ان صورتوں میں نہ قصاص ہے اور نہ دیت۔

کبھی قتل کی وجہ سے قصاص واجب ہو جاتا ہے، مثلاً مرتد دوسرے مرتد کو قتل کر دے، شادی شدہ زانی اپنی طرح دوسرے شادی شدہ زانی کو قتل کر دے، کیوں کہ مرتد اور شادی شدہ زانی کو قتل کرنا واجب ہے۔

کبھی قتل کی وجہ سے کفارہ لازم ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص خود کو یا اپنے غلام کو قتل کر دے تو کفارہ لازم آ جاتا ہے، جو شخص خودکشی کرے تو اس کا کفارہ اسی کی وراثت سے نکالا جائے گا، جس شخص نے اپنے غلام کو قتل کیا ہے تو اس کا کفارہ اس کے مال میں سے نکالا جائے گا۔

کبھی قتل کی وجہ سے کفارہ اور قصاص دونوں لازم ہو جاتے ہیں مثلاً کسی شخص کو حق کے بغیر عمداً قتل کرے یعنی ایسے شخص کو قتل کرے جس کو قتل کرنا حرام ہو، اور کبھی کفارہ اور دیت لازم ہو جاتی ہے مثلاً قتلِ خطا یا قتلِ شبہ عمد میں۔

آیت میں جس طرح کے کفارہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ اللہ کا حق ہے، البتہ قصاص یا دیت اولیاء کا حق ہے، اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتول کے اولیاء کو قتل کرنے یا دیت لے کر قاتل کو معاف کرنے کے درمیان اختیار دیا۔

قصاص واجب ہونے کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: "**كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى**" (البقرة ١٧٨) صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو عمداً قتل

کرے تو قصاص ہے"۔ یہ روایت امام شافعی وغیرہ نے صحیح سندوں سے کی ہے۔ (ابوداود: کتاب الدیات، باب من قتل فی عمیّا بین قوم ۳۹۵۶، السنن الکبری للبیہقی: کتاب النفقات، باب من قال موجب العمد القود و إنما تجب الدیۃ بالعفو عنہ ۱۴۹۳۶۔ مسند امام شافعی: ۱۵۸۹، مسند امام احمد: ۴۵۲، مسند بزار: ۱۶۲/۲، ضیاء مقدسی نے اس کو "المختارۃ" میں صحیح کہا ہے: ۲۱/۱، یہ روایت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہے)

اگر مقتول کے اولیاء کے معاف کرنے کی وجہ سے یا ان کے معاف کیے بغیر قصاص ساقط ہو جائے مثلاً قاتل سے قصاص لیے جانے سے پہلے ہی وہ مر جائے یا قاتل کے اولیاء دیت کے مقابلہ میں اس کو معاف کر دے تو جان کا بدل دیت بن جاتی ہے، یہ بات جاننی ضروری ہے کہ قتلِ عمد، شبہِ عمد اور قتلِ خطا میں قاتل پر کفارہ لازم ہے چاہے اس کی دیت معاف کر دی جائے یا اس سے قصاص لیا جائے کیوں کہ کفارہ اللہ کا حق ہے، اگر کوئی عورت کسی شخص کو قتل کر دے اور مقتول کے اولیاء اس کو معاف کر دیں تو اس پر مقتول کی دیت واجب ہو جاتی ہے، قصاص کے بدلے دیت ہونے کی وجہ سے قاتل عورت سے مرد کی نصف دیت لی جائے گی۔

کبھی قتل کی وجہ سے کفارہ اور دیت لازم ہو جاتی ہے یعنی قصاص نہیں لیا جاتا ہے، یہ قتل خطا اور قتل شبہِ عمد میں ہے، قصاص کے مستحق کو قصاص یا عوض کے بدلے یا بلاعوض معافی کے درمیان اختیار دیا جائے گا۔

قاتل سے جس شخص یا چند افراد کو قصاص لینے کا حق ہے تو ان کو قاتل سے قصاص لینے یا اس کو معاف کرنے کے درمیان اختیار ہے، وہ معافی کے بدلے مقتول کی دیت لے سکتے ہیں اور اس وقت وہ کہیں گے: یہ معافی مال کے بدلے ہے۔ یا وہ کہیں گے: ہم نے قصاص اور دیت کو معاف کر دیا۔ یعنی بغیر مال کے بھی معافی ہوتی ہے۔ ان کے یہ کہنے کی صورت میں کہ ہم نے قاتل کو معاف کر دیا۔ پھر وہ خاموش رہیں، دیت کا تذکرہ نہ کریں تو یہ معافی بغیر مال کے مانی جائے گی۔

اس سے یہ شکل مستثنیٰ ہے کہ قصاص کا حق دار قاتل کے دونوں ہاتھ کاٹ دے اور اس کا انتقال نہ ہوا اور اس کی دیت ادا نہ کی گئی ہو تو اس صورت میں انتقام کے لیے قصاص لینے اور بغیر مال کے معاف کرنے کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیوں کہ دونوں ہاتھ کاٹنے

سے مکمل دیت لازم آتی ہے اور قصاص کے حق دار نے قاتل کے دونوں ہاتھ کاٹ لیے ہیں تو پوری پوری دیت لینے کے برابر ہو گیا۔

اگر کوئی شخص دوسرے کے دونوں ہاتھ کاٹ دے اور مظلوم مجرم کے دونوں ہاتھ کاٹنے کا کسی کو حکم دے جس کی وجہ سے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور زخم کی وجہ سے مظلوم کا انتقال ہو جائے اور مجرم کی موت نہ ہو تو مرنے والے کے اولیاء کو قصاص میں مجرم کو قتل کرنے کا حق ہے یا بغیر مال کے مجرم کو معاف کرنے کا یعنی دیت نہ لی جائے، کیوں کہ اس نے مجرم کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے ہیں، دو ہاتھوں کی دیت ایک سو اونٹ ہیں، اور مظلوم کے اولیاء کو دیت کا بدل حاصل ہو گیا ہے، اس بنیاد پر ان کو صرف قصاص لینے اور مجرم کو بطور انتقام قتل کرنے یا بغیر دیت کے اس کو معاف کرنے کے درمیان اختیار ہے۔

اگر کسی شخص کے دو غلام ہوں اور ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے تو آقا کو اختیار ہے کہ وہ انتقام میں دوسرے غلام کو قتل کر دے یا بغیر مال کے اس کو معاف کر دے کیوں کہ غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے اور وہ اپنے مال میں سے اپنے لیے دیت نہیں لے گا، اگر لے بھی تو تحصیل حاصل ہو جائے گا، کوئی فائدہ نہیں ہے۔

غلام کے حق میں جرم کرنے کے مسائل

غلام کے حق میں جرم کرنا آزاد کے حق میں جرم کرنے کی طرح ہی ہے، اس سے مندرجہ ذیل چھ مسائل مستثنیٰ ہیں:

اس کے بدلے آزاد یا بعض آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا، اگر بعض آزاد اور بعض غلام شخص کسی غلام کو قتل کر دے تو قصاص میں اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ غلام کی قیمت آقا کو دی جائے گی، کیوں کہ اس کی قیمت دینا واجب ہے، اور شہر کی نقدی میں دینا ضروری ہے۔

غلام پر جرم کرنے کی صورت میں غلام کی قیمت اس شہر کی کرنسی میں دینا ضروری ہے، جب کہ آزاد شخص کو قتل کرنے کی دیت شریعت نے ایک سو اونٹ مقرر کیے ہیں، اور غلام کی دیت کی قیمت آزاد کی دیت کی قیمت سے کم ہے اور کبھی اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے، یہ اس اصول کے مطابق ہے کہ ہر ضائع مال کا معاوضہ دینا ضروری ہے۔

غلام اور باندیاں جرم کے حکم میں برابر ہیں اور ان دونوں کا معاوضہ دینا لازم ہے، چاہے وہ مرد ہو یا مخنث یا عورت، اس کے برخلاف آزاد شخص میں عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے۔

اور غلام کی ضمانت میں اس کے اوصاف کا بھی اعتبار ہوتا ہے جب کہ آزاد میں اوصاف کا اعتبار نہیں ہوتا:

مثلاً عیوب سے محفوظ غلام کی قیمت عیب والے غلام سے زیادہ رہتی ہے، اس لیے گونگے غلام کو قتل کر دیا جائے تو اس کی قیمت بولنے والے غلام سے کم مقرر کی جاتی ہے، البتہ آزاد شخص میں گونگا اور بولنے والا دونوں یکساں ہیں۔

جرم میں اشتراک کے مسائل

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۶/ ۲۷۹۔ ''التھذیب'' بغوی ۷/ ۲۵)

بعض افراد ایک جرم میں شریک ہوں مثلاً دو یا دو سے زائد لوگ کسی شخص کو قتل کرنے میں شریک ہو جائیں تو کیا حکم ہے؟

اگر بعض افراد کسی شخص کے خلاف جرم میں شریک ہو جائیں مثلاً تین افراد مل کر کسی کا قتل کر دیں تو اس کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں: پہلی قسم یہ کہ جرم میں شریک سبھی افراد پر قصاص واجب ہو جاتا ہے۔

۲۔ ان میں سے کسی پر بھی قصاص نہیں ہے۔

۳۔ ان میں سے بعضوں پر قصاص ہے اور دوسروں پر نہیں۔

پہلے کی مثال یہ ہے کہ قتل عمداً ہوا اور زیادتی ہو اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو، اس کی دلیل امام شافعی وغیرہ کی روایت ہے کہ سیدنا عمرؓ نے ایک شخص کو دھوکہ سے قتل کرنے کی سزا میں پانچ یا سات لوگوں کو قتل کر دیا اور کہا: اگر صنعاء والے سبھی اس کے قتل میں شریک ہوتے تو میں ان سبھوں کو قتل کر دیتا۔ (موطا امام مالک: کتاب العقول، باب ماجاء فی الغِیلۃ ۲/ ۸۷۱۔ بخاری: کتاب الدیات، باب إذا أصاب قوم من رجل ۶۸۹۶) حقیقت یہ ہے کہ یہ شرعی حکم ہے، تمام صحابہ نے اس کو قبول کیا، اس لیے یہ اجماع ہو گیا، اگر یہ فیصلہ نہ ہوتا تو برے لوگ جس کو چاہتے قتل کر دیتے اور خون کی حرمت پامال ہو جاتی۔

دوسری قسم یعنی جس میں قصاص نہیں ہے کہ ان میں بعض لوگ غلطی سے مار ڈالیں یا شبہ عمد ہو۔

یعنی کوئی عمداً قتل کرے اور اس قتل میں دوسرے لوگوں کا کردار قتل خطا یا شبہ عمد ہو، اس

وجہ سے مقتول کی موت دو مختلف اعمال کی وجہ سے ہوئی ہے، اور قتل خطا میں قصاص نہیں ہے، اس لیے کہ خطا قصاص کو ساقط کرتی ہے۔ (دیکھا جائے ''روضۃ الطالبین'' بحاشیۃ البلقینی ۱۲۸/۸، ''الوسیط ''۲۷۹/۶) یا بعض آزاد شخص غلام کو قتل کر دے، اس صورت میں بھی قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم: قتل میں شریک بعض لوگوں پر قصاص نافذ ہوتا ہے اور بعض پر نہیں مثلاً قصاص لینے میں کوئی رکاوٹ ہو یعنی وہ باپ یا ماں ہو یا بچہ ہو یا پاگل ہو جو دوسرے کے ساتھ قتل میں شریک ہو جائیں، مثلاً قاتلین میں کوئی باپ ہو جو اپنے بیٹے کے قتل میں دوسروں کا ساتھ دے، یا بچہ مثلاً زید کے قتل میں دوسروں کا ساتھ دے یا پاگل اپنے بھائی کے قتل میں قاتلوں کا شریک بن جائے تو باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا، البتہ اس کے ساتھ قتل میں شریک سے قصاص لیا جائے گا، اسی طرح بچے اور پاگل سے قصاص نہیں لیا جائے گا، البتہ ان کے دوسرے شریک قاتلوں سے قصاص لیا جائے گا۔

جان لینے سے کم درجہ کے جرائم

یعنی جرم قتل سے کم درجہ کا ہو مثلاً کوئی عضو؛ ہاتھ یا پاؤں یا کان کاٹ دیا جائے، یا جرم کی وجہ سے کسی عضو کی صلاحیت ختم ہو جائے مثلاً جرم کی وجہ سے بصارت یا سماعت یا عقل ختم ہو جائے یا دانت ٹوٹ جائیں یا نکل جائیں یا جرم کی وجہ سے زخم آ جائے۔

جن اعضاء میں قصاص ہے، ان کی تعداد سولہ ہیں: کان، آنکھ، آنکھ کی پلکیں، ناک، ہونٹ، زبان، دانت، ہاتھ، پاؤں، تھن، مرد کا ذکر، خصیتین، عورت کی اگلی شرمگاہ کے شفرہ اگر ان میں سے کوئی عضو کاٹا جائے تو قصاص ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے: ''المجموع شرح المہذب'' ۳۲۸/۲۰ ''حاشیۃ القلیوبی'' ۱۳۵/۴ ''الوسیط'' ۳۳۹/۶)

جن معانی میں قصاص ہے ان کی تعداد چودہ ہے: عقل یعنی سمجھنے کی صلاحیت، سماعت، بصارت، سونگھنے کی صلاحیت، نطق، آواز، ذائقہ مثلاً چیزوں کا ذائقہ، نگلنے کی صلاحیت، ہاتھوں کی طاقت، چلنے کی طاقت، جماع کی قوت، منی نکلنے کی صلاحیت، اگلی اور پچھلی شرمگاہ کا فرق ختم ہونا۔ (''الوسیط'' ۳۴۸/۶)

ان مذکورہ چیزوں میں سے چھ میں سے کسی ایک کو زائل کر دیا جائے تو اس میں قصاص ہے مثلاً بصارت، سماعت، ذائقہ کی صلاحیت اور بولنے کی طاقت، باقی میں قصاص نہیں ہے بلکہ دیت ہے، مثلاً کوئی شخص دوسرے کو مارے جس کی وجہ سے مظلوم کے جماع کی صلاحیت ختم ہو جائے تو اس میں مکمل دیت ہے جو مجرم پر واجب ہو جاتی ہے۔

قتل سے کم جرم کسی عضو کو کاٹنے سے ہوتا ہے مثلاً ہاتھ یا پاؤں کو کاٹ دیا جائے، یا اس کی صلاحیت ختم کرنے سے مثلاً سماعت یا بصارت ختم کی جائے، یا زخمی کرنے سے ہوتا ہے جو زخم ہڈی تک پہنچ جائے مثلاً سر یا چہرہ میں اتنا زخم آئے کہ ہڈی نظر آ جائے، ان تمام

شکلوں میں قصاص ہے کیوں کہ اس کو منضبط کرنا اور اسی طرح قصاص لینا ممکن ہے، برخلاف اس کے؛ ہڈی کو مار لگنے کی وجہ سے الگ ہو جائے یا ہڈی ایک جگہ سے دوسری جگہ کھسک جائے تو اس میں قصاص نہیں ہے کیوں کہ اس کو منضبط کرنا دشوار ہے۔

ان تمام صورتوں میں قصاص ہے، کیوں کہ ان میں قصاص لینے کا اصول پایا جاتا ہے اور قصاص کو نافذ کرنا بھی ممکن ہے، اگر کوئی شخص دوسرے کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، اگر کسی کے چہرہ پر مارنے کی وجہ سے اس کی بصارت چلی جائے تو مجرم کی آنکھ پر مارا جائے گا تاکہ اس کے دیکھنے کی قوت ختم ہو جائے۔

ہڈی توڑنے میں قصاص نہیں ہے، البتہ دانت توڑنے میں قصاص ہے، کوئی عضو کاٹنے پر وہی عضو کاٹا جائے گا، اور دانت توڑنے پر اسی طرح کا دانت نکالا جائے گا۔

اگر آنکھ حلقہ سے نکال دی جائے یا بصارت ختم کی جائے تو قصاص ہے، جس میں قصاص نہیں ہے تو اس میں دیت ہے یا جتنی صلاحیت ختم ہوئی ہے اس کا معاوضہ اور تاوان ہے۔

قصاص کے مستحقین

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''أسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۴:۳۶)

قصاص کا حق ہر وارث کو ہے، اسی طرح مظلوم کی دیت سبھی وارثین میں تقسیم کی جائے گی، اگر بعض وارثین موجود نہ ہوں اور سفر پر ہوں تو ان کے آنے تک انتظار کیا جائے گا، اگر بعض وارثین نابالغ ہیں تو ان کے بالغ ہونے تک انتظار کیا جائے گا، اگر بعض وارث پاگل ہیں تو ان کے عقل ٹھکانے آنے تک صبر کیا جائے گا، تمام ورثہ کے حاضر ہونے تک قاتل کو قید میں رکھا جائے گا، اور کسی کو بھی مجرم کی کفالت کی رخصت نہیں دی جائے گی، اس وقت تک قاتل کو جیل میں رکھا جائے گا جب تک تمام مستحقین قصاص کے لیے تیار ہو جائیں، اگر سبھی مستحقین کسی ایک کے قصاص لینے پر متفق ہو جائیں تو قصاص لیا جائے گا، ورنہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کرنا واجب ہے۔ (مسلک شافعی کا قول منصوص یہی ہے، یہی بات امام غزالی کی ہے ''الوسیط'' ۶/۳۰۲، ''الروضۃ نووی ۹/۲۱۴، اس میں ابوحنیفہ کا اختلاف ہے کہ بچہ ہو تو اس کے بالغ ہونے تک اور پاگل کے عاقل ہونے تک انتظار نہیں کیا جائے گا)

اگر سبھی لوگ اپنی طرف سے کسی ایک کے قصاص لینے پر متفق ہو جائیں تو یہ جائز ہے ورنہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی، مثلاً بہت سے مستحقین میں سے دو لوگ قصاص لینے پر مصر ہوں تو باقی لوگوں کی اجازت سے ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی اور قاضی کی اجازت سے قصاص لیا جائے گا۔

عاجز یعنی قدرت نہ رکھنے والا قصاص کے عمل میں شامل نہیں ہوگا۔ (غزالی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ عورت اور عاجز بھی قرعہ اندازی میں شامل ہو سکتے ہیں اور جائز ہے، دیکھا جائے: ''الوسیط'' ۶/۳۰۳) کیوں کہ قتل کے لیے بہادری اور قتل کے طریقوں سے واقف ہونے کی ضرورت

پڑتی ہے، جب کہ کمزور اور بزدل شخص قتل نہیں کرسکتا ہے، اس لیے وہ قصاص لینے کی قدرت نہیں رکھتا ہے، البتہ اس کی اجازت سے قتل کیا جائے گا اور قصاص امام کی اجازت سے ہی لیا جائے گا، اگر کوئی خود سے قصاص لے تو اس کی تعزیر کی جائے گی۔

امام کی اجازت سے قصاص نافذ کیا جائے گا، کیوں کہ قتل بڑا خطرناک معاملہ ہے اور اس میں بصیرت اور تامل کی ضرورت پڑتی ہے، علماء نے قصاص کی شرطوں میں اختلاف کیا ہے، اگر کوئی اپنے والد کا بدلہ خود سے لے اور باپ کے قاتل کو حاکم کی اجازت کے بغیر قتل کردے تو حاکم اس کی تعزیر کرے گا کیوں کہ اس طرح کرکے اس نے حاکم کے حکم سے روگردانی کی ہے۔ علماء نے قصاص کے لیے دس امور مقرر کیے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

قتل کا حکم نافذ کرتے وقت حاکم یا اس کا نائب حاضر ہو اور دو گواہ حاضر ہوں تا کہ وہ قصاص لینے والے شخص کو دیکھے کہ اس نے اپنا حق لیا ہے یا اس کا ارادہ زیادتی کرنے کا ہے، جس شخص سے قصاص لیا جارہا ہو اس کی مدد کرنے کے لیے کوئی شخص ساتھ میں ہوتا کہ قصاص کے مستحق کو زیادتی کرنے سے روکے اور حاکم قصاص لیے جانے والے شخص کو نماز پڑھنے اور وصیت کرنے کا حکم دے اور یہ بھی حکم دے کہ وہ اپنے ذمے موجود حقوق کی بھی وصیت کرے اور دوسروں کے ذمے اس کے جو حقوق ہیں اس بارے میں بھی وصیت کرے اور اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرے، اس کو قتل کے تختہ پر نرمی سے لے جایا جائے اور اس کا ستر ڈھانکا جائے، اگر وہ کھانا اور پانی مانگے تو اس کو دیا جائے، اس کی آنکھوں پر پٹّی باندھی جائے اور اس کی گردن بالکل سیدھی رکھی جائے تا کہ تلوار اس کی گردن تک صحیح طور پر پہنچے اور اس میں غلطی نہ ہو، تا کہ اس کو تکلیف نہ ہو، تلوار دھاردار ہو اور اس میں زہر نہ لگا ہو، قصاص کے وقت ان آداب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حاکم قصاص کے مستحقین میں سے قتل کرنے کی اجازت اسی کو دے گا جو قتل کرنے سے واقف ہو، حاکم مستحقین قصاص کو صرف قتل کی ہی اجازت دے گا، کیوں کہ قتل کی قدرت رہتی ہے اور اس میں کوئی اشکال بھی نہیں ہے، البتہ قتل کے علاوہ دوسرے قصاص میں کاٹنے والے

کو متعین کیا جائے گا جو کاٹنے سے واقف ہو، کیوں کہ اگر کوئی کاٹنے کا ماہر نہ ہو تو وہ اس کی قدرت ہی نہیں رکھتا ہے تا کہ مجرم کو تکلیف دینے کا سبب نہ بن جائے اور مجرم سے اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا جیسے اس نے کیا ہے چاہے وہ پیٹ یا پیٹھ یا سینے یا گلے کے سوراخ تک پہنچنے والا زخم ہو، تا کہ مماثلت کی رعایت رکھی جائے یا تلوار کے ذریعہ قصاص لیا جائے گا۔

مجرم سے ویسے ہی قصاص لیا جائے گا جیسے اس نے مظلوم کے ساتھ کیا ہے، اگر مجرم نے غرق کرکے قتل کیا ہے تو اس کو بھی غرق کرکے قتل کیا جائے گا، اگر مجرم نے مظلوم کو جلایا ہے تو اس کو بھی جلایا جائے گا، اگر مجرم نے پتھر سے مار ڈالا ہے تو مجرم کے سر پر پتھر سے مارا جائے گا، اگر مجرم نے زہریلا سانپ چھوڑا ہے تا کہ وہ کاٹ لے اور اس کے زہر کی وجہ سے مظلوم مر جائے تو اس کے ساتھ بھی یہی کیا جائے گا، اسی طرح اگر مجرم نے مظلوم کو گہرا زخم دیا ہو جو عضو کے اندرون تک پہنچ گیا ہو مثلاً نیزہ لے کر اس کے پیٹ میں گھسا دے تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔

جن مسائل میں شریعت نے برابری کی رخصت نہیں دی ہے بلکہ شریعت نے ان کو حرام قرار دیا ہے، مثلاً لواطت، شراب پلانا اور جادو کرنا۔ ان صورتوں میں تلوار سے قصاص لیا جائے گا، اگر کوئی شخص چھوٹی بچی کے ساتھ جماع کرے، جس کی وجہ وہ مر جائے تو جماع کرنے والے مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے گا، اگر کوئی شخص چھوٹے بچے کے ساتھ لواطت کرے جس کی وجہ سے وہ مر جائے تو مجرم کو تلوار سے مارا جائے گا، اگر مجرم جادوگر ہو اور مظلوم جادو کی وجہ سے مر جائے تو اس کو تلوار سے مارا جائے گا، ان صورتوں میں مجرم کے ساتھ ویسا ہی سلوک نہیں کیا جائے گا جو اس نے مرے ہوئے شخص کے ساتھ کیا ہے، کیوں کہ یہ حرام فعل ہے، ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ (دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۳۱۱/۶، البتہ احناف کے نزدیک قصاص میں مماثلت نہیں ہے بلکہ مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے گا)

دیت

دیت کی بہت سی قسمیں ہیں: مغلظہ اور مخففہ، جس کی وضاحت اگلے صفحات میں آرہی ہے۔

دیت کے لغوی معنی: قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو جان کے بدلے مال دینا۔

شرعی معنی: اس مال کو کہتے ہیں جس کو قتل یا اس سے کم درجہ کے جرم میں دینا واجب ہے اور یہ اصلاً اونٹ ہیں یا اونٹ کی قیمت۔ (''مغنی المحتاج'' ۵/۳۶۸، ''اسنی المطالب'' ۴/۴۷)

دیت کی دو قسمیں ہیں: تین وجوہات سے مغلظہ جو مجرم پر لازم ہے، پہلی سختی یہ کہ دیت مجرم پر ضروری ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ اس کو تاخیر کے بغیر فوراً ادا کرنا واجب ہے اور تیسرے یہ کہ قتل عمد میں تین قسم کے ایک سو اونٹ دیے جاتے ہیں۔

شبہ عمد میں دیت ایک حیثیت سے مغلظہ ہے اور دو حیثیتوں سے مخففہ ہے، مغلظہ اس حیثیت سے کہ تین قسم کے ایک سو اونٹ دینا ضروری ہے، اور اس حیثیت سے مخففہ ہے کہ یہ دیت عاقلہ پر واجب ہے اور اس میں فوراً دینا ضروری نہیں ہے۔ (''التہذیب'' بغوی ۷/۱۳۴)

۔دیت مغلظہ تین قسم کے اونٹ ہیں: تیس حقہ، تیس جزعہ اور چالیس خَلِفہ۔

یعنی تین سال کے تیس اونٹ، چار سال کے تیس اونٹ اور چالیس اونٹ حاملہ، اس کی دلیل عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سن لو! خطا شبہ عمد کی دیت جو کوڑے اور ڈنڈے سے ہو تو ایک سو اونٹ ہیں جن میں سے چالیس وہ اونٹنیاں ہیں جو حاملہ ہوں''۔ (ابوداود: کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطأ شبہ العمد ۴۵۸۸۔ ابن ماجہ: کتاب الدیات، باب دیۃ شبہ العمد ۲۶۲۷، ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے: ۶۰۱۱)

دیت کی دوسری قسم مخففہ ہے: یہ پانچ قسم کے اونٹ ہیں: دو سالہ اونٹنیاں، دو سالہ اونٹ،

تین سالہ اونٹ، چار سالہ اونٹ اور ایک سالہ اونٹ، یہ مسلمان شخص کی دیت میں ہے۔

دیت کی دوسری قسم مخففہ ہے جو مجرم پر واجب نہیں ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے مدت بھی دی جاتی ہے اور یہ مجرم کے عصبہ پر لازم ہوتی ہے، مخففہ میں پانچ قسم کے اونٹ ہوتے ہیں، ہر قسم کے بیس اونٹ ہیں، دو سالہ مادہ اونٹ بیس، دو سالہ نر اونٹ بیس، ایک سالہ بیس اونٹ، تین سالہ بیس اونٹ اور چار سالہ بیس اونٹ۔ اس کو پنچ رنگی دیت کہا جاتا ہے یعنی یہ دیت پانچ قسم کے اونٹوں میں منقسم ہے، دیت مخففہ کی دلیل ترمذی وغیرہ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے۔ (ترمذی: ابواب الدیات، باب ماجاء فی الدیۃ کم ھی من الابل ۱۳۴۴)

جان لینے میں اور کوئی عضو کاٹنے میں اور کسی عضو کی منفعت ختم کرنے میں دیت واجب ہوتی ہے، اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آرہا ہے، کبھی مکمل دیت واجب ہوتی ہے مثلاً معصوم آزاد شخص کی جان لینا یعنی کسی ایسے مسلمان کو قتل کرنا جس نے کوئی ایسا جرم نہ کیا ہو جس کی وجہ سے وہ قتل کا مستحق بن جاتا ہے، اس کے قتل کی صورت میں مکمل دیت واجب ہو جاتی ہے۔

ناک کے سونگھنے کی صلاحیت ختم کرنے کی صورت میں مکمل دیت ہے، ناک کاٹنے کی صورت میں مکمل دیت ہے، زبان کاٹنے کی صورت میں مکمل دیت ہے، زبان شل کرکے اس کے بولنے کی صلاحیت ختم کرنے میں مکمل دیت ہے، انسان کی اگلی شرمگاہ اور پچھلی شرمگاہ کاٹنے میں مکمل دیت ہے، طبعی عقل ختم کرنے کی صورت میں مکمل دیت ہے۔

عقل کی دو قسمیں ہیں: ایک طبعی عقل، جس کے ختم ہونے سے مراد پاگل ہونا ہے اور اس صورت میں مکمل دیت ہے۔ اور دوسری عقل تجربہ سے حاصل ہوتی ہے مثلاً حسنِ تدبیر اور صحیح رائے دینے کی صلاحیت۔ اس عقل کو نقصان پہنچانے یا ختم کرنے کی صورت میں حاکم کے فیصلہ سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ (دیکھا جائے ''روضۃ العقلاء۔ ابن حبان ص ۱۷)

ناک کاٹنے کی صورت میں دیت لازم ہونے کی دلیل عمرو بن حزمؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور ناک میں جب ناک کا بانسہ اکھاڑ دیا جائے تو مکمل دیت ہے''۔ (السنن الکبری للبیہقی: کتاب الدیات، باب الصحیح یصیب عین الأعور ۸/۹۳) اور زبان کے تعلق

سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اور زبان میں دیت ہے''۔ (نسائی: کتاب الدیات، ذکر حدیث عمرو بن حزم فی العقول ۸/ ۵۷، بیہقی: کتاب الدیات، باب دیۃ اللسان ۸/ ۸۹، ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے: ۶۵۵۹) زبان کاٹنے کی صورت میں دیت ہے چاہے زبان میں لکنت ہی کیوں نہ ہو یا حروف تبدیل ہوجاتے ہوں، اگر مارنے کی وجہ سے بولنے والے کی زبان گنگ ہوجائے تو مکمل دیت لازم ہوجاتی ہے، کیوں کہ زبان عظیم منافع میں سے ہے جو لوگوں کو عطا ہوئی ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں: اس بات پر اجماع ہے کہ جرم کی وجہ سے گونگا ہوجائے تو اس میں دیت ہے۔ (الأم ۶/ ۱۱۹) اگر اطباء کہیں کہ وہ مستقبل میں بول نہیں سکے گا چاہے مظلوم اس پر جرم کیے جانے سے پہلے بعض حروف کو ادا نہ کرسکتا ہو تو بھی مجرم پر دیت لازم ہوتی ہے۔ اور حشفہ میں مکمل دیت ہے، کیوں کہ آدمی کے ذکر میں سب سے زیادہ جماع کا لطف دینے والی چیز حشفہ ہے اور کاٹنے کی صورت میں مکمل دیت ہے۔

عورت کی اگلی شرمگاہ جماع کی وجہ سے یا کسی دوسرے سبب کی وجہ سے، شوہر کی طرف سے یا کسی دوسرے کی طرف سے پھٹ جائے اور اگلی اور پچھلی شرمگاہ مل جائے تو اس میں مکمل دیت ہے، کیوں کہ اس سے جماع کی لذت ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح اگلی اور پچھلی شرمگاہ سے پیشاب یا پاخانہ نکلنے کا فرق بھی ختم ہوجاتا ہے۔ (دیکھا جائے ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۹/ ۵۳۸)

جس جرم کی وجہ سے طبعی عقل ختم ہوجائے جس کی وجہ سے عقل اپنی ذمہ داری کی ادائیگی سے عاجز ہوجائے، مثلاً کوئی چانٹا مارے یا سر پر مار دے جس کی وجہ سے ذہن زائل ہوجائے تو مکمل دیت لازم ہوجاتی ہے، اگر جرم کی نوعیت سر میں زخم کرنا ہو جو بالکل واضح ہو اور سر کی ہڈی میں سراخ ہوجائے اور یہ زخم دماغ تک پہنچ جائے تو مجرم پر معاوضہ دینا لازم ہوجاتا ہے اور مکمل دیت بھی، اسی بنیاد پر اگر کسی شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور وہ پاگل ہوجائے تو اس پر دو دیت لازم ہوجاتی ہے۔

ریڑھ کی ہڈی توڑنے کی وجہ سے آدمی جماع سے عاجز ہوجائے یا منی میں کمی آئے تو مکمل دیت دینا لازم ہے۔

چمڑا نکالا جائے؛ اگر اس کے بدلے دوسرا چمڑا نہ آئے تو اس پر دیت لازم ہے اگر اس کی وجہ سے آدمی مر نہ جائے، اگر چمڑا کھینچنے کی وجہ سے وہ شخص مر جائے تو مجرم پر جان جانے کی دیت لازم ہوجاتی ہے اور چمڑا نکالنے کی بھی دیت ہے۔

دونوں کان کاٹنے کی صورت میں مکمل دیت ہے، چاہے مظلوم کو سنائی دے رہا ہو یا سنائی نہ دے رہا ہو جیسا کہ دارقطنی نے عمرو بن حزمؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''کان میں پچاس اونٹ ہیں''۔ (سنن البیہقی'' کتاب الدیات، باب الاذنین ۸/ ۸۵۔ ۱۶۶۴٤) ایک کان کاٹنے کی صورت میں پچاس اونٹ مجرم پر لازم ہوجاتے ہیں؛ کیوں کہ دونوں کانوں کی موجودگی میں ہی سننے کا فائدہ ہوجاتا ہے اور کیڑے مکوڑوں کا احساس رہتا ہے، جب کان نہ پائے جائیں تو آدمی آواز کی سمت کو نہیں جانتا ہے اور نہ اس کو احساس ہوتا ہے اور نہ وہ کیڑے کو محسوس کر پاتا ہے۔

دونوں کانوں کی سماعت ختم ہونے پر مجرم پر مکمل دیت ہے، جیسا کہ بیہقی کی روایت میں اس کی دلیل ہے۔ (''السنن الکبری'' بیہقی؛ کتاب الدیات، باب السمع ۸/ ۸٦) علماء بصارت پر سماعت کو ترجیح دیتے ہیں، کیوں کہ شرعی احکام کا تعلق سماعت سے رہتا ہے، اور اندھا لوگوں کی گفتگو سن سکتا ہے اور اس کو محسوس ہوسکتا ہے کہ کن لوگوں کے درمیان وہ بیٹھا ہوا ہے اور کن کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے، لیکن بہرا کسی احساس کے بغیر بیٹھتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ وہ پتھر کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ (دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی۔ ۱۲/ ۲۴۴)

کبھی نصف دیت واجب ہوتی ہے مثلاً ایک کان یا اس کی سماعت: ان چیزوں میں کبھی مکمل دیت کا آدھا حصہ لازم ہوتا ہے مثلاً ایک کان کاٹ دیا جائے اور اس کی سماعت باقی ہو تو اس میں نصف دیت ہے، اگر ایک کان کاٹ دیا جائے اور اس کی سماعت بھی ختم ہوجائے تو اس صورت میں مکمل دیت ہے۔

آنکھ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی صورت میں جس کا مطلب بصارت ختم کرنا ہوتا ہے

نصف دیت ہے، اگر آنکھ اپنی جگہ پر ہو اور دیکھنے کی قوت ختم ہو جائے تو مجرم پر نصف دیت لازم ہوتی ہے۔ (اس میں چھوٹی اور بڑی آنکھ، صحیح آنکھ اور کانی آنکھ، تیز نگاہ والی آنکھ اور کم نگاہ والی آنکھ سب یکساں ہے، دیکھا جائے "الحاوي الكبير" ۲۴۹/۱۲)

ایک ہونٹ، ایک داڑھ، ہاتھ، اس کے پکڑنے کی قوت، پاؤں، اس کے چلنے کی صلاحیت، عورت کا نپل، ان سبھوں میں نصف دیت ہے۔

اگر مرد یا مخنث کا نپل کاٹا جائے تو اس میں ''حکومہ'' ہے یعنی جس کو قاضی یا حاکم مقرر کرے، کیوں کہ مرد مخنث کے نپل میں منفعت نہیں ہے اور اس سے دودھ نہیں آتا ہے۔

اسی طرح ایک خصیہ، عورت کی اگلی شرمگاہ کا ایک حصہ، آدھی زبان، ناک کے ایک بانسہ کے سونگھنے کی صلاحیت اور نصف عقل جانے کی صورت میں آدھی دیت مجرم پر لازم ہوتی ہے۔

کبھی ایک تہائی دیت لازم ہوتی ہے مثلاً مامومہ اور جائفہ میں اور ایک تہائی زبان میں اور ایک تہائی بولنے کی صلاحیت میں۔

بعض اوقات جرم میں ایک تہائی دیت لازم ہوتی ہے مثلاً مامومہ میں یعنی زخم سر کے اندر تک پہنچ جائے یعنی دماغ کے پردے تک پہنچے، جائفہ میں یعنی زخم جوف تک پہنچ جائے مثلاً سینے اور پیٹ میں، ایک تہائی زبان کاٹنے میں اور بولنے کی ایک تہائی صلاحیت ختم ہونے میں؛ ان میں سے ہر ایک میں ایک تہائی دیت مجرم پر لازم ہوتی ہے۔ (دیکھا جائے "السنن الكبرى" بيهقي، كتاب الديات، باب الجائفة ۸۵/۸، "صحيح ابن حبان" ۶۵۵۹ "الوسيط" غزالی ۳۳۵/۶)

ہم نے جائفہ کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ہر وہ زخم ہے جو جوف تک پہنچ جائے، جوف سے مراد ہر وہ حصہ ہے جس میں غذا پہنچتی ہو مثلاً پیٹ میں وہ حصہ جہاں روٹی پہنچتی ہے اور وہاں ہضم ہو کر انتڑیوں تک جاتی ہے اور وہاں سے سینے تک بھی جاتی ہے اور غذا ہضم ہونے کے لیے اپنی جگہ پہنچنے کے لیے حرکت کرنے کی جگہ جوف ہے۔

جن موقعوں پر پاؤ دیت لازم ہوتی ہے وہ یہ ہے: آنکھ کا پپوٹا، ہر آنکھ کے دو پپوٹے ہوتے ہیں، دو آنکھوں کے چار پپوٹے ہو جاتے ہیں، اس لیے آنکھ کے پپوٹوں میں سے ہر

پپوٹے کی دیت پاؤ ہے، اگر اندھے کا بھی پپوٹا ہو تو پاؤ دیت ہے۔ (دیکھا جائے "الوسيط" غزالی ۳۴۰/۶) ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ کان میں نصف دیت ہے اور آدھے کان میں پاؤ دیت ہے، آدھے ہاتھ، آدھے پاؤں میں پاؤ دیت ہے، آدھے خصیہ اور عورت کے آدھے نپل میں پاؤ دیت ہے، پاؤ زبان میں بھی پاؤ دیت ہے، اگر اس کے کاٹنے سے بولنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو مکمل دیت ہے۔

بعض موقعوں پر دیت کا دسواں حصہ اور بیسواں حصہ بھی ہے، یہ منفعت میں ہوتا ہے۔

جن چیزوں میں دیت کا دسواں حصہ اور بیسواں حصہ لازم ہوتا ہے، اس کی مثال وہ پہلا زخم ہے جو ہڈی تک پہنچ جائے، اس زخم کے بعد جو ہڈی کو تبدیل کر دے جس کو منقلہ کہا جاتا ہے، ایک میں دیت کا پندرواں حصہ ہے اگر یہ زخم موضحہ نہ ہو یعنی جس کی وجہ سے ہڈی نظر آتی ہے۔ یعنی صرف ہڈی ایک جگہ سے کھسکنے یا سر یا چہرہ میں زخم کی وجہ سے ہڈی نظر آ جائے تو بیسواں حصہ ہے یعنی پانچ اونٹ۔

۔کبھی دیت کا دسواں حصہ لازم ہوتا ہے مثلاً ایک انگلی اور ہڈی ٹوٹنے میں چاہے ہڈی نظر آئے یا نہ آئے:

جن موقعوں پر دیت کا دسواں حصہ لازم ہوتا ہے وہ یہ ہیں مثلاً ہر انگلی میں دیت کا دسواں حصہ ہے یعنی دس اونٹ، اور ہڈی تک پہنچنے والے زخم اور ہڈی کو توڑنے والے زخم میں مجرم پر دس اونٹ لازم ہیں۔ (الحاوی الكبير ۲۳۴/۱۲)

جس میں بیسواں حصہ واجب ہوتا ہے مثلاً سر میں ایسا زخم ہو جس سے ہڈی نظر آ جائے، اسی طرح چہرے میں، ایک دانت میں، انگھوٹے کے پور میں پانچ اونٹ مجرم پر لازم ہوتے ہیں (اس کی دلیل عمرو بن حزم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں لکھا: ''موضحہ میں پانچ اونٹ ہیں''۔ مسند احمد: ۷۰۳۴، ابن حبان ۶۵۵۹) اگر موضحہ سر اور چہرے کے علاوہ میں ہو تو اس میں حکومہ ہے، اگر دانت اصلی نہ ہوں تو صرف اس کی قیمت ادا کی جائے گی۔

بعض امور میں دسویں حصہ کا ایک تہائی حصہ ہے، یہ چھوٹی انگلی کے پور میں ہے۔ ہم

نے یہ بات بتا دی ہے کہ ہر انگلی کی دیت دسواں حصہ ہے، اور انگھوٹے کے پور کی دیت بیسواں حصہ یعنی پانچ اونٹ ہیں، جس انگلی میں تین پور ہوں مثلاً انگھوٹے کے علاوہ چار انگلیاں تو اس میں ہر پور کی دیت دسویں حصہ کا ایک تہائی حصہ ہے۔ (مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "الحاوی الکبیر" ماوردی ١٢/٣١٤)

یہ بات جاننا ضروری ہے کہ جب دیت لی جاتی ہے تو پھر مجرم پر قصاص نافذ نہیں ہوتا ہے۔

عاقلہ کی وضاحت

عاقل ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو ایسی عقل کا مالک ہو جس سے وہ اپنی حرکات وسکنات پر اس انداز میں قابو رکھتا ہو کہ وہ کوئی قبیح عمل نہ کر سکے۔ اصطلاح میں عاقلہ کسی شخص کے عصبہ اور رشتے داروں کو کہتے ہیں جو اس کی طرف سے کوئی جرم سرزد ہونے کی صورت میں اس کا تعاون کرتے ہیں اور اس کی دیت ادا کرتے ہیں اور مظلوم کے گھر کے پاس اونٹنیوں کو لے جا کر باندھتے ہیں جس کو عربی میں عَقَلَ کہا جاتا ہے، یہ بات معلوم ہے کہ قتل عمد کی دیت خود قاتل پر لازم ہوتی ہے۔ البتہ قتل خطا کی دیت ہر اس شخص پر لازم ہوتی ہے جو مجرم کا وارث بننے والا ہو، یہ اس اصول کے مطابق ہے: ''فائدہ تاوان کے بدلے ہے اور تاوان فائدہ کے بدلے'' (الغنم بالغرم والغرم بالغنم)

عاقلہ مجرم کے وہ عصبہ ہیں جو مرد ہوں، آزاد ہوں، بالغ ہوں اور عاقل ہوں اور فقیر نہ ہوں جو مجرم کے وارث بنتے ہوں، اگر نسب کے اعتبار سے عصبہ نہ پائے جائیں اور نہ آزاد کرنے کی نسبت سے عصبہ پائے جائیں اور نہ آقا بننے کی حیثیت سے کوئی عصبہ ہو تو بیت المال مجرم کے عاقلہ کا کردار ادا کرے گا یعنی بیت المال اس کی دیت ادا کرے گا، اس سے اصل اور فرع مستثنی ہیں یعنی باپ اور بیٹے کا شمار عاقلہ میں نہیں ہوتا ہے، اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ دو عورتوں میں جھگڑا ہوا تو ایک نے دوسری پر پتھر ڈال کر مار ڈالا، اس کے ساتھ پیٹ میں موجود بچہ بھی مر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ اس کے جنین کی دیت غلام یا باندی ہے، اور عورت کی دیت قاتلہ کے عاقلہ کے ذمہ کیا۔ (بخاری: کتاب الدیات، باب جنین المرأة ۶۹۱۰، مسلم: کتاب القسامة، باب دیة الجنین ۱۶۸۱)

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے دیت اس کے عصبہ پر ہونے کا فیصلہ کیا۔ ابوداود کی روایت

میں ہے: آپ نے والد کو دیت سے بری کر دیا۔ (ابوداود: کتاب الدیات، باب دیۃ الجنین ۴۵۷۶)

نسائی نے ایک روایت کی ہے: ''آدمی کو اس کے والد کے جرم کے بدلے پکڑا نہیں جائے گا''۔ (نسائی: کتاب تحریم الدم، باب تحریم القتل ۷/۱۲۷) اس میں جرم کے اصل اور اس کے فرع برابر ہیں، جیسا کہ گزر چکا ہے، یا وہ مجرم کو آزاد کرنے والے کے اصول اور فروع ہیں، کیوں کہ امام شافعی نے روایت کیا ہے کہ عمرؓ نے علیؓ کے سلسلہ میں فیصلہ کیا کہ وہ صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کے آزاد کردہ غلام کی دیت ادا کریں، کیوں کہ وہ صفیہ کے بھتیجے تھے۔ (بیہقی: ''السنن الکبری'': کتاب الدیات، باب من العاقلۃ التی تغرم ۸/۱۰۷) یہ بات صحابہ کے درمیان مشہور ہوئی، اور بیٹے پر سبھی فروع کو قیاس کیا گیا ہے۔

قاتلہ کا نام ام عطیہ تھا اور مقتولہ کا نام ملیکہ تھا، ام عطیہ کا تعلق بنو ہذیل سے تھا اور ملیکہ کا تعلق بنی عامر سے، یہ دونوں عورتیں سوکن تھیں اور ان کے شوہر کا نام حمل بن مالک تھا، جب دونوں میں جھگڑا ہوا تو ام عطیہ نے ملیکہ پر چھوٹا سا پتھر پھینکا جس کی وجہ سے ملیکہ کا انتقال ہوا اور اس کا حمل ساقط ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ یہ قتل عمد نہیں ہے بلکہ شبہ عمد ہے اور ام عطیہ کے عاقلہ ملیکہ کی حمل کی دیت اس کے اولیاء کے حوالہ کر دے؛ یہ ایک غلام یا باندی ہے، اور یہ فیصلہ کیا کہ ام عطیہ کے عاقلہ ملیکہ کی مکمل دیت اس کے اولیاء کے حوالہ کریں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دیت ام عطیہ کے عاقلہ پر ہے۔

ابوداود کی ایک روایت میں ہے جس کا تعلق اس کے علاوہ دوسرے قضیہ سے ہے کہ آپ ﷺ نے قاتل کے بیٹے کو بری کر دیا، یعنی قاتل کے بیٹے پر دیت نہیں ہے۔ نسائی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کو اس کے بیٹے کے جرم کی وجہ سے پکڑا نہیں جائے گا''۔ یعنی اگر بیٹا کوئی جرم کرے تو باپ کو اس کی سزا نہیں دی جائے گی اور دیت اس کے عاقلہ پر ہوگی، کیوں کہ دیت اصول پر نہیں رہتی ہے۔

امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے کہ صفیہ بنت عبدالمطلب سیدنا علیؓ کی پھوپھی کی باندیوں میں سے ایک نے جرم کیا تو عمر نے یہ فیصلہ کیا کہ صفیہ کے بھتیجے یعنی علیؓ مظلوم کی دیت ادا کریں،

انہوں نے زبیر بن صفیہ پر دیت کا فیصلہ نہیں کیا، کیوں کہ دیت باپ پر ہے، مجرم کے بیٹے پر نہیں، باپ کی طرح دوسرے وہ افراد ہیں جو مجرم کا جزء اور حصہ ہیں مثلاً بیٹا اور پوتا نیچے تک۔

عاقلہ کے ذمہ قتل خطا اور قتل شبہ عمد کی دیت ہے، اسی طرح یہ دیت عاقلہ کے ذمہ فوراً ادا کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کی ادائیگی کی مدت تین سال ہے۔ (دیکھا جائے ''الوسیط'' غزالی ۶/۳۶۹؛ ''التہذیب'' بغوی ۷/۱۹۱) یہ عاقلہ میں سے ہر ایک پر اس شرط کے ساتھ لازم ہے کہ وہ شخص یہ مبلغ ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اس لیے مالدار پر نصف مثقال سونا اور متوسط پر پاؤ مثقال سونا ہے، اگر اس سے دیت کا مبلغ پورا نہ ہوتا ہو تو باقی بیت المال سے ادا کیا جائے گا، اگر اس صورت میں بھی دیت کا مبلغ پورا نہ ہو تو باقی مجرم کے ذمہ ہے۔

جو دیت مجرم پر لازم ہوتی ہے وہ اس کے عاقلہ پر لازم ہوتی ہے، اس دیت کی ذمے داری مجرم کے سر سے عاقلہ کے سر آتی ہے جب یہ قتل خطا یا شبہ عمد ہو۔

عاقلہ قتل عمد کی دیت ادا کرنے کی ذمے داری نہیں اٹھائیں گے یعنی اس کی ادائیگی عاقلہ پر ضروری نہیں ہے، اسی طرح عاقلہ کے ذمے قصاص کے بدلے ہونے والی صلح کی دیت بھی لازم نہیں ہے کیوں کہ قصاص قتل عمد کی صورت میں مجرم پر لازم ہوتا ہے، اسی طرح اس قتل کی دیت مجرم کے عاقلہ پر نہیں ہے جس کی کوئی دلیل نہ ہو یا اس پر گواہ نہ ہوں، اور مجرم اپنے اور خون کے اولیاء کے درمیان بدامنی پھیلنے کے خوف سے جرم کا اعتراف کرے، اگر عاقلہ مجرم کے اعتراف کی تصدیق کرے تو وہ مجرم کی دیت ادا کریں گے، کیوں کہ اس کی تصدیق کی وجہ سے وہ یہ بوجھ اپنے ذمے لیتے ہیں۔ (''التہذیب'' بغوی ۷/۱۹۸)

عاقلہ پر غلام کی دیت نہیں ہے اور نہ مرتد کی اور نہ ایک کفر سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے والے کی اور نہ کافر کی جو تیر چلائے اور اس کے مسلمان ہونے کے بعد تیر لگے، اور نہ اس کی طرف سے جو مسلمان ہو جائے اور اس کے کافر اور مسلمان عاقلہ کے درمیان قتل کے وقت کے سلسلہ میں اختلاف ہو جائے۔

حادثہ یعنی ایکسیڈنٹ کے مسائل

حادثہ کی قسمیں:

دو پیدل آزاد افراد یا دو آزاد سواروں کے درمیان حادثہ پیش آئے، اگر حادثہ سواروں کے چو پایوں کے ٹکرانے کی وجہ سے ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں ان دونوں اور ان کے چو پایوں کی موت ہو جائے تو ان میں سے ہر ایک کے ذمے دوسرے کے چو پائے کی نصف قیمت لازم ہو جاتی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے عاقلہ پر دوسرے کی نصف دیت مخففہ لازم ہو جاتی ہے۔ اگر حادثہ کرانا مقصود نہ ہو، ورنہ نصف دیت مغلظہ لازم ہو جاتی ہے۔

دیت مخففہ میں پانچ قسم کے اونٹ دیے جاتے ہیں۔ (اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۷/۱۷۸، ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۴/۷۶) دیتِ مغلظہ میں تین قسم کے اونٹ دیے جاتے ہیں۔ ان دونوں کو دیت کی ادائیگی کے لیے وقت دیا جاتا ہے، اور دونوں افراد میں سے ہر ایک پر دوسرے جانور کی قیمت کا آدھا لازم ہو جاتا ہے، یہ اس صورت میں ہے جب یہ جانور ان کی ملکیت کے ہوں، اگر جانور ان کے علاوہ کسی تیسرے کی ملکیت ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک پر دونوں جانوروں کی قیمت کا آدھا آدھا ہے۔

یا دو کشتیوں کے درمیان تصادم ہو جائے جن میں دو ملاح ہوں، جس کے نتیجے میں دونوں کشتیوں میں موجود سبھی چیزیں ضائع ہو جائیں تو وہ ملاح آزاد سوار کی طرح ہیں اور ان کا بھی وہی حکم ہے جو سواروں کا ہے یعنی ان دونوں پر دوسری کشتی کی نصف قیمت لازم ہو جاتی ہے اور دوسری کشتی میں موجود مال کے آدھے حصے کا تاوان بھی، اگر یہ دونوں ملاح تصادم کے ذمہ دار ہوں مثلاً وہ سخت ہواؤں میں کشتیاں لے جائیں یا اپنی ذمے داریوں میں کوتاہی کریں تو ان دونوں پر دونوں کشتیوں کی نصف قیمت اور کشتیوں میں موجود نصف

مال کا تاوان لازم ہو جاتا ہے، اور یہ ان کی وراثت میں سے ادا کیا جائے گا، اور ان دونوں کی نصف دیت دوسرے کے عاقلہ کے ذمے ہو جاتی ہے۔

اگر دونوں ملاح عمداً ٹکرائیں یعنی تیزی کے ساتھ کشتی چلانے کی وجہ سے تصادم ہو جائے اور دونوں کشتیاں ٹوٹ پھوٹ جائیں تو اس صورت میں ہر ملاح کی دیت دوسرے کی وراثت سے دی جائے گی اور اس میں عاقلہ کا دخل نہیں ہوگا، اگر دونوں ملاحوں کا مقصد ٹکرانے کا نہ ہو اور دونوں چلانے میں کوئی کوتاہی بھی نہ کریں، بلکہ سخت ہواؤں کی وجہ سے تصادم ہو جائے تو ان دونوں میں سے کسی پر کشتی کا تاوان نہیں ہے، اسی طرح ان میں موجود سامان کا بھی تاوان نہیں ہے۔

سخت آندھی چلنے کی صورت میں کشتی پر موجود بھاری سامان میں سے کچھ سمندر میں اس مقصد سے پھینکا جا سکتا ہے کہ باقی مال محفوظ رہ جائے، ذی روح یعنی جانوروں کو شروع میں پھینکا نہیں جائے گا، اگر سامان پھینکنے کی صورت میں بھی ڈوبنے کا خطرہ نہ ٹلے تو جانوروں کو پھینکا جا سکتا ہے تاکہ انسان محفوظ رہ جائیں، اگر لوگ کشتی میں موجود اپنا سامان موجود مسافروں کی سلامتی کے لیے پھینک دیں یا سامان پھینکنے کی اجازت دیں تو یہ بات معروف ہے کہ اس میں کوئی تاوان نہیں ہے، اگر سامان کا مالک وہاں موجود نہ ہو اور ان کو اجازت نہ دے تو اس کا تاوان کشتی کے مسافروں پر ہوگا۔

اگر دو افراد ٹکرا جائیں جن میں سے ایک چل رہا ہو اور دوسرا کھڑا ہو، جہاں کھڑا ہے وہ راستہ تنگ ہو، جس کے نتیجہ میں دونوں مر جائیں تو چلنے والے کا خون ہدر ہے اور اس کے عاقلہ پر دوسرے شخص کی دیت واجب ہے یعنی جو کھڑا تھا اس کی دیت، کیوں کہ راستہ سبھوں کے لیے تنگ ہے اور کھڑا شخص راستے سے فائدہ اٹھانے والے سبھی لوگوں میں سے ایک ہے، البتہ چلنے والے شخص نے کھڑے شخص کے تعلق سے حتی المقدور احتیاط نہیں کی یا وہ خود کو کھڑا نہیں کر سکا، وہ چلتا رہا اور کھڑے شخص سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے وہ مر گیا، اس لیے اس کا خون ہدر نہیں جائے گا۔ (یہی بات امام شافعی نے کہی ہے جس کو بغوی نے ''التہذیب'' میں بیان کیا ہے ۷/۱۸۲)

یا چلنے والے اور راستے پر بیٹھے ہوئے شخص کے درمیان تصادم ہو جائے تو اس صورت میں

بیٹھے ہوئے آدمی کا خون ہدر جائے گا اور چلنے والے کی دیت بیٹھے ہوئے شخص کے عاقلہ پر ہوگی:

یعنی تنگ راستے میں چلنے والے اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کے درمیان ٹکراؤ ہو جائے اور اس کی وجہ سے دونوں کی موت ہو جائے تو بیٹھے ہوئے شخص کا خون ہدر ہو جائے گا اور اس کے عاقلہ پر چلنے والے کی دیت لازم ہوگی، کیوں کہ یہ تنگ راستہ ہے جو بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے اور راستے پر بیٹھنے والا شخص غلطی کرنے والا ہے۔

اگر راستہ کھلا ہوا اور کشادہ ہو اور چلنے والا شخص بیٹھے ہوئے شخص پر گر جائے جس کی وجہ سے دونوں کی موت ہو جائے تو چلنے والے کا خون ہدر ہے، کیوں کہ عام راستے سے لوگ مختلف انداز میں فائدہ اٹھاتے ہیں، وہاں بیٹھنا اور کھڑا رہنا راستے کے منافع میں شامل ہے، راستے میں چلنے والا شخص سوئے ہوئے شخص سے ٹکرا جائے تو یہ بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ ٹکرانے کی طرح ہے، اگر راستہ تنگ ہو تو سونے والے کا خون ہدر ہے جس طرح چلنے والا تنگ راستے پر بیٹھے ہوئے شخص سے ٹکرا جائے تو بیٹھے ہوئے کا خون ہدر ہوتا ہے، جب سوئے ہوئے کا خون ہدر ہو تو اس کے عاقلہ چلنے والے کی دیت ادا کریں گے۔

اگر چند لوگ منجنیق چلائیں، لیکن اس میں موجود پتھر ان ہی پر لوٹ آئے جس کی وجہ سے ان کی موت ہو جائے تو ان میں سے ہر ایک کی دیت کا اتنا حصہ ہدر ہوگا جتنا اس کا جرم ہے اور اس میں سے باقی حصہ کو باقی لوگوں کے عاقلہ پر تقسیم کیا جائے گا، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کی موت اس کے عمل اور باقی لوگوں کے عمل کی وجہ سے ہوئی ہے، اس لیے اس کے عمل کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ (دیکھا جائے ''التہذیب'' ۷/۱۸۴۔۱۸۵)

آج منجنیق کی طرح توپ ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ دس افراد منجنیق کو گھما رہے ہوں جن میں سے ہر ایک منجنیق گھماتے وقت شریک ہو تو ان میں سے ہر ایک کے خون کا دسواں حصہ ہدر ہے اور دس میں سے نو حصے دوسروں سے متعلق ہو جاتے ہیں یعنی ہر شخص سے دیت کا دسواں حصہ ساقط ہوگا اور نو حصے عاقلہ پر لازم ہوں گے۔ اگر منجنیق کی جگہ توپ ہو اور گولہ داغا جائے، لیکن یہی گولہ ان پر لوٹ کر گرے جس کی وجہ سے سب قتل ہو جائیں تو یہی حکم ہے۔

واللہ سبحانہ تعالی اعلم۔

جنین پر جرم کرنے کے مسائل

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''التہذیب'' بغوی ۷/۲۱۰، ''مغنی المحتاج'' ۵/۴۴۱، ''اسنی المطالب'' ۴/۸۹)

اگر کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر اتنی سخت مار ماری جائے کہ اس کا حمل گر جائے اور اس میں آدمی کی شکل آ چکی ہو مثلاً گوشت کا لوتھڑا ہو جس میں ہلکی سی شکل رہتی ہے تو جنین مردہ نکل جانے کی صورت میں ایک غلام یا باندی دیت ہے۔ غلام حمل ہو تو اس کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہے یعنی اگر جنین آزاد ہو تو ایک غلام یا باندی دیت ہے۔

ماں کو باپ کی طرح ہی مانا جائے گا اگر وہ دین میں اپنی بیوی سے بہتر اور بڑھا ہوا ہو۔

اگر حمل آزاد اور معصوم ہو، حربی حمل نہ ہو تو اس کی دیت ایک ایسا غلام یا باندی ہے جو سنِ تمیز میں ہو اور وہ ان تمام عیوب سے پاک ہو جس کا اثر خرید و فروخت کے وقت پڑتا ہے، اگر باپ دین اور آزادی میں ماں سے بہتر ہو مثلاً ماں باندی ہو تو اس صورت میں اس کا حمل باپ کے درجہ میں ہوگا اور اس کو آزاد مانا جائے گا، اگر باپ مسلمان ہو اور ماں اہل کتاب میں سے ہو تو حمل باپ کی طرح ہوگا اور دیت ایک غلام یا باندی ہوگی۔

اگر حمل جڑواں ہو اور دونوں ساقط ہو کر مر جائیں تو ان دو کے بدلے دو غلام یا دو باندیاں دیت میں دی جائیں گی، اگر حمل میں دو بچے ہوں، ان میں سے ایک مردہ باہر نکل آئے اور دوسرا زندہ پھر یہ مر جائے تو اس صورت میں ایک غلام دیت میں دیا جائے گا یا مارنے والا دس اونٹ دے گا، اگر اس جگہ اونٹ نہ ہوں تو مجرم اس کی قیمت ادا کرے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان آزاد حاملہ کے پیٹ پر مارے جس کی وجہ سے اس کا جنین مر جائے تو اس پر مردہ جنین کی دیت لازم ہو جاتی ہے اور یہ دیت ایک غلام یا باندی یا دس اونٹ ہے، اگر اونٹ نہ ملے تو اس کی قیمت۔

اگر جنین آزاد نہ ہو یعنی غلام ہو تو مارنے والے مجرم پر ماں کو مارنے کے دن سے حمل ساقط ہونے تک کی سب سے بڑی قیمت کا دسواں حصہ لازم ہوتا ہے۔(دیکھا جائے ''مغنی المحتاج''، شیخ الاسلام زکریا ۱۴۹/۲) غلام جنین کے ساتھ آزاد جنین کا سا معاملہ کیا جائے گا، آزاد جنین میں اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ دیا جاتا ہے، اسی طرح غلام جنین میں اس کی ماں کی قیمت کا دسواں حصہ دیا جائے گا، اس کی ماں کی قیمت کا تعین عیوب سے محفوظ باندی کی قیمت سے کیا جائے گا۔

اگر جنین ناقص ہو تو اس کے ساتھ محفوظ جنین کا سا معاملہ کیا جائے گا اور دیت میں سب سے بڑی قیمت کا اندازہ لگایا جائے گا جس طرح غصب میں کیا جاتا ہے، اگر غصب کی ہوئی چیز ضائع ہو جائے تو سب سے بڑی قیمت دی جائے گی۔(دیکھا جائے: ''الوسیط'' غزالی ۴۰۱/۳، باب الطّواری علی المغضوب)

اگر حاملہ عورت کو مجرم کی طرف سے مار لگے اور اس کا حمل ساقط ہو جائے، اگر حمل زندہ ہو اور اس کے بعد مرے تو مجرم پر مکمل دیت لازم ہو جاتی ہے، اگر جنین غلام ہو اور اس کی ولادت زندہ ہو جائے پھر وہ مر جائے تو مجرم پر غلام کی قیمت واجب ہو جاتی ہے۔

یا اس کی تکلیف موت تک جاری رہے: اگر یہ جنین جس کی مارا گیا ہو اور وہ زندہ باہر نکل آئے اور ولادت کے بعد ہی نہ مرے، بلکہ وہ اس مار کے نتیجہ میں آنے والی تکلیف کو برابر محسوس کرتا رہتا ہو یہاں تک کہ اس کی موت ہو جائے، اگر جنین آزاد ہو تو مجرم پر اس کی مکمل دیت دینا لازم ہے، اگر وہ غلام ہے اور وہ پورا وقت موت تک اس تکلیف کو محسوس کرتا رہے تو مجرم غلام کی مکمل قیمت ادا کرے گا۔

اگر اس کی ولادت کے بعد موت نہ ہو جائے اور وہ تھوڑی مدت زندہ رہے اور اس مدت کے دوران کسی طرح کی تکلیف محسوس نہ ہو یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں تاوان نہیں ہے کیوں کہ ہمیں یقین نہیں ہے کہ اس کی موت کا سبب یہ جرم ہے، اگر اس بارے میں تنازعہ پیدا ہو جائے کہ اس جرم کی وجہ سے موت ہوئی ہے یا نہیں تو مجرم قسم کھائے گا کہ موت اس کے جرم کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے۔

اگر حاملہ عورت اس کو مارنے کے وقت مر جائے تو جنین کی دیت نہیں ہے، کیوں کہ جنین ماں کے پیٹ میں اس وقت مر جاتا ہے جب ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔(اگر جنین زندہ نکل آئے پھر مر جائے تو مارنے والا مکمل دیت دے گا، اگر مردہ نکل آئے تو ایک غلام ہے ''التہذیب'' بغوی ۲۱۲/۷) یا جنین معصوم نہ ہو یعنی جنین حربی کا ہو اور مارنے کے بعد اس کی موت ہو جائے تو اس کی دیت نہیں ہے، کیوں کہ حربی کے جنین کے لیے حرمت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

دیت مغلظہ اور دیت مخففہ

قتل عمد کی دیت اس حیثیت سے مغلظہ ہے کہ اس میں تین قسم کے اونٹ دیے جاتے ہیں، اس کے ساتھ فوراً ادائیگی ضروری ہے اور یہ صرف مجرم پر لازم ہوتی ہے:

قتل عمد کی دیت میں اونٹ دینا واجب ہے اور اس میں تین قسموں کے اونٹ ہیں، اسی طرح فوراً دینا ضروری ہے اور مجرم پر لازم ہوتے ہیں، اس کا حکم اس چیز کا حکم ہے جس کو کسی نے ضائع کیا ہو تو اس پر ضائع کی ہوئی چیز دینا واجب ہوتا ہے۔(دیکھا جائے: ''اُسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۴/۴۸)

قتل خطا کی دیت اس حیثیت سے مخففہ ہوتی ہے کہ اس میں پانچ قسم کے اونٹ ہوتے ہیں اور اس کی ادائیگی کے لیے مکمل جان میں تین سال کی اور مسلمان عورت اور مخنث کی دیت میں دو سال کی مہلت رہتی ہے، پہلے سال مکمل دیت کا ایک تہائی ادا کیا جائے گا اور باقی چھٹا حصہ دوسرے سال ادا کیا جائے گا، معصوم کافر میں ایک سال کی مہلت ہے، اعضاء اور زخموں کی دیت اور حکومہ میں اس کی مقدار کی کمی اور زیادتی کے اعتبار سے ایک سال یا اس سے زیادہ کی مہلت ہے۔

ایسے کافر کی دیت ایک سال میں دی جائے گی جس کا خون ہدر نہ ہو مثلاً ذمی اور امان لیا ہوا کافر، کیوں کہ یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمان کی دیت کا ایک تہائی حصہ ہے۔(یہی مسلک ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک کافر کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہے، مالک اور احمد نے کہا ہے کہ کافر کی دیت مسلمان کے دیت کی آدھی ہے، انہوں نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذمی کی دیت آزاد کی دیت کی آدھی ہے''۔ابوداود نے یہ روایت کی ہے: کتاب الدیات، باب دیۃ الذمی ۴۵۸۳، طبرانی: ''المعجم الکبیر'' ۱۱/۲۸۰، ''المعجم الوسیط'' ۷/۳۰۹، ۷۵۲۸) اور مجوسی کی دیت کے

لیے مہلت چھ مہینے ہیں، کیوں کہ مجوسی کی دیت مسلمان کی دیت کا پندرہواں حصہ ہے، ہاتھ اور پاؤں کی دیت میں، زخم کی دیت میں مثلاً مامومہ میں جس میں ایک تہائی دیت ہوتی ہے ادائیگی کی مہلت ایک سال یا اس سے زیادہ ہے، مامومہ اس زخم کو کہتے ہیں جو سر کے اندر دماغ کے پردہ تک پہنچ گیا ہو، حکومہ اور اس کی قیمت مقرر کرنے میں مثلاً زخم کی جگہوں کی قیمت میں جو ایک تہائی دیت سے زیادہ نہ ہو تو اس کی ادائیگی کی مہلت ایک سال ہے، اگر دو تہائی دیت کے بقدر ہو تو یہ دیت دو سال میں ادا کی جائے گی، اگر دیت کے دسویں حصہ کے بقدر ہو مثلاً انگلی کی دیت جس میں دس اونٹ مقرر ہیں تین مہینے چھ دنوں میں ادا کی جائے گی، خلاصہ یہ کہ مدت دیت کی مقدار کے مطابق طے کی جائے گی۔

۔البتہ اگر جرم حرم مکی میں یا اشہر حرم یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب میں ہو، یا مقتول محرم ہو مثلاً ماں، خالہ اور پھوپھی وغیرہ تو ان تین صورتوں میں قتلِ خطا ہونے کے باوجود دیت مغلظہ ہوگی یعنی اونٹ تین قسم کے ہوں گے، البتہ اس حیثیت سے مخففہ ہوگی کہ اس کی ادائیگی کے لیے مہلت ملے گی اور یہ دیت عاقلہ کے ذمے ہوگی۔

۔قتل شبہ عمد میں دیت اس حیثیت سے مغلظہ ہے کہ تین قسم کے اونٹ دیے جائیں گے اور اس حیثیت سے مخففہ کہ یہ دیت مجرم کے عاقلہ کے ذمے ہوگی۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ اُعلم

قسامہ

قَسامہ قاف کے فتح کے ساتھ ہے: یہ ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو خون کے اولیاء پر تقسیم کی جاتی ہیں، یہ قَسَمَ سے ماخوذ ہے۔ (یہی تعریف شربینی نے کی ہے "مغنی المحتاج" ۴۵۱/۵، "الاقناع" ۲۱۶/۲)

اصطلاح میں قسامہ کہتے ہیں: مدعی کا کسی مخصوص شخص کے خلاف قسم کھانا کہ اس نے میرے قریبی رشتے دار کو قتل کیا ہے، اور قسامہ خلافِ قیاس ہے، اس کو صرف قتل کے دعوی میں ہی سنا جاتا ہے، البتہ قتل کے علاوہ مثلاً ہاتھ کاٹنے یا زخم یا بصارت ختم ہونے وغیرہ میں قسامہ کو نہیں سنا جائے گا، کیوں کہ شریعت میں یہ نص ہے کہ قسامہ صرف قتل میں ہی ہے۔ اور ہم نے یہ بات کہی ہے کہ یہ خلافِ قیاس ہے، کیوں کہ قسم مدعی علیہ کے خلاف ہوتی ہے اور قسامہ میں قسم مدعی کے خلاف ہوتی ہے اور کسی متعین شخص کے خلاف دعوی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ("الوسیط" ۳۹۸/۶)

مذکورہ شرطوں کے علاوہ چند شرطوں کے ساتھ قسامہ جائز ہے یعنی قتل کا دعوی ہو اور مجرم متعین ہو مثلاً کوئی ایسا قرینہ ہو جس کو جرم کے ارتکاب کے لیے علامت ونشانی بنایا جا سکتا ہو اور مدعی کے دعوی کی سچائی کے لیے قرینہ بن سکتا ہو، یا مقتول کا جسم اس کے دشمنوں کے گھر میں ملے، یا چند لوگوں کو دور سے دیکھے کہ مقتول کے اردگرد ہیں اور وہ نظر آ رہے ہیں، وہ مقتول کے پاس سے دوڑ کر دور ہو رہے ہوں جس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ یہی لوگ قاتل ہیں، یا مقتول کے جسم کے ایسے اعضاء اس کے دشمن کے گھر میں ملیں جن کے بغیر کوئی آدمی زندہ نہ رہتا ہو، یا کوئی ایسا قرینہ یا دلیل پائی جائے کہ ان کے ہاتھوں ہی اس شخص کی موت ہوئی ہے۔ اگر مقتول کا سر کسی جگہ ملے اور اس کا دھڑ کسی دوسری جگہ تو مقتول کے اولیاء قسامہ کے ذریعہ قاتل کی تعیین کر سکتے ہیں۔

دشمنوں میں سے مدعی علیہ کے ساتھ دوسرے دشمن نہ رہتے ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے دشمنوں میں سے مدعی علیہم کے ساتھ دوسرے لوگ رہتے نہ ہوں، یہاں دشمن سے مراد دین کے دشمن ہیں یا دنیا کے دشمن، دشمنی سے مراد ایسی دشمنی جو انتقام کی خاطر قتل تک پہنچانے والی ہو، چاہے یہ دشمنی صرف مقتول کی ذات سے ہو یا اس کے قبیلہ یا قوم یا جماعت کے خلاف ہو، کیوں کہ جب مقتول کا سر اور اس کے جسم کا کوئی حصہ کسی جگہ ملتا ہے اور وہاں اس کے دشمنوں کے علاوہ کوئی رہتا نہیں ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قاتل اس محلّہ والوں میں سے ہی کوئی شخص ہے۔ ("روضۃ الطالبین" بحاشیۃ البلقینی ۳۴۱/۸، "مغنی المحتاج" ۴۵۴/۵)

۔مدعی پچاس قسمیں کھائے:

اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بینہ مدعی پر ہے اور قسم انکار کرنے والے پر"۔ (بخاری۔۲) البتہ قسامہ میں قسم مدعی پر ہے، جس نے قتل کا دعوی کیا ہو تو اس پر ایک ہی دن میں پچاس قسمیں کھانا ضروری نہیں ہے، بلکہ پچاس دنوں میں پچاس قسمیں بھی کھا سکتا ہے۔

۔اگر مدعی اور دعوے دار متعدد ہوں تو ہر ایک شخص وراثت میں اپنے حصہ کے اعتبار سے قسم کھائے گا اور تعداد میں کسر ہو تو مکمل قسم کھائی جائے گی:

اگر مقتول کے پانچ بیٹے ہوں تو ان میں سے ہر ایک دس قسمیں کھائے گا، اس طرح قسم کی تعداد یعنی پچاس مکمل ہو جائے گی، اگر مقتول کی صرف بیوی اور ایک بیٹی ہوں تو بیوی اس کی وراثت میں آٹھویں حصہ کی وارث بنتی ہے، اس طرح اس کا حصہ دس قسموں سے کم ہوتا ہے، لیکن اس حالت میں کسر کو مکمل کیا جائے گا اور وہ دس قسم کھائے گی اور بیٹی چالیس قسمیں کھائے گی۔ ("مغنی المحتاج" ۴۶۱/۵) اگر وارثین میں تین بیٹے ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا حصہ ۱۶/۳ ہوتا ہے، اس صورت میں کسر کو پورا کر دیا جائے گا اور ہر ایک کا حصہ ۱۷ بن جائے گا۔

اگر مدعی قسم کھانے سے رکے رہیں تو یہ قسمیں مدعی علیہ کے پاس لوٹے گی، اگر مدعی علیہ چند ہوں تو ان میں سے ہر ایک پچاس قسمیں کھائے گا:

یعنی اگر قتل کے دعوے دار قسم کھانے سے باز رہیں تو یہ قسم مدعی علیہ کے پاس لوٹائی جائے گی، اگر ان کی تعداد مثلاً چار ہو تو ان میں سے ہر ایک کو پچاس قسمیں کھانا ضروری ہے۔

قسامہ میں مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدعی پچاس قسمیں ایک مرتبہ کھاتا ہے، اگر متعدد مدعی ہوں تو یہ قسمیں دن پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ البتہ مدعی علیہم میں سے ہر ایک پچاس قسمیں کھاتا ہے اگر چہ وہ متعدد اشخاص ہوں، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک ان پچاس قسموں کے ذریعہ قتل کی تہمت اور الزام کو اپنے سے دور کرتا ہے۔ اور مدعی اپنے لیے دیت چاہتا ہے۔

اگر مدعی وارثوں میں سے کوئی قسم کھائے اور اس کا انتقال ہو جائے تو نئے وارث کو دوبارہ پچاس قسمیں کھانا ضروری ہے، اگر مدعی علیہ دس قسمیں کھا چکا ہو اور اس کا انتقال ہو جائے تو اس کا وارث چالیس قسمیں کھائے گا۔

اگر مدعی قاضی کے سامنے دس قسمیں کھائے اور نیا قاضی مقرر کیا جائے تو مدعی کو نئے سرے سے پچاس قسمیں کھانا واجب نہیں ہے، اگر مدعی علیہ کسی قاضی کے سامنے دس قسمیں کھائے اور یہ قاضی معزول ہو اور اس کی جگہ دوسرے کو قاضی مقرر کیا جائے تو وہ نئے قاضی کے سامنے اپنی باقی قسمیں مکمل کرے گا یعنی وہ صرف چالیس قسمیں کھائے گا۔ (''مغنی المحتاج'' ۵/۳۶۱)

۔ جب مدعی قسم کھائے تو دیت واجب ہوتی ہے، قصاص نہیں، چاہے یہ قتلِ عمد ہو:

اگر مدعی پچاس قسمیں کھائے تو مدعی علیہ پر قتلِ عمد میں دیت ثابت ہو جاتی ہے، اور قتلِ خطا اور قتلِ شبہِ عمد میں اس کے عاقلہ پر دیت ثابت ہو جاتی ہے۔ قسامہ کے ذریعہ مدعی علیہ پر قصاص واجب نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''یا تم اپنے ساتھی کی دیت دو یا اللہ سے جنگ کا اعلان سمجھو''۔ (بخاری: کتاب الأحکام، باب کتاب الحاکم إلی عمالہ والقاضی إلی أمنائہ ۷۱۹۲) یہاں حدیث میں خطاب قاتل کے اولیاء سے ہے یعنی مدعی علیہم سے، آپ ﷺ ان کو مقتول کی دیت اس کے گھر والوں کو دینے کی ترغیب دے رہے ہیں ورنہ اللہ کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ یا خطاب دعوے داروں سے ہے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ مقتول کے اولیاء کو دیت قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں یا یہ کہ ان

کو قصاص کا کوئی حق نہیں ہے، ورنہ ان کے خلاف اللہ کی طرف سے جنگ ہے۔

قسامہ کے ذریعہ دیت ثابت ہوتی ہے اور قصاص کی نفی ہوتی ہے جب وہ قسم سے انکار نہ کرے، اگر مدعی قسم کھانے سے انکار کر دے تو مدعی علیہ پر قسم کھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر مدعی علیہ یا مدعی علیہم یعنی قاتل یا قاتلین قسم کھانے سے انکار کر دیں تو قسم مردود ہو جاتی ہے اور مردود قسم کو اقرار کی طرح مانا جاتا ہے، اس سے مدعی علیہ پر قصاص ثابت ہو جاتا ہے۔

۔ قسمیں پچاس سے زائد نہیں ہوتی، یہ صرف کسر کو پورا کرنے کی صورت میں ہوتا ہے:

اگر قتل کے دعوے داروں کی تعداد چار ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا حصہ ۱۳ قسم ہوگا، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کا حصہ اصل کے اعتبار سے ساڑھے بارہ ہوتا ہے اور قسم کو آدھا بنانا جائز نہیں ہے۔

۔ اگر قسم کھانے والا اپنی قسمیں مکمل کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کا وارث دوبارہ نئے سرے سے قسمیں کھائے گا:

یعنی اگر کوئی آدمی ۴۹ قسمیں کھائے اور مر جائے تو اس کے وارث پر ضروری ہے کہ شروع سے دوبارہ قسمیں کھائے۔ (''الوسیط'' ۶/۴۰۱)

اگر قتل کا دعوے دار پچاس قسم پورا کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کے وارث پر مکمل پچاس قسمیں کھانا واجب ہے، کیوں کہ جو قسم کوئی شخص کھا رہا ہے تو وہ کسی دوسرے کو نفع نہیں پہنچاتی یا کسی چیز کا پابند نہیں بناتی ہے۔

اگر بعض وارثین غائب ہوں اور حاضر شخص قسم کھائے تو غائب جب حاضر ہو جائے گا تو قسم کھائے گا:

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص کا قتل ہو جائے اور اس کے دو بچے ہوں؛ جن میں ایک حاضر ہو اور دوسرا موجود نہ ہو تو اس صورت میں موجود بیٹے پر پچاس قسمیں کھانا ضروری ہے، جب غائب بیٹا آجائے تو اس پر پچیس قسمیں کھانا واجب ہے۔ (الوسیط ۶/۴۰۲)

کیوں کہ اگر وہ اپنے بھائی کے قسم کھاتے وقت حاضر رہتا تو اس کے حصے کی قسموں کی تعداد

پچیس رہتی، اس کے موجود نہ رہنے کی وجہ سے اس کے بھائی کو پچاس قسمیں کھانی پڑی، اسی طرح دونوں ۷۵ قسمیں کھانے والے بن جائیں گے۔

بعض حالتوں میں قسامہ باطل ہو جاتا ہے: (الوسیط ۳۹۹/۶)

۔وارثوں میں سے کوئی قتل کے دعوی میں دوسرے وارث کو جھٹلائے۔ (یہی مسلک کا قول معتمد ہے، مزنی نے یہ بات کہی ہے کہ اس سے قسامہ باطل نہیں ہوتا ہے کیوں کہ تصدیق کرنے اور جھٹلانے میں وارثین کے الگ الگ مقاصد رہتے ہیں۔ ''الوسیط'' ۴۰۰/۶)

۔اگر قتل کا ملزم جرم ہوتے وقت جرم کی جگہ پر اپنی عدم موجودگی کو ثابت کرے تو اس کے نتیجہ میں الزام کے دوسرے دلائل باطل ہو جائیں گے۔

۔کوئی ایسی دلیل نہ پائی جائے کہ قتل عمداً ہوا تھا یا خطا یا شبہ عمد ہوا تھا، البتہ شرط یہ ہے کہ قتل کا دعوی جرم کی طبیعت اور حیثیت کی تعیین سے خالی ہو اور اس بات کی وضاحت نہ ہو کہ قتل عمداً ہوا تھا یا غلطی سے یا شبہ عمد۔

۔اگر دو گواہ گواہی دیں کہ دو میں سے ایک نے مقتول کو قتل کیا ہے اور دونوں گواہ ان میں سے قاتل کی تعیین نہ کر سکیں۔

۔جب مقتول کا کوئی مخصوص وارث نہ ہو تو قاضی کسی شخص کو اپنی طرف سے متعین کرے گا جو قتل کے ملزم کے خلاف قتل کا دعوی کرے گا، پھر قاضی ملزم سے قسم کھانے کے لیے کہے گا، اگر وہ قسم کھائے تو بری ہو جائے گا، اگر وہ قسم نہ کھائے تو اس کو جیل میں رکھا جائے گا، یا تو وہ قتل کرنے کا اقرار کرے گا یا قسم کھا کر خود کو بری کر دے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

جادو سے قتل کرنے کے احکام

(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''الوسیط'' غزالی ۴۰۸/۶، ''التہذیب'' بغوی ۲۶۱/۷، ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۸۳/۴)

اگر کوئی شخص کسی معصوم آدمی کو جادو سے قتل کر دے جس کا قتل جائز نہ ہو، اور قاتل جادو کے ذریعہ قتل کرنے کا اقرار کرے اور کہے: اس کا جادو عام طور پر قتل کر دیتا ہے۔ یا دو گواہ گواہی دیں تو اس پر قصاص کی حد نافذ کی جائے گی، اور جادو کے ذریعہ قتل کرنے والے کو تلوار یا اس کے مشابہ کسی چیز سے قتل کیا جائے گا۔ (امام بغویؒ نے کہا ہے: سبھی اہل علم کے نزدیک جادو کی ایک حقیقت ہے، اور یہ تصور ہے کہ جادوگر اپنے عمل سے دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَايُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ'' (بقرہ ۱۰۲) (پس وہ ان دونوں سے ایسی چیز سیکھتے ہیں جس کے ذریعہ وہ آدمی اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق ڈالتے ہیں) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو کیا گیا تھا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو چند دن شکایت رہی، پھر آپ ﷺ پر وحی ہوئی کہ فلاں یہودی نے جادو کیا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہے کہ جادو کی ایک حقیقت ہے تو اس کو سکھانا، سیکھنا اور کرنا حرام ہے''۔ ''التہذیب'' ۲۶۱/۷، معتزلہ وغیرہ بعض فرقوں نے جادو کا انکار کیا ہے، اسی طرح احناف میں امام جصاص نے بھی انکار کیا ہے، ان کی تردید امام ماوردی نے کی ہے، ان کی کتاب ''المعلم بفوائد مسلم'' ہے۔ ۸۶/۷)

۔اگر وہ شخص کہے: اس کے جادو سے قتل نہیں ہوتا ہے۔ یا کہے: کبھی کبھار قتل ہوتا ہے تو اس صورت میں دیت لازم ہے، کیوں کہ شروع میں اس کا یہ اعتراف کہ اس نے اپنے جادو سے اس کو قتل کیا ہے تو اس کو عمداً قتل کا مرتکب بنا دیتا ہے، باوجود یہ کہ اس نے کہا ہے کہ میں نے اپنے جادو سے اس کو قتل نہیں کیا ہے، اور میرا جادو قتل نہیں کرتا ہے۔ اس صورت میں قصاص نہیں ہے، کیوں کہ اس کی سچائی کا احتمال ہے اور اس کا بھی کہ اس کا جادو قتل نہیں کرتا ہے۔

اگر وہ کہے: میں نے اس کو اپنے جادو سے قتل کیا ہے اور میرے جادو سے عام طور پر قتل نہیں ہوتا ہے، تو اس کا حکم قتل شبہ عمد کا ہے اور اس پر دیت لازم ہو جاتی ہے۔ (یہی بات نووی نے ''روضۃ الطالبین'' میں کہی ہے ۸؍۲۹۷)

اگر جادوگر کے عاقلہ اس کی تصدیق کریں اور کہیں: اس کا جادو عام طور پر قتل نہیں کرتا ہے تو ان پر دیت لازم ہے، کیوں کہ یہ قتل شبہ عمد ہے۔

جب دو عادل گواہ اس بات کو گواہی دیں کہ اس کے جادو سے قتل ہوتا ہے تو بھی اس پر دیت لازم ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس کے عاقلہ نے اس بات کی تصدیق نہیں کی ہے کہ اس نے قتل کیا ہے، اس وجہ سے جو عمل جادوگر نے کیا ہے وہ قتل خطا ہو جائے گا۔

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا فرمایا اور اس کو عجیب وغریب صلاحتیں عطا کی جن کی وجہ سے اس کو فرشتوں پر فوقیت ہے، یہ ہے نبوت، کبھی وہ گناہ میں ابلیس پر بھی فوقیت لے جاتا ہے، یہ اس وقت ہے جب وہ جادو کرنے لگتا ہے۔

مرتد کے احکام

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''الحاوی الکبیر'' ماوردی ۱۳/ ۱۴۹، ''الوسیط'' غزالی ۶/ ۴۲۵، ''التھذیب'' بغوی ۷/ ۲۸۸، ''مغنی المحتاج'' شربینی ۵/ ۴۸۹، ''الإعلام بقواطع الإسلام'' ابن حجر ہیتمی)

مرتد وہ ہے جو اسلام سے نکل جائے، اس کو مرتد ہوتے ہی توبہ کی نصیحت کرنا واجب ہے، اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا، جس طرح نماز چھوڑنے والے کو توبہ کے لیے کہنا واجب ہے، اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

مرتد سے توبہ کے لیے کہنا کفریہ کلمہ کہنے کے فوراً بعد واجب ہے، اگر وہ توبہ کرے تو اس کو معاف کر دیا جائے گا، اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا، جس طرح نماز چھوڑنے والے سے فوراً توبہ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، اگر وہ توبہ کرے اور فرض نماز ادا کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا، اگر وہ نماز کی فرضیت کے انکار پر مصر رہے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ (توبہ کے لیے کہنے کی دلیل یہ ہے کہ عمرؓ نے اس مرتد کے بارے میں کہا جس کو ابوموسی اشعریؓ نے پہلی فرصت میں قتل کر دیا تھا: ''اے اللہ! میں تیرے پاس ابوموسی کے عمل سے براءت کرتا ہوں، تم نے اس کو تین دن قید کیوں نہیں کیا، اس کو ہر دن ایک روٹی دیتے تا کہ وہ توبہ کرتا''۔ موطا امام مالک: کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فیمن ارتد عن الاسلام ۲؍۷۳۷، ''معرفۃ السنن والاثار'' بیہقی ۱۲؍۲۵۷)

ارتداد کے معنی دین مبین سے پھرنے کے ہیں، مرتد اور اس کی بیوی کے درمیان علحیدگی کرنا ضروری ہے، شرط یہ ہے کہ اس مرتد کی طلاق صحیح ہوتی ہو یعنی وہ بالغ اور عاقل ہو چاہے وہ نشہ کی حالت میں ہی ہو۔

اس وقت ارتداد مانا جائے گا جب کوئی بالغ عاقل اور مختار شخص اپنے اسلام کو توڑ دے اور کفر کی طرف چلا جائے، چاہے یہ کفر کی نیت سے ہو یا اپنی زبان سے کفریہ عبارت نکالے، یا کوئی ایسا کام کرے جو کام کفر ہو، چاہے یہ کام مذاق اور استہزاء میں کرے یا سرکشی

میں یا کوئی عقیدہ رکھ کر، آدمی نیت، قول اور فعل سے مرتد ہوجاتا ہے جس کا مقصد اسلام سے نکلنا اور کفر سے جاملنا ہو، یہاں ارتداد اور کفر اصلی کے درمیان فرق ہے، یہ کہ کافرِ اصلی مثلاً یہودی اور نصرانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، البتہ مرتد کو اس کے ارتداد کی حالت میں نہیں چھوڑا جائے گا اور اس سے توبہ اور دوبارہ اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسری بات قبول نہیں کی جائے گی۔

مرتد کو اسلامی احکام کی پابندی پر مجبور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرتد ہونے سے پہلے مسلمان تھا اور اس نے ان احکام کو قبول کیا تھا، اس وجہ سے اس کو اسلامی فرائض یعنی نماز روزے وغیرہ کے اقرار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

مرتد عقد نکاح نہیں کرسکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ مرتد کو اس کے حال پر چھوڑا نہیں جائے گا، اگر وہ دوبارہ اسلام نہ لائے تو اس کو قتل کردیا جائے گا۔ (کیوں کہ مرتد کو اس کے ارتداد پر باقی رکھا نہیں جاتا ہے اور نکاح سے مراد دوام ہے۔ یہ بات بغوی نے کہی ہے ''التہذیب'' ۷/۲۹۲)
اسی طرح مرتد کی بیوی کا نکاح باطل ہوجاتا ہے، اگر وہ عدت گزرنے سے پہلے دوبارہ مسلمان نہ ہوجائے تو یہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوتی ہے، اس کا ذبیحہ کھانا بھی حرام ہے اور اس کی شادی کرانا بھی جائز نہیں ہے۔ جب مرتد کو اس کے ارتداد کے دوران قتل کردیا جائے تو اس کا خون ہدر ہے اور اس کے قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ (''التہذیب'' ۷/۲۹۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو اپنا دین تبدیل کردے تو اس کو قتل کردو''۔ (بخاری: کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین وقتالھم، باب حکم المرتد والمرتدۃ واستتابتھم ۶۹۲۲، مسند احمد ۱۸۷۱، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۴۷۶، یہ روایت ابن عباسؓ سے ہے)

مرتد کی سبھی ملکیت وقف مانی جائے گی۔ یعنی اس میں تصرف نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی اپنے ارتداد پر باقی رہے اور اسی حال میں وہ مرجائے تو اس کی سبھی املاک بیت المال میں چلی جائیں گی، اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے تو اس کی سبھی املاک اس شرعی اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کو لوٹادی جائے گی کہ ''مرتد کے لیے کوئی ملکیت نہیں اور اس کو قید نہیں کیا

جائے گا''، یعنی اس کے لیے کوئی بھی ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قیدی کا سا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح نہ مرتد کا فدیہ دیا جائے گا اور نہ اس کو آزاد کرکے احسان کیا جائے گا، نہ وہ وارث ہوتا ہے اور نہ دوسرے اس کے وارث بنتے ہیں، اس کو اپنی آزادی کے بدلے اپنی جان کا فدیہ دینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور نہ اس پر احسان کرکے اس کو چھوڑ دیا جائے گا، اسی طرح وہ وارث نہیں بنتا ہے، کیوں کہ وہ اسلام نہ لائے تو اس کا خون ہدر ہے، اور نہ دوسرے اس کے وارث بنتے ہیں کیوں کہ اگر وہ حالتِ ارتداد میں مرتا ہے تو اس کا اپنا کوئی مال نہیں رہتا ہے کہ اس مال کے وارث بننے کی ضرورت پیش آئے، اس لیے کہ اس کا پورا مال بیت المال کا ہوجاتا ہے، مرتد اور کافرِ اصلی کے درمیان یہ بارہ فرق ہیں۔

اس مسئلہ میں مرتد کافر اصلی کی طرح ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حربیوں کو تعاون دے تو مرتد پر کسی بھی نقصان کا معاوضہ دینا واجب ہوجاتا ہے چاہے ان کے املاک میں یا مال میں اس جنگ کی وجہ سے خسارہ ہوجائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

سکران کے احکام

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے: ''التھذیب'' بغوی ۷/۲۹۴، ''روضۃ الطالبین'' بحاشیۃ البلقینی ۸/۴۸۳)

سکران (نشہ کیا ہوا شخص) وہ شخص ہے جو اچھے اور برے میں تمیز نہ کرسکتا ہو، امام شافعی نے اس کی یہ تعریف کی ہے: ''یہ وہ ہے جس کے منظوم کلام میں کمی آجائے اور اس کا پوشیدہ راز منکشف ہوجائے''۔ (غزالی نے اس کو ''الوسیط'' میں نقل کیا ہے ۵/۳۹۱)

سکران کے سبھی تصرفات مکلّف کی طرح ہی نافذ ہوتے ہیں، کیوں کہ زنا کا الزام لگانے اور اس کے ارتداد واسلام میں اس کا مواخذہ کرنے پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے، البتہ نشہ کی حالت میں اس پر حد نہیں لگائی جائے گی بلکہ نشہ ختم ہونے تک انتظار کیا جائے گا، اگر نشہ کی حالت میں حد نافذ کی جائے تو قول اصح کے مطابق دوبارہ حد نافذ کی جائے گی، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سکران کو لایا گیا تو آپ نے اس کو مارنے کا حکم دیا۔

(بخاری: کتاب الحدود، باب الضرب بالجرید والنعال ۶۴۰۴)

مکلّف یعنی عاقل اور بالغ شخص، صحابہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سکران پر زنا کے الزام کی حد نافذ کی جائے گی اگر وہ کسی پر زنا کا الزام لگائے، اسی طرح صحابہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ سکران کے سبھی تصرفات صحیح ہوتے ہیں چاہے وہ اس کے حق میں ہوں یا اس کے خلاف، اگر کوئی نشہ کی حالت میں مرتد ہوجائے تو اس کے ارتداد کا اعتبار ہوتا ہے اور اس پر ارتداد کے احکام نافذ ہوتے ہیں، حالانکہ اس کے سلسلہ میں ارتداد کو ثابت کرنے میں اس کا نقصان ہے، اسی طرح ارتداد کے بعد اسلام میں دوبارہ آنے کو بھی اس حالت میں قبول کیا جاتا ہے جس میں اس کے لیے بہتری ہے۔

نشہ کی حد اس شخص پر نافذ نہیں کی جائے گی جس کی عقل نشہ کی وجہ سے ٹھکانے پر نہ ہو، یہ چالیس سے لے کر اسّی کوڑے ہیں، اس کے ہوش میں آنے تک انتظار کرنا ضروری ہے

تاکہ اس کو کوڑوں کی تکلیف کا احساس ہو اور وہ دوبارہ شراب نہ پیئے، البتہ اگر نشہ کی حالت میں ہی شراب کی حد نافذ کی جائے تو یہ کافی ہے، اس کی دلیل بخاری کی روایت ہے کہ آپ کے پاس نشہ میں ایک شخص کو لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد نافذ کرنے کا حکم دیا۔

نشہ کے بارے میں جاننے کا مرجع عرف ہے، اگر لوگوں کے نزدیک کوئی حالت معروف ہو کہ اس حالت میں آدمی نشہ میں رہتا ہے تو اس پر سکران کا حکم لگایا جائے، نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، وہ نشہ سے باہر آنے کے بعد نماز کی قضا کرے گا، اگر کوئی نشہ کی حالت میں مرتد ہوجائے تو مستحب یہ ہے کہ اس کو نشہ کی حالت میں توبہ کرنے کے لیے نہ کہا جائے۔ (''التھذیب'' بغوی ۷/۲۹۴) اگر اس میں شعور ہو اور اس سے توبہ کے لیے کہا جائے اور وہ توبہ کرلے تو اس کی توبہ صحیح ہے، البتہ جب وہ اپنے نشہ سے باہر آئے تو اس کو کلمہ کی تلقین کی جائے گی، اگر کلمہ کی گواہی دے تو وہ مسلمان ہے، نشہ سے باہر آنے کے بعد کلمہ کی گواہی نہ دے تو اس وقت سے اس کے مرتد ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

مجبور کرنے کے مسائل

(امام شافعی نے اکراہ کی تعریف یوں کی ہے:''اکراہ یہ ہے کہ آدمی ایسے شخص کے ہاتھوں میں پھنس جائے جس سے بچنے کی اس میں طاقت نہ ہو مثلاً بادشاہ یا چور یا غالب آنے والا''۔الأم ۳/۲۳۶)

اکراہ کے لیے شرط یہ ہے کہ مجبور کرنے والا اپنی دھمکی کو حکومت یا طاقت کی وجہ سے فوراً اور ظلماً پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور جس کو مجبور کیا جا رہا ہے یعنی مُکرَہ بھاگ کر یا کسی دوسرے طریقہ سے اپنے دفاع سے عاجز ہو اور اس کو یہ گمان ہو کہ اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تو مجبور کرنے والا اپنی دھمکی پورا کردے گا، یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اکراہ اس وقت موکد ہو جاتا ہے جب مُکرہ کے پاس کوئی نفسیاتی محرک ہو، محرک یہ ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہوں اور مجبور کردہ شخص کو یقین ہو کہ اگر وہ اس کا حکم نافذ کرنے سے باز رہے گا تو وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائے گا، اس صورت میں مجبور کردہ مجبور کرنے والے کی بات ماننے میں معذور ہے، اس صورت میں اگر وہ گناہ اور محرمات کا ارتکاب کرے مثلاً کسی بت کے سامنے سجدہ کرے یا کفریہ کلمات زبان سے نکالے یا گالی کے جملے دہرائے تو یہ اکراہ مانا جائے گا، یہ بھی ضروری ہے کہ اکراہ کا تعلق موجودہ وقت سے ہو، اگر مجبور کرنے والا کہے: اگر تم نے ابھی ایسا نہیں کیا تو میں تم کو کل ماروں گا۔تو یہ اکراہ میں شمار نہیں ہوگا، بلکہ یہ ظلم و زیادتی میں شمار ہوگا۔

ممنوع چیز کا خوف دلانے سے اکراہ حاصل ہوتا ہے مثلاً سخت مار، طویل قید اور مال کو ضائع کرنا وغیرہ، ڈرانے میں بھی مجبور شخص کے اعتبار سے اختلاف ہوتا ہے، اگر کوئی حمالی کا کام کرتا ہے تو اس کو ایک سو ڈنڈے مارے جائیں تو بھی وہ برداشت کرتا ہے، جب کہ معاشرے میں بڑا مقام و مرتبہ رکھنے والا شخص لوگوں کے سامنے ایک مار کو بھی برداشت نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے چہرے پر تھوکنے کو بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔

اگر دھمکی کا مقصد کسی حق کو پورا کرنا ہو تو اس کو اکراہ نہیں مانا جائے گا، اگر حاکم قرض

دار کو اس کی ملکیت کی چیزیں بیچنے کے لیے مجبور کرے تاکہ وہ لوگوں کا قرض ادا کرے تو یہ اکراہ نہیں ہے۔

بغیر حق کے مجبور کردہ شخص کا تصرف نافذ نہیں ہوگا مثلاً کوئی شخص دوسرے کی طرف سے مجبور کیے جانے کی وجہ سے کفریہ کلمات کہے تو اس کو کافر نہیں مانا جائے گا، اسی طرح مجبور کردہ کی طلاق بھی نہیں ہوتی ہے، اللہ تعالی اپنی کتاب میں فرماتا ہے:''إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ''(نحل ۱۰۶)(سوائے اس کے جس کو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو) حاکم کی روایت میں ہے جس کو انہوں نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اکراہ میں طلاق نہیں ہے''۔(مسند احمد:۲۶۳۶۰،ابوداود: کتاب الطلاق ،باب فی الطلاق علی الغلط ۲۱۹۱۳،مسند ابویعلی ۴۴۴۴،حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے ۲/۱۹۸، یہ مسلم کی شرط پر ہے)

۔اگر کوئی جرم کرے تو اس پر قصاص لازم ہے: یعنی مجبور کرنے والے اور مجبور کردہ پر قصاص نافذ کرنا ضروری ہے، یعنی اگر زید عمرو کو بکر کا قتل کرنے پر مجبور کرے تو زید اور عمرو دونوں کو قصاص میں قتل کرنا ضروری ہے، کیوں کہ پہلے نے قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور دوسرے نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔(امام ابوحنیفہ اور محمد بن حسن کا خیال ہے کہ مجبور کردہ پر قصاص نہیں ہے، کیوں کہ اس نے اپنے جان کے دفاع کے لیے قتل کیا ہے، بغوی نے ''التہذیب'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے ۷/۶۴، پھر دوسرا قول بیان کیا ہے اور بتایا ہے یہی قول اُصح ہے اور احناف کے ایک زبردست امام زفر بن ہزیل نے یہ کہا ہے: اس پر قصاص واجب ہے ، کیوں کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے پر ظلم کر کے قتل کیا ہے، بالکل اسی طرح جو کھانے پر مجبور ہو اور کسی کو قتل کر کے کھا جائے تو اس پر قصاص واجب ہے)

واللہ سبحانہ وتعالی اُعلم

قسم اور نذر کے احکام

أیمان کےلغوی معنی: یہ **یمین** کی جمع ہےاوراس کے معنی قسم کے ہیں۔شرعی معنی: کسی غیر ثابت معاملہ کوموکد کرنا، چاہے وہ معاملہ ماضی سے تعلق رکھتا ہو یا مستقبل سے،نفی میں ہو یا اثبات میں، وہ ممکن ہو یا ناممکن۔ (یہی تعریف شربینی الخطیب نے کی ہے"مغنی المحتاج" ۲۴۴/۶)عرب قسم کویمین کہتے ہیں، کیوں کہ جوعربوں میں سے قسم کھانے کاارادہ کرتا تو وہ اپنا داہنا ہاتھ (یمین) دوسرے کے داہنے ہاتھ میں قسم کے وقت رکھتا۔

قسم مشروع ہونے کی دلیل قرآن، حدیث اوراجماع ہے،اللہ تعالی کا فرمان ہے: "**لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ** " (مائدہ ۸۹) (اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری پکڑ نہیں فرمائے گا)امام بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح قسم کھاتے تھے: "**لَا وَمُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ** "۔(نہیں، دلوں کے پھیرنے والے کی قسم) (بخاری: کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی ﷺ ۶۶۲۸)اسی طرح قسم کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

قسم کی دو قسمیں ہیں: جو جھگڑے کے وقت کھائی جاتی ہے اور جو جھگڑے کے علاوہ میں کھائی جاتی ہے۔

جھگڑے میں قسم مدافعت کے لیے کھائی جاتی ہےاور یہ انکار کرنے والے کی قسم ہے،اور یہ وہ قسم ہے جودعوی میں کھائی جاتی ہے یامدعی کے دعوی کی تردید میں،مثلاً عمرو قسم کھاتا ہے کہ وہ زید کوکوئی قرض دینے والانہیں ہے۔یہ زید کے اس دعوی کی تردید ہے کہ عمرو پر اس کے ایک ہزار روپے قرض ہیں۔اس قسم کا مقصد دعوی کرنا اوراپنے سے اس الزام کی تردید کرنا ہے۔

یمین استحقاق کی پانچ قسمیں ہیں: لعان، قسامہ، مال میں ایک گواہ کے ساتھ قسم، مدعی علیہ کی طرف سے قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مدعی کے پاس لوٹنے والی قسم، یہ مدعی

علیہ کی طرف سے اقرار کی طرح ہے، بینہ کی طرح نہیں،اور دو گواہوں کے ساتھ قسم اور یہ عیب کی صورت میں مال لوٹانے میں کھائی جاتی ہے،شوہر کے خلاف بیوی کی طرف سے نامردی کے دعوی، باطنی عضو میں زخم ہونے کے دعوی میں جب زخمی کرنے والا دعوی کرتا ہے کہ یہ عضو صحیح سالم نہیں ہے،تنگ دست ہونے کے دعوی میں، غائب کے خلاف دعوی میں اور میت کے خلاف دعوی میں،اس وقت جب شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم کو گزشتہ کل طلاق ہے۔پھر وہ کہے کہ میں نے دوسرے سے طلاق مراد لیا ہے۔

قسم استحقاق میں قسم کھانے والا اپنے حق کا مطالبہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے،مثلاً لعان میں شوہر قسم کھاتا ہے کہ اس کی بیوی نے زنا کیا ہے تاکہ بیوی کی طرف سے اس پر لعان نہ کیے جانے کی صورت میں بیوی پر حد نافذ کی جائے،قسامہ میں مدعی پچاس قسمیں مقتول کی دیت کا حق دار بننے کے لیے کھاتا ہے، مالی جھگڑوں میں اگر مدعی کے پاس صرف ایک گواہ ہوتو وہ اپنا حق ثابت کرنے کے لیے قسم کھاتا ہےاورخرید وفروخت، مال کی واپسی،ضمانت، حوالہ،خیاراوراس کی مدت میں یہ قسم استعمال کی جاتی ہے۔

یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ مالی جھگڑوں میں قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام بنتی ہے، اگر دو گواہ پائے جائیں تواپنا حق ثابت کرنے کے لیے مدعی کوقسم کھانے کی ضرورت نہیں رہتی ہے،اگر زید یہ دعوی کرے کہ عمرو پر اس کے ایک ہزار روپے قرض ہے اوروہ گواہ نہ لائے اورعمرو قسم کھائے کہ وہ قرض دار نہیں ہےتو یہ مسئلہ ختم ہوجاتا ہے،اگر عمرو قسم زید کے حوالہ کردے اور زید اس کوقبول کرلے اور وہ قسم کھائے تواس کا حق ثابت ہوجاتا ہے، کیوں کہ یہاں قسم بینہ سے زیادہ طاقت ور ہےاور یہ مدعی علیہ کی طرف سے اقرار کے برابر شمار ہوتا ہے۔

اگر دو گواہ پائے جائیں تو مدعی سے قسم کھانے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا،البتہ اس سے چار مسائل مستثنی ہیں:

۱۔عیب کی بنیاد پر خریدا ہوا مال واپس کرنے کی صورت میں، جب بیچنے والا خریدنے والے سے کہے: جب میں نے یہ چیز تم کو بیچی تھی تو اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔اس کے

جواب میں خریدنے والا کہے: بلکہ میرے خریدنے سے پہلے ہی اس میں عیب موجود تھا۔ پھر وہ اس پر قسم کھائے گا۔

۲۔ جب بیوی اپنے شوہر کے نامرد ہونے کی قسم کھائے یعنی اس میں جماع کی طاقت نہیں ہے۔ اس صورت میں قاضی شوہر کو ایک سال کی مہلت دے گا، جس کے بعد شوہر آ کر کہے کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا ہے۔ اور بیوی کہے کہ نہیں کیا ہے اور وہ ابھی تک باکرہ ہے۔ اس صورت میں بیوی سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے باکرہ رہنے پر دو گواہ لے آئے اور اس سے یہ قسم کھانے کا بھی مطالبہ کیا جائے گا کہ اس کے شوہر نے ایک سال کے دوران اس کے ساتھ جماع نہیں کیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے عقدِ نکاح کے فسخ ہونے کا حکم حاصل کرلے۔

۳۔ کسی باطنی عضو پر جرم کی صورت میں: اس صورت میں مدعی سے قسم کا مطالبہ کیا جائے گا تاکہ وہ معاوضہ یا زخم کی مخصوص دیت کا مستحق بن جائے، اس کے دعوی کے صحیح ہونے پر دو گواہوں کی موجودگی کے باوجود اس سے قسم لی جائے گی۔

۴۔ کوئی تنگ دست ہونے کا دعوی کرے اور وہ اپنا قرض ادا نہ کرے تو گواہوں کی موجودگی کے باوجود اس سے قسم کھانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

۔ جو قسم جھگڑے کے علاوہ میں ہوتی ہے تو وہ یمین لغو ہے۔ (یہ تشریح حضرت عائشہ سے ثابت ہے: بخاری: کتاب الأیمان والنذور، باب لایؤاخذکم اللہ باللغو فی أیمانکم ۶۶۶۳، ابن حبان: کتاب الأیمان ۴۳۳۳)
مثلاً کوئی قسم کے ارادے کے بغیر کہے: کلا واللہ ، بلی واللہ ۔ اور مجبور کردہ شخص کی قسم ہے، یہ دونوں قسم منعقد نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص آپ سے دریافت کرے: کیا تم زید کے گھر گئے تھے؟ اس کے جواب میں تم کہو: نہیں، اللہ کی قسم! یا دریافت کرے: کیا تم بازار گئے تھے؟ اس کے جواب میں کہو: نہیں، اللہ کی قسم! ۔ یہ بات واضح ہے کہ یہاں قسم مراد نہیں ہے۔ مجبور کردہ شخص کی قسم اس لیے منعقد نہیں ہوتی ہے کہ مجبور کیے جانے کی وجہ سے اس نے قسم کھائی ہے۔

۔ اختیار کی وجہ سے منعقد ہونے والی قسم مثلاً کوئی ماضی کی بات پر قسم کھائے۔ یعنی عمداً جھوٹی قسم کھائے تو اس کو یمین غموس کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہ قسم اس کو گناہ اور آگ میں

ڈبو دیتی ہے۔ (غموس کے معنی ڈبونے کے ہیں) اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، یمین غموس اور والدین کی نافرمانی''۔ یا کہا: ''اور کسی کو قتل کرنا''۔ بخاری: کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالی ''ومن أحیاھا'' ۶۸۷۰، یہ روایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ہے۔ مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' ابن حجر ہیتمی ۲/۱۸۱۔۱۸۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''یمین غموس علاقہ کو ویران بنا دیتی ہے''۔ (السنن الکبری للبیہقی: کتاب الایمان، باب ماجاء فی الیمین الغموسی ۱۸۴۸۲، ''المعجم الکبیر'' طبرانی ۱۹/۱۵۰، ''المعجم الوسیط'' ۲/۱۹، رقم ۱۰۹۲)

قسم یا تو لفظ اللہ، یا اس کے ناموں میں سے کسی نام یا اس کی صفات میں سے کسی صفت کے ذریعہ کھائی جاتی ہے مثلاً: میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، میں رحمان کی قسم کھاتا ہوں، میں رب العالمین کی قسم کھاتا ہوں۔ یا کہے: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے سامنے بندے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس نے میری روح کو پیدا فرمایا ہے۔ یا کہے: میں اللہ کی عظمت اور کبریائی کی قسم کھاتا ہوں۔ یہ سب قسم ہے، اگر وہ اپنی قسم پوری نہ کرے تو اس پر کفارہ واجب ہوجاتا ہے۔

۔ یا طلاق یا آزاد کرنے یا جھگڑے کے وقت نذر کے ذریعہ قسم کھائے: نذر لجاج کسی ایسے ثواب کے کام کی پابندی ہے جس کو وہ کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور اس کو نذر مانے ہوئے کام یا یمین کے کفارہ کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔ طلاق کی مثال یہ ہے کہ مثلاً شوہر کہے: اگر میں گھر میں داخل ہوا تو میری بیوی کو طلاق ہے۔ اگر وہ گھر میں داخل ہوا تو طلاق ہوجاتی ہے۔ آزادی کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کہے: اگر میں زید کے گھر داخل ہوگیا تو میرا غلام آزاد ہے، اگر وہ زید کے گھر میں داخل ہوجائے تو اس کا غلام آزاد ہوجاتا ہے۔

''نذرِ لجاج'' کی مثال یہ ہے کہ کہے: اگر میں نے زید کے ساتھ گفتگو کی تو مجھ پر ایک ماہ کے روزے ہیں۔ اگر وہ زید کے ساتھ بات کرے تو اس کو اختیار ہے کہ یا تو وہ ایک مہینے کے روزے رکھے یا اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے۔ لیکن نذر تبرر میں اپنی نذر کا کفارہ دینا صحیح

نہیں ہے۔مثلاً اگر کوئی کہے: اگر میرا بیمار شفایاب ہوا تو میں تین دنوں کے روزے رکھوں گا۔تو اس صورت میں روزے ہی فرض ہیں، اس کی طرف سے کفارہ قبول نہیں ہے۔نذرِ تبرر اور نذر لجاج میں فرق یہ ہے کہ یہ جھگڑے کی حالت میں نذر مانی جاتی ہے جس سے کوئی چیز کرنے کا ارادہ نہیں رہتا۔نذر تبرر میں اس کو حاصل کرنے کا ارادہ رہتا ہے۔

اگر کوئی قسم میں طلاق کو استعمال کرے تو اس کا کوئی شمار نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: ''میں اپنی بیوی کی طلاق کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا''۔اس صورت میں اس کی بیوی کو طلاق نہیں ہوتی ہے اور نہ گوشت کھانے میں کوئی رکاوٹ ہے، اس کی حقیقت وہی ہے جیسے کوئی قسم کھائے کہ میں بکری کے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ زید سے نہیں بولوں گا۔اس قسم کی کوئی قیمت نہیں ہے۔(کیوں کہ طلاق کے ذریعہ قسم نہیں کھائی جاتی ہے، اگر کوئی طلاق کی قسم کھائے تو اس کی قسم لغو ہو جاتی ہے جیسا کہ ''اسنی المطالب'' شیخ الاسلام زکریا ۳/ ۲۷۵ میں ہے)

اللہ تعالی کی ذاتی صفات اور فعلی صفات کے درمیان فرق یہ ہے کہ ذاتی صفات وہ ہیں جن سے اللہ کا وصف بیان کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسری صفات کے ذریعہ اللہ کا وصف بیان نہیں کیا جاتا ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں: اللہ علام الغیوب ہے۔اللہ سبحانہ وتعالی کو اس کے برعکس صفت کے ذریعہ موصوف کرنا صحیح نہیں ہے۔

فعلی صفات وہ صفات ہیں جو اللہ تعالی کے لیے جائز ہیں اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔مثلاً ہم کہتے ہیں: اللہ رحیم ہے۔اور یہ بھی کہتے ہیں: اللّٰہ شدید العقاب ہے۔یا ہم کہتے ہیں: اللہ عطا کرنے والا ہے۔اللہ روکنے والا ہے۔

۔اگر کوئی اللہ یا اس کی صفت کا تذکرہ نہ کرے تو یہ قسم نہیں ہے۔اگر کوئی کہے: اگر میں نے ایسا کیا تو میں یہودی بن جاؤں گا۔یا کہے: اگر میں نے ایسا کیا تو میں اسلام سے بری ہوں۔اگر میں نے ایسا کیا تو میں کافر ہو جاؤں گا۔اگر وہ ایسا کرے تو قسم توڑنے والا نہیں ہوگا۔اور نہ وہ اسلام سے بری ہوگا، اگر وہ اپنی قسم توڑ دے تو کافر نہیں بنتا ہے، یہ اس وقت ہے کہ اگر اس کی نیت ان تمام امور سے دور رہنے کی ہو۔

۔قسم کا حکم چار امور سے ختم ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی اپنی قسم کے لیے کوئی مدت متعین کرے اور یہ مدت ختم ہو جائے مثلاً کہے؛ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں زید سے ایک ماہ تک بات نہیں کروں گا۔اور وہ زید سے اس مدت کے دوران بات نہ کرے۔یا کہے: اللہ کی قسم! میں ضرور زید سے بات کروں گا۔اور وہ اس سے بات کرے۔یا وہ اپنی قسم توڑ دے مثلاً کہے: اللہ کی قسم! میں زید سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔اور اس سے بات کرلے۔یا کسی چیز کی قسم کھائے اور اس کا نفاذ ناممکن ہو جائے۔مثلاً کوئی کہے: اللہ کی قسم! میں اس گلاس میں پانی نہیں پیوں گا۔پھر یہ گلاس گر کر ٹوٹ جائے اور پانی بہہ جائے۔

۔اللہ تعالی کی مشیئت کے ذریعہ یا قسم کے بعد فوراً استثناء کرے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مشیت الٰہی کو مقدم کرے اور اس کو قسم کے ساتھ ملائے مثلاً کہے: اللہ کی قسم! میں اس طرح کروں گا اگر اللہ چاہے۔(کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ فرمان روایت کیا گیا ہے: ''جو قسم کھائے اور کہے: اگر اللہ چاہے تو قسم توڑنا نہیں ہے''۔ابو داود: كتاب الأيمان والنذور، باب الاستثناء في اليمين ۳۲۶۱، ترمذی: كتاب النذور والايمان، باب في الاستثناء في اليمين ۱۵۷۰، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۴۳۴۰، یہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے) یا کہے: اگر اللہ کا ارادہ ہو۔اللہ کی طرف مشیت اور ارادہ کی نسبت کا مطلب ایک ہی ہے۔

۔جو کوئی قسم کھائے اور دوسری چیز کو اس سے بہتر پائے تو جو بہتر ہے اس کو کرنا چاہیے پھر اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

مثلاً کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ اپنے بھائی سے بات نہیں کرے گا۔پھر اسے محسوس ہو جائے کہ بھائی کے ساتھ بات نہ کرنے سے ان کے درمیان دشمنی پیدا ہو جائے گی، اور بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی سے بات کرے۔اس صورت میں وہ اپنے بھائی سے بات کر سکتا ہے۔جب اس سے بات کرے گا تو اس پر اپنی قسم کا کفارہ دینا واجب ہوتا ہے۔صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! اگر اللہ چاہے تو کسی چیز کی قسم کھاؤں اور مجھے قسم کے علاوہ کوئی دوسری چیز بہتر نظر آئے تو میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کروں گا

اور جو بہتر ہے وہ کروں گا"۔(بخاري، كتاب الكفارات، باب الإستثناء فى الأيمان ٦٣٥٠)

۔اگر قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرے تو جائز ہے، البتہ اس سے کفارہ کا روزہ مستثنٰی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنی قسم توڑنے سے پہلے ہی کفارہ فقیروں میں تقسیم کرسکتا ہے، البتہ کفارہ کے روزوں میں قسم توڑنے کے بعد ہی رکھنا ضروری ہے۔(شوافع نے اس کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کوئی قسم کھائے پھر دوسری چیز اس سے بہتر پائے تو وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور یہ کام کرے"۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب من ندب من حلف یمینا ۱۶۵۰، یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔)

قسم کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کیا جائے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا ان کو کپڑے پہنائے جائیں، جو اپنی قسم توڑ دے تو وہ اپنی قسم توڑنے سے پہلے ان تین میں سے کوئی بھی کفارہ ادا کرسکتا ہے، البتہ تین روزے کفارہ کے طور پر رکھنے کی صورت میں قسم توڑنے کے بعد ہی رکھنا واجب ہے، اگر وہ ابتدا میں بیان کردہ تین کفاروں میں سے کوئی کفارہ ادا نہیں کرسکتا ہے تو روزے رکھے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ بدنی عبادت ہے جس کو پہلے ادا کرنا ممکن نہیں ہے، مثلاً رمضان کے روزے رمضان کے مہینے کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں رکھنا جائز نہیں ہے اور کوئی بھی مسلمان رمضان شروع ہونے سے پہلے رمضان کے روزے شروع نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح قسم توڑنے کے کفارہ میں بھی اس وقت روزوں کی ابتدا ہوگی جب وہ قسم توڑ دے۔

۔اگر کوئی اپنی بیوی سے شادی کرنے یا اس کو چھوڑنے کی قسم کھائے، پھر وہ عدت رجعی کے دوران اس کے ساتھ شادی کرے تو پہلی صورت میں وہ اپنی قسم پوری کرنے والا ہوگا اور دوسری صورت میں قسم توڑنے والا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ شادی کرے گا پھر اس کو طلاقِ رجعی دی اور اس کی عدت کے دوران اس سے شادی کرے تو وہ اپنی قسم پوری کرنے والا بن جائے گا، اگر وہ یہ قسم کھائے کہ وہ اس سے شادی نہیں کرے گا پھر اس کے ساتھ

طلاقِ رجعی کی عدت میں شادی کرلے تو قسم توڑنے والا ہوگا اور اس پر کفارہ لازم ہوجاتا ہے۔

۔اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ یہاں نہیں رہے گا اور نہ دوسروں کو ٹھہرائے گا، یا وہ سواری نہیں کرے گا یا کپڑے نہیں پہنے گا اور وہ قسم کھاتے وقت یہی کام کررہا ہو اور اسی کو جاری رکھے تو وہ قسم توڑنے والا ہوجائے گا۔

یعنی اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ اپنے گھر میں نہیں بیٹھے گا اور وہ قسم کے دوران اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ور پھر وہ بیٹھا ہی رہے تو قسم توڑنے والا ہوگا اور اس پر کفارہ لازم ہے۔

۔اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ ایک ہی گھر میں سکینہ کے ساتھ نہیں رہے گا، پھر وہ اس کے ساتھ رہنا جاری رکھے تو وہ قسم توڑنے والا ہوگا اور اس پر کفارہ لازم ہوجاتا ہے۔

۔اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ کار پر سواری نہیں کرے گا اور قسم کھانے کے دوران سوار ہو اور سوار ہی رہے تو وہ قسم توڑنے والا ہوگا اور اس پر کفارہ لازم ہوتا ہے۔

اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ اپنے کپڑے نہیں پہنے گا اور وہ قسم کے دوران کپڑے پہنے ہوئے ہو پھر اپنے کپڑے اتارے نہیں بلکہ اس کو پہنے رہے تو وہ قسم توڑنے والا ہے اور اس پر کفارہ لازم ہے۔

ان تمام صورتوں میں جس کام کی اس نے قسم کھائی ہے کہ فلاں کام یہ نہیں کرے گا اور اس کو کرتا رہے تو اس کو قسم توڑنا مانا جائے گا اور اس پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب اس کام کو مدت کے ساتھ متعین کرنا ممکن ہو۔

اگر کام ایسا ہو جس کی مدت متعین کرنا ممکن نہ ہو مثلاً کوئی قسم کھائے کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ اور وہ شادی شدہ ہو۔ یا قسم کھائے کہ وہ عطر نہیں لگائے گا اور وہ پہلے سے عطر لگایا ہوا ہو اور ابھی تک اس کی خوشبو باقی ہو یا قسم کھائے کہ وہ عورت سے جماع نہیں کرے گا جب کہ وہ جماع کررہا ہو اور اس کو جاری رکھے۔ یا سھواً قسم کھائے کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا اور وہ نماز میں ہی ہو اور وہ اپنی نماز جاری رکھے تو وہ اپنی قسم میں حانث (قسم توڑنے والا) نہیں ہوگا، اگر وہ ان چار صورتوں یا ان کے مشابہ شکلوں میں قسم کھائے۔

اگر کوئی قسم کھائے کہ وہ یہ پھل نہیں کھائے گا اور یہ پھل اس کے منہ میں ہی ہو اور اس کو نہ نکالے بلکہ اس کو روکے رکھے تو پھل کا ایک حصہ کھا کر بچا ہوا نکالنے پر قسم پوری کرنے والا ہوگا۔ اگر وہ اس میں سے تھوڑا حصہ کھائے اور باہر بھی نہ نکالے تو وہ اپنی قسم میں حانث ہوگا اور اس پر کفارہ لازم ہو جاتا ہے۔

۔یا قسم کھائے کہ وہ یہ پھل نہیں کھائے گا پھر یہ پھل کھجور کے ساتھ مل جائے اور ایک کھجور چھوڑ کر سب کھائے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ البتہ تقوی یہ ہے کہ خود کو حانث مانے اور اس احتمال کی وجہ سے کفارہ ادا کرے کہ جو باقی بچا ہوا کھجور ہے وہ اس کے علاوہ دوسرا کھجور ہے جس پر اس نے قسم کھایا ہے۔

۔یا قسم کھائے کہ وہ گیہوں نہیں کھائے گا اور وہ میدہ یا ستّو کھائے یا اس کی روٹی کھائے۔ یا قسم کھائے کہ گوشت نہیں کھائے گا، پھر اوجھڑی کھائے، یا بکرے کے گوشت کے علاوہ دوسرا گوشت کھائے یا شکار کا گوشت، گھوڑے کا گوشت اور پرندہ کا گوشت کھائے۔ یا تازہ کھجور نہ کھانے کی قسم کھائے پھر سوکھا کھجور کھائے۔ یا دودھ نہ پینے کی قسم کھائے، پھر دہی یا پنیر کھائے۔ یا ستو نہ کھانے کی قسم کھائے پھر پانی میں ملا کر ستّو کھائے، یا یہ قسم کھائے کہ روٹی نہیں کھائے گا، پھر اس کو گھلا کر پی جائے، یا کسی چیز کے نہ پینے کی قسم کھائے، پھر اس کو چکھے۔ یا فلاں کے ساتھ بات نہ کرنے کی قسم کھائے پھر چند لوگوں کو سلام کرے جن میں یہ شخص بھی ہو اور وہ اس کے علاوہ دوسروں کو سلام کرنے کی نیت کرے۔ یا قسم کھائے کہ فلاں کے ساتھ بات نہیں کرے گا پھر اس کو خط لکھے یا اس کے پاس کسی کو پیامبر بنا کر بھیجے۔ یا قسم کھائے کہ وہ سر نہیں کھائے گا پھر بکری کے علاوہ دوسرے جانور کا سر کھائے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ (اِن شکلوں کو امام بغوی نے اپنی کتاب "التھذیب" میں بیان کیا ہے ۷/۱۱۴-۱۳۳)

اگر کوئی کسی چیز کی قسم کھائے تو اس وقت حانث ہوگا جب وہ قسم کھائی ہوئی چیز کرے، اگر وہ قسم کھائے کہ گوشت نہیں کھائے گا اور مچھلی کھالے تو وہ حانث نہیں ہوگا کیوں کہ لوگ مچھلی کو گوشت نہیں کہتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی قسم کھائے کہ تازہ کھجور نہیں کھائے گا اور سوکھا

کھجور کھائے تو وہ حانث نہیں ہوگا کیوں کہ تازہ کھجور سوکھے کھجور سے الگ ہے۔

۔یا قسم کھائے کہ وہ اللہ کی مکمل ثنا بیان کرے گا۔ اس صورت میں وہ کہے: "الحمد للّٰہ حمداً یوافي نعمه و یکافئُ مزیده " تو اس کی یہ قسم پوری ہو جائے گی۔ (اسی طرح یہ کہنا بھی ہے: "الحمد للّٰہ حمداً کثیراً طیبا مبارکا فیه کما یحب ربنا أن یحمدو ینبغي له "۔ اس سلسلہ میں صحیح حدیث ہے: مسند امام احمد ۱۲۶۱۲، "المعجم الکبیر" طبرانی ۴/۴۲۳، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے ۷۴۵، یہ روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے) یا وہ یہ قسم کھائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے افضل درود بھیجے گا۔ اور درود ابراہیمی پڑھے جو تشہدِ اخیر میں پڑھا جاتا ہے تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔

نذر کے احکام

نذر کے لغوی معنی بھلائی یا برائی کا وعدہ کرنے کے ہیں۔

شرعی معنی کسی ایسے ثواب کا کام اپنے اوپر لازم کرنا جو فرض نہیں ہے۔ یہ کام اس صورت میں فرض ہوتا ہے جب وہ اپنے اوپر فرض کرتا ہے۔ (یہی تعریف شربینی نے ''مغنی المحتاج'' میں کی ہے ۶/۲۷۶)

نذر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ نذر لجاج:

مثلاً کوئی غصہ کی حالت میں کہے: اگر میں زید سے گفتگو کروں تو جو بھی میرے پاس ہے وہ فقراء پر صدقہ ہے۔ زید سے بات کرنے کی صورت میں اس کو اپنے پورے مال کو صدقہ کرنے یا اپنے قسم کا کفارہ ادا کرنے کے درمیان اختیار ہے۔ یہ مکروہ نذر ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ (کیوں کہ اس نذر کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''یہ کسی چیز کو لوٹاتی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ بخیل سے نکالا جاتا ہے''۔ بخاری: کتاب الأیمان والنذور، باب النہی عن النذر ۴۲۱۳)

۲۔ نذر تبرر، یہ اللہ کی اطاعت کرنے کی نذر ہے۔

نذر کے ارکان تین ہیں: نذر ماننے والا، نذر مانی ہوئی چیز اور صیغہ مثلاً یہ کہنا: میں نے نذر مانا، مجھ پر اللہ کی خاطر واجب ہے، یا میں نے یہ فقراء کے لیے بنادیا۔ یا کہے: میں نے نذر مانی کہ میں فقراء کو ایک ہزار درہم دوں گا، اس صورت میں اس پر یہ رقم فقراء کو دینا لازم ہو جاتا ہے۔

میت کے لیے نذر ماننا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر اطاعت کے سلسلہ میں ہو تو صحیح ہے، مثلاً وہ نذر جو کسی ایسے شہر میں فقراء کو دینے کے لیے جہاں قبر پائی جاتی ہے اور وہاں ایک صالح آدمی مدفون ہے۔

نذر کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ'' (حج ۲۹) (اور وہ اپنی نذریں پوری

کریں) امام بخاری کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ کی اطاعت کی نذر مانے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جو اللہ کی معصیت کی نذر مانے تو وہ اس کی معصیت نہ کرے''۔ (بخاری: کتاب الأیمان والنذور، باب النذور فی الطاعۃ ۶۷۰۰، مسند احمد: ۲۴۰۷۵، صحیح ابن حبان ۴۳۸۷، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے ہے)

۔ نذر ثواب کے کام میں صحیح ہے مثلاً حج یا نماز کی نذر ماننا، جو حج کی نذر مانے تو اس پر حج کرنا ضروری ہے، یا اپنے بدل میں کسی دوسرے کو نائب بنا کر بھیجنا ضروری ہے، جس طرح فرض حج میں ہے کہ اگر اس میں کوئی سخت بیماری ہو جس کی وجہ سے وہ حج نہ کرسکتا ہو تو دوسرے کو بھیجتا ہے، جو نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس پر کم سے کم نماز یعنی دو رکعتیں پڑھنا ضروری ہے۔

حرام نذر یا مکروہ نذر ماننا جائز نہیں ہے اور مباح نذر بھی نہیں ہوتی ہے مثلاً کھجور یا گوشت نہ کھانے کی نذر مانے، البتہ نکاح کی نذر مانے تو منعقد ہو جاتی ہے اگر وہ نکاح مباح ہے جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے۔ (تحفۃ المحتاج) جو شادی کرنے کی نذر مانے تو اس پر شادی کرنا ضروری ہے۔

نذر میں یہ شرط ہے کہ وہ کسی ایسی اطاعت کی نذر نہ مانے جو ہر مسلمان پر فرض عین ہو، مثلاً کوئی ہر دن پانچ نمازیں پڑھنے کی نذر مانے، اس نذر کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں کہ پانچ نمازیں اس پر فرض ہیں چاہے وہ نذر مانے یا نہ مانے، اور یہ نذر صحیح نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح حرام نذر بھی ہے مثلاً یہ نذر مانے کہ وہ وضو کے بغیر نماز پڑھے گا تو یہ نذر باطل ہے، اسی طرح مکروہ نذر ہے، مثلاً کوئی نذر مانے کہ وہ پوری زندگی روزے رکھے گا جب کہ وہ جانتا ہے کہ وہ پوری زندگی روزے نہیں رکھ سکتا ہے۔ یا یہ کہ اس روزے کی وجہ سے اس پر لازم حقوق ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ نذر صحیح نہیں ہوتی ہے۔

۔ اگر کسی متعین سال میں حج کرنے کی نذر مانے، البتہ کوئی دشمن یا اس کا قرض خواہ یا سلطان اس کو روک دے تو اس پر قضاء نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی متعین جانور کی قربانی کرنے کی نذر مانے اور وہ مر جائے تو اس کی قضاء نہیں ہے، یا مرض کی وجہ سے وہ جا نہ سکے یا بھول نے یا راستہ کھو جانے کی وجہ سے احرام کی نیت نہ کرسکے یا وقت میں غلطی کی وجہ سے احرام سے پہلے ہی نیت کرے تو قضاء نہیں ہے۔ البتہ خود سے تاخیر کرے تو یہ عذر نہیں ہے،

اگر کوئی متعین سال کے شعبان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کی نذر مانے اور وہ بیمار ہو جائے اور اس میں شعبان کا مہینہ نکل جائے تو اس پر قضا لازم نہیں ہے۔

۔اگر کسی متعین سال روزہ رکھنے کی نذر مانے تو نذر کی وجہ سے پورا سال روزے رکھے گا، البتہ ممنوعہ دنوں میں نہیں رکھے گا اور ان دنوں کی قضا نہیں کرے گا اور نہ رمضان کے مہینہ کے بدلے ایک مہینہ زائد روزے رکھے گا۔

یعنی اگر کوئی شخص سال ۱۴۳۵ کے روزوں کی نذر مانے تو اس پر اس سال کے روزے واجب ہوتے ہیں، البتہ اس سے ممنوع دنوں کے روزے مستثنی ہیں، یہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دو دن اور عید الاضحیٰ کے بعد والے تین دن ہیں اور عورتوں کے لیے حیض اور نفاس کے دن ہیں۔ (نووی نے اس کو "المنہاج" میں ترجیح دی ہے اور بغوی نے "التہذیب" ۷/۱۵۷ میں صحیح کہا ہے) اور نذر ماننے والے پر ان دنوں کی قضا نہیں ہے، اسی طرح اس پر رمضان کی بھی قضا نہیں ہے کیوں کہ رمضان اصلاً روزوں کا مہینہ ہے اور اس میں روزے رکھنے سے نذر اور فرض دونوں سے بھی کافی ہو جاتے ہیں۔

۔یا اس دن روزہ رکھنے کی نذر مانے جس دن فلاں شخص آنے والا ہو، اگر رات کے وقت آئے تو نذر ختم ہو جائے گی۔ دن کے وقت آئے تو نذر پورا کرے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نذر مانے کہ جس دن زید سفر سے آئے گا تو وہ روزہ رکھے گا، اگر زید رات کے وقت آئے تو یہ نذر ختم ہو جائے گی، اگر زید دن کے وقت آئے تو اس پر نذر پورا کرنا ضروری ہے۔ (اس میں اختلاف ہے جس کو بغوی نے "التہذیب" میں بیان کیا ہے ۷/۱۶۱) اگر وہ شخص عید کے دن آئے یا ایسے دن جس دن اس کی بیوی حائضہ ہو تو بیوی کے نذر ماننے کے صورت میں اس دن کے بدلے دوسرے دن روزہ فرض نہیں ہے، اگر زید سفر سے صبح کے وقت آئے اور اس وقت روزہ رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔

۔یا اس دن ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانے جس دن زید آئے پھر زید پیر کے دن آئے تو وہ آنے والے ہر پیر کو روزہ رکھے گا اور اس کی قضا واجب نہیں ہے:

اسی طرح اگر کوئی ہر پیر کو روزہ رکھنے کی نذر مانے، پھر ایک سال روزے رکھنے کی نذر مانے پھر مکمل ایک سال روزہ رکھے تو اس سال کے پیر کے دنوں کی وہ قضا نہیں کرے گا۔

ذبیحہ کے احکام، قربانی کے مسائل

قربانی مشروع ہونے کے دلائل قرآن، حدیث اور اجماع ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" (کوثر ۲) (پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے) یہاں نماز سے مراد عید الاضحیٰ کی نماز ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سینگ والے چکنے مینڈھے قربانی کیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا، اللہ کا نام لیا اور تکبیر کہی پھر اپنا پاؤں ان کے گردن پر رکھا۔ (بخاری: کتاب الاضاحی، باب فی اضحیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکبشین اقرنین ۵۲۴۰، صحیح مسلم: کتاب الاضاحی، باب وقتہا ۳۷۲۴) عید الاضحیٰ کے دن اور اس کے بعد والے تین دنوں یعنی ایام تشریق میں قربانی مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ ("الاجماع" ابن منذر ۲۴۔۲۵)

۔مینڈھے کی قربانی ایک سال مکمل ہونے اور اس کے علاوہ دوسرے جانوروں کی قربانی دو سال مکمل ہونے پر صحیح ہے، اگر اونٹ کی قربانی ہو تو پانچ سال مکمل ہونا ضروری ہے، ان عمروں کی تعیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث سے ثابت ہے۔

۔بکری اور گائے میں دو سال مکمل ہو کر تیسرا سال شروع ہونا اور اونٹ میں چھٹا سال شروع ہونا ضروری ہے: امام احمد وغیرہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک سال کی مینڈھے کی قربانی کرو کیوں کہ یہ جائز ہے"۔ (مسند امام احمد ۲۶۴۶۱، السنن الکبری للبیہقی: کتاب الضحایا، باب لایجزی الجذع إلا من الضأن وحدھا ویجزی الثنی ۱۷۷۳۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ مینڈھے کی قربانی ایک سال مکمل ہونے سے پہلے جائز نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے: "دو سال والا ہی جانور ذبح کرو، اگر یہ تم پر دشوار ہو تو ایک سالہ مینڈھا ذبح کرو"۔ (صحیح مسلم: کتاب الأضاحی، باب سن الأضحیۃ ۳۷۲۵) حدیث میں

"مسنۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اس جانور کے ہیں جس کے دو یا اس سے زائد سال مکمل ہو گئے ہوں۔

۔بکری ایک کی طرف سے اور اونٹ و گائے سات کی طرف سے کافی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے کہا، ہم نے حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اونٹ کو سات افراد اور گائے کو سات افراد کی طرف سے ذبح کیا۔ (مسلم: کتاب الحج، باب الاشتراک فی الهدی وإجزاء البقرۃ والبدنۃ کل منهما عن سبعۃ ۱۳۱۸)

۔ایسے عیب کی موجودگی میں قربانی صحیح نہیں ہوتی جس سے کھانے میں کمی آتی ہو، اس لیے بہت زیادہ کانے، بہت زیادہ لنگڑا اور بہت زیادہ بیمار جانور کی قربانی صحیح نہیں ہے جس کا کانا پن، لنگڑا پن اور بیماری واضح ہو، اسی طرح بہت کمزور جانور کی قربانی صحیح نہیں جو چارہ نہ کھاتا ہو، اور نہ کھجلی والے جانور کی قربانی صحیح ہے۔ (کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کی قربانی نہ ہونے کا فرمان ثابت ہے، مسند احمد: ۱۸۵۱۰)

۔سینگ ٹوٹے ہوئے کی اور تھن نہ پائے جانے والے کی اور سورین نہ پائے جانے والے کی قربانی صحیح ہے، البتہ کان نہ ہو تو صحیح نہیں ہے۔

۔قربانی کے جانور کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرنا مسنون ہے، یہ اللہ تعالی کے اس فرمان سے مستفاد بات پر عمل کرتے ہوئے ہے۔ "وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ" (حج ۳۲) اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقوی میں سے ہے۔

عید الاضحیٰ کی نماز مکمل ہونے کے بعد تک ذبح کو موخر کیا جائے گا کیوں کہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد قربانی کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری: کتاب الضاحی، باب سنۃ الأضحیۃ ۵۲۳۲، مسلم: کتاب الأضاحی، باب وقتها ۳۷۱۶)

قربانی میں نیت شرط ہے اور نیت کی جگہ دل ہے، چاہے قربانی سنت ہو یا واجب، اگر کوئی اپنی زبان سے یہ کہے تو صحیح ہے "جَعَلْتُ هٰذِهِ الشَّاةَ أُضْحِيَةً لِلّٰهِ" (میں نے اس بکری کو اللہ کے لیے بطور قربانی پیش کیا) اور اس کا بھی اضافہ کر سکتا ہے: "اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهَا

خَالِصَةً لِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ" (اے اللہ! اس کو خالص اپنے لیے قبول فرما) یہ دعا ذبح کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ اگر کوئی عید کی نماز سے پہلے البتہ سورج طلوع ہونے کے بعد دو رکعت نماز اور خطبہ عید کا وقت گزر جانے کے بعد قربانی کرے تو یہ قربانی صحیح ہوتی ہے۔ (دیکھا جائے "عجالۃ المحتاج" ۱۷۳۹/۴)

اگر قربانی کرنے والا جانور قصائی کے حوالہ کرے تو صرف دل سے نیت کرنا کافی ہے۔

۔ذبح کرنے والا مسلمان، بالغ اور عاقل ہو، چاہے مرد ہو یا عورت، البتہ اگر بچہ ہے تو ممیّز رہنا شرط ہے۔

۔حائضہ یا پاگل یا بچہ کا ذبح کرنا ایسے اہل کتاب شخص کے ذبح کرنے سے زیادہ محبوب ہے جس کا ذبیحہ حلال ہے۔

۔ذبح دن کے وقت کیا جائے اور ذبح کے لیے نرم جگہ کا انتخاب کیا جائے، صبح کے وقت قربانی کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فقراء دن کے وقت حاضر ہو، اگر کوئی رات کے وقت کرے تو کافی ہے۔

۔اگر کوئی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن نہ نکالے، کیوں کہ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: "جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھو اور تم میں سے کوئی قربانی کرنا چاہے تو وہ اپنے بال اور ناخن نکالنے سے رکا رہے"۔ (مسلم: کتاب الأضاحی، باب نهی من دخل علیه عشر ذی الحجۃ وهو مرید التضحیۃ ۱۹۷۷، یہ روایت ام سلمہ سے ہے)

۔قربانی کے جانور کو قبلہ رو کرے اور اللہ تعالی کا نام لے کر نبی ﷺ پر درود بھیجے اور یہ کہے: "اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذَا مِنْكَ وَإِلَيْكَ فَتَقَبَّلْ مِنِّي"۔ (اے اللہ! یہ تیری طرف سے ہے اور تیری ہی طرف لوٹنے والا ہے، پس تو مجھ سے قبول فرما) قبلہ کی طرف رخ کرنا نبی ﷺ کی سنت ہے۔ (السنن الکبری للبیہقی: کتاب الضحایا، باب السنۃ فی أن یستقبل بالذبیحۃ القبلۃ ۹/۲۸۵، یہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے)

۔جانور کا سر دھڑ سے الگ نہ کرے، اگر جانور کو ہڈی سے ذبح کرے اور اس کی وجہ

سے حلقوم اور مری یعنی سانس کی رگ کٹ جائے اور اس میں مستقل زندگی موجود ہو تو یہ جانور حلال ہو جاتا ہے، البتہ ذبح کرنے والا گنہگار ہوگا، سر دھڑ سے الگ کرنے میں جلدی نہ کرے بلکہ جانور کے ٹھنڈا ہونے تک انتظار کرے پھر اس کے بعد سر الگ کرے۔ شرعی ذبح یہ ہے کہ حلقوم اور سانس کی نلی کٹ جائے، اگر کوئی گدّی کی طرف سے جانور کو ذبح کرے تو یہ ذبیحہ حلال ہو جاتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ حلقوم اور سانس کی نلی کٹ جائے اور حیوان میں مستقل زندگی حلقوم اور سانس کی نلی کاٹتے وقت موجود ہو، البتہ ذبح کرنے والا گنہگار ہوگا، کیوں کہ جانور کو گدّی کی طرف سے کاٹنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

اونٹ کو نحر کیا جائے اور گائے و بکری کو ذبح کیا جائے، نحر کی جگہ گدّی ہے اور ذبح کی جگہ جبڑوں کو جمع کرنے والی جگہوں کے نیچے ہے، مکمل ذبح یہ ہے کہ حلقوم اور سانس کی نلی کے ساتھ گردن کے کنارے والی دونوں رگیں کٹ جائیں۔

نحر یہ ہے کہ اونٹ کی گردن پر نیچے سے نیزہ مارا جائے تاکہ خون بہہ جائے اور اونٹ گرے، اس وقت اس کا حلقوم اور سانس کی نلی کاٹی جاتی ہے اور نیزہ گردن کے نیچے گلے میں مارا جاتا ہے۔ ذبح یا نحر اس وقت مکمل ہو جاتا ہے جب حلقوم اور سانس کی نلی کے ساتھ دونوں کناروں پر موجود رگوں کو بھی کاٹا جائے۔

یہ سنت ہے کہ اونٹ کھڑا ہو اور اس کا بایاں پاؤں عقال میں گردن کے پاس ہو تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے اور حلقوم اور سانس کی نلی کاٹ کر اس کا ذبح مکمل کرنے میں آسانی ہو، تاکہ ذبح کرنے والے کے ہاتھ میں چھری نہ ہلے۔ البتہ بکری اور گائے کو زمین پر بائیں پہلو پر لٹا کر ذبح کیا جائے، اس وقت اس کے اگلے اور پچھلے پاؤں بندھے ہوئے ہوں، البتہ اس کا داہنا پاؤں کھلا ہو۔

جانور کی نظروں سے دور چھری تیز کرنا مسنون ہے، کیوں کہ جانور کو بھی انسان کی طرح احساس ہوتا ہے۔ (کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ثابت ہے: ''اللہ نے ہر چیز پر احسان یعنی بھلائی کو لکھ دیا ہے، اس لیے جب تم قتل کرو تو احسان کے ساتھ قتل کرو، اور جب تم ذبح کرو تو احسان کے ساتھ ذبح کرو اور تم میں سے ہر ایک اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے'' مسلم: کتاب الصید والذبائح، باب

الامر باحسان الذبح ۱۹۵۵، ابوداود: کتاب الاضاحی، باب فی النہی ان تصبر البہائم والرفق بالذبیحۃ ۲۸۱۵، یہ روایت حضرت شداد بن اوسؓ سے ہے) افضل یہ ہے کہ قربانی کا پورا گوشت صدقہ کیا جائے، مسلک کا قول مشہور یہ ہے کہ وہ خود ایک تہائی کھائے اور باقی صدقہ کرے۔ (عجالۃ المحتاج ۴/۱۷۴۱)

۔قربانی کا آخری وقت ایام تشریق کے آخری دن کا سورج غروب ہونے تک ہے، ایام تشریق سے مراد عید الاضحیٰ کے بعد کے تین دن ہیں، اس کا اول وقت عید کے دن صبح سورج طلوع ہو کر دو رکعت نماز اور دو مختصر خطبوں کا وقت گزر جانے کے بعد ہے، اگر اس وقت میں ذبح نہ کرے تو اس کے بعد بطور قضا قربانی کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن قاسم نے ابو مسلم بن عبد الرحمٰن اور سلیمان بن یسار سے نقل کیا ہے کہ قربانی کا وقت ذی الحجہ کے ختم ہونے تک رہتا ہے۔

۔اگر دو افراد ایک دوسرے کا جانور ذبح کرے تو دو جانوروں کی قیمت کے درمیان جو کمی بیشی ہے اس کا ضامن بنے گا اور نذر کی وجہ سے واجب قربانی ہو جائے گی۔

اگر زید اور عمرو کے پاس دو قربانی کے جانور ہوں، زید عمرو کے قربانی کے جانور کو اس کے علم کے بغیر ذبح کر دے اور عمرو زید کے قربانی کے جانور کو اس کے علم کے بغیر ذبح کر دے تو یہ قربانی نذر کی وجہ سے واجب قربانی کے لیے کافی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک پر ضروری ہے کہ وہ دوسرے کو قربانی کے جانور کی مخصوص قیمت جو اس کو ذبح کرنے سے پہلے کی ہو ادا کرے۔ کیوں کہ قربانی کا جانور ذبح کرنا ثواب کا کام ہے اور جو قربانی کے جانور کے مالک کے علم کے بغیر ذبح کرے تو اس نے اس کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے ثواب سے محروم کر دیا ہے۔

اگر زید اور عمرو کے ذمہ نذر کی وجہ سے کوئی قربانی واجب نہ ہو اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا جانور ذبح کر دے تو قربانی صحیح نہیں ہوگی، کیوں کہ قربانی میں نیت ضروری ہے اور نیت میں کوئی دوسرے کی نیابت نہیں کر سکتا ہے۔

رات کے وقت قربانی کا جانور ذبح کرنا مکروہ ہے، اگر جانور کا مالک دن کے وقت مشغول رہتا ہو تو مکروہ نہیں ہے، اگر رات کے وقت فقراء زیادہ جمع ہوتے ہوں تو بھی مکروہ نہیں ہے۔

عقیقہ کے احکام ومسائل

عقیقہ کے لغوی معنی بچہ کی ولادت کے وقت سر پر پائے جانے والے بال کے ہیں۔

شرعی معنی: وہ بکری جو بچہ کا بال اس کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ کرنے کی غرض سے نکالتے وقت ذبح کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ''بچہ اپنے عقیقہ کا مرہون ہے''۔(ترمذی: أبواب الأضاحی، باب من العقیقة ۱۴۸۲، مستدرک حاکم: کتاب الذبائح ۷۶۵۴) بکری ولادت کے ساتویں دن ذبح کی جاتی ہے اور اس کا سر منڈھا کر نام رکھا جاتا ہے۔''مرہون ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس بچہ کا عقیقہ نہیں کیا جاتا تو اس کی فطری نشوونما نہیں ہوتی ہے۔امام احمد نے کہا ہے: جس کے بچے کا عقیقہ اس کے والد نہیں کرتے ہیں تو وہ آخرت میں اپنے والدین کی سفارش نہیں کریں گے۔

۔بچہ کی طرف سے دو بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری عقیقہ کرنا سنت ہے۔اگر چار ماہ ہونے پر بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ حالت میں باہر نکل آئے اور اس میں روح پھونکی جا چکی ہو تو اس بچے کی طرف سے عقیقہ کرنا سنت ہے، کسی کو بچہ ہونے کی مبارکباد دیتے وقت یہ کہنا سنت ہے: ''اللہ تم کو اس بچے میں برکت دے اور اس کی اطاعت عطا فرمائے''۔

۔عقیقہ کی ہڈی نہ توڑنا بچے کے اعضاء کی سلامتی کے لیے اچھا شگون لیتے ہوئے مسنون ہے، اعضاء کو الگ الگ کیا جائے گا اور مٹھاس ڈال کر پکایا جائے گا اور فقراء کو کھلایا جائے گا۔

عقیقہ کا گوشت جانور کے کنارے والے حصوں کو چھوڑ کر پورا کا پورا پکایا جائے اور کنارے والے حصوں کو پکائے بغیر ایسے شخص کو ہدیہ دیا جائے جو اس گوشت کو قبول کرے، عقیقہ کا گوشت کوئی میٹھی چیز مثلاً کھجور یا شکر وغیرہ ڈال کر پکایا جائے گا تا کہ اس میں

مٹھاس آئے اور یہ نیک شگون ہو۔اور یہ فال نیک اور بشارت لی جائے کہ بچہ کی زبان، اخلاق اور عمل میٹھے ہوں گے۔عقیقہ کا گوشت بھی قربانی کے گوشت کی طرح فقراء میں تقسیم کیا جائے، البتہ عقیقہ کرنے والا اس میں سے تھوڑا سا برکت کے لیے لے۔

فصل

اس فصل میں ان امور کو بیان کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں معمول بہ تھے اور اسلام نے ان کو باطل کر دیا، یا جو دین ابراہیم سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ ابوخزاعہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف نے ان کو گڑھا تھا، اکثم بن جون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''میں نے عمرو بن لحی کو آگ میں اپنی انتڑیوں کو گھسیٹتے ہوئے دیکھا''۔ (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ۴۳۵۶۔ مسلم: کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا وأھلھا، باب النار یدخلھا الجبارون والجنۃ یدخلھا الضعفاء ۵۲۰۴)

خندف الیاس بن مضر کی بیوی ہے، عمرو بن لحی نے توحید کو بدل دیا جو اسمٰعیل علیہ السلام کا دین ہے۔ اور اس کے بدلے بت پرستی کو رواج دیا، وہ پہلا شخص ہے جس نے سائبہ، بحیرہ، وصیلہ اور حام کا تصور دیا۔

۔زمانہ جاہلیت میں عرب بہت سے امور کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا تصور رکھتے تھے جن کو اللہ نے اپنے اس فرمان سے باطل کر دیا: "مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡ بَحِيۡرَةٍ" (المائدۃ ۱۰۳) اللہ نے کوئی بحیرہ نہیں بنایا۔

بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس نے پانچ بچے جنم دیے ہوں اور ان میں سے آخری نر ہو، اس صورت میں اونٹنی کا مالک اس کا کان پھاڑتا تھا اور اس کو چھوڑ دیتا تھا اور اس کے دودھ سے فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔

سائبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ کہ غلام کو اس کا آقا اس سے اور اس کے حقِ ولاء سے فائدہ اٹھائے بغیر چھوڑ دیتا تھا۔ دوسری قسم یہ کہ اونٹ کا مالک اونٹ کو اس غرض سے چھوڑ دیتا تھا کہ لوگ اس سے اپنی ضرورتیں پوری کریں۔ عرب اس بات کے عادی تھے کہ

جو مریض یا مسافر ہوتا تو وہ کہتا: اگر میں شفایاب ہو گیا یا میں اپنے سفر سے لوٹ آیا تو میری اونٹ سائبہ ہے۔ جب وہ واپس آتا یا اس کو شفا مل جاتی تو وہ اپنا اونٹ لوگوں کے لیے چھوڑ دیتا کہ جس کو اس اونٹ سے کوئی ضرورت ہو تو وہ پورا کرے، کوئی بھی اس اونٹ کی دیکھ ریکھ کرنے والا اور اس کو کھلانے والا نہیں ہوتا۔

وصیلہ کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ بکری کو سات بچے ہوتے جن میں دو دو مادہ بچے، اگر وہ دوسری مرتبہ مادہ اور نر کو جنتی تو وہ کہتے: مادہ نے اپنے بھائی کو ملا دیا۔ اس لیے وہ نر کو مادہ کی خاطر ذبح نہیں کرتے تھے اور ماں کا دودھ صرف مرد پیتے، عورتیں نہیں۔ دوسری قسم یہ کہ بکری کو جب نر بچہ ہوتا تو وہ اس کو اپنے معبودوں کے لیے ذبح کرتے۔ اگر مادہ بچہ ہوتا تو اپنے لیے رکھتے۔ یا مادہ اور نر دونوں ہوتے تو کہتے: مادہ نے اپنے بھائی کو ملا دیا، اس لیے وہ نر کو اپنے معبودوں کے نام پر ذبح نہیں کرتے۔ (دیکھا جائے "تفسیر ابن کثیر" ۲۱۰/۳)

حام اس سانڈھ کو کہتے ہیں جو کسی شخص کی اونٹنیوں میں دس سال یا اس سے زیادہ رہے تو اس کو آزاد کر دیا جاتا اور مالک کہتا: اس نے اپنی پیٹھ کی حفاظت کی۔ اس لیے وہ اس کے بعد اس کی پیٹھ سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اس سانڈھ کو کسی کے کنویں سے پانی پینے اور کسی کی بھی چراگاہ سے چرنے کی آزادی ہوتی۔

قضاءت کے آداب

قاضی کے آداب اور اس سے متعلق امور

(اس موضوع پر فقہائے شوافع میں سے بہت سے لوگوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابن القاص اور ابن أبی الدم، یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں)

اس باب میں ان آداب کا تذکرہ ہے جن کی رعایت رکھنا قاضی پر ضروری ہے۔

ادب اس امر کو کہتے ہیں جو شریعت میں مطلوب ہو۔

قضاء کے لغوی معنی کسی چیز کو مستحکم کرنے اور اس کو جاری کرنے کے ہیں۔

شریعت میں لوگوں کے دعووں اور مشکلات و مسائل کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حل کرنے کے ہیں۔

قاضی کے لیے لازم امور کے تذکرہ کے ساتھ اس سے متعلق آداب کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس کے پاس محررین اور باخبر و تجربہ کار مشیرین ہوں جن کی قاضی کو ضرورت پڑتی ہے۔

قضاءت کے مشروعیت کی دلیل آیاتِ قرآنی، احادیث نبویہ اور اجماعِ امت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: "وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ" (المائدۃ ۴۹) اور یہ کہ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کیجئے۔

اصحابِ سنن اور بیہقی وغیرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت کیا ہے: "قضاءت کی تین قسمیں ہیں، ایک قاضی جنت میں جائے گا اور دو قاضی جہنم میں ہوں گے"۔ (ابوداود: کتاب الأقضیۃ، باب فی القاضی یخطئ ۳۱۱۹، ترمذی: أبواب الأحکام عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القاضی ۱۲۸۱، ابن ماجہ: کتاب الأحکام، باب الحاکم یجتھد فیصیب الحق ۲۳۱۲) کیوں کہ جو قاضی حق کو جانتا ہے

اور اس کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ جنت میں ہے، اور جو قاضی حق کو جانے اور ظلم کرے اور حق کے مطابق عمل نہ کرے تو وہ جہنم میں ہوگا۔ اور جو قاضی نہ جانتے ہوئے فیصلہ کرے جب کہ اس پر حق کی تلاش ضروری ہے تاکہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ بھی جہنم میں ہے۔ اسی طرح قضاءت کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اجماعِ امت قطعی دلیل ہے۔

۔فیصلہ کرنے کے لیے مسجد میں نہ بیٹھنا مسنون ہے، تاکہ مسجد کو قیل وقال اور آواز بلند کرنے والوں کے جھگڑوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ("التھذیب" ۱۷۲/۷) اس کے باوجود اگر قاضی مسجد میں نماز کے لیے آئے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد دو مسلمان آئیں اور اپنے جھگڑے کو اس کے سامنے پیش کریں اور فیصلہ کرنے کی درخواست کریں اور یہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے تو جائز ہے۔

۔لوگوں سے چھپ کر فیصلہ کے لیے نہ بیٹھے

کسی حاجب کو مقرر کرنا مکروہ ہے جو لوگوں کو قاضی کے پاس آنے سے روکے، اگر بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے مقرر کرے تو مکروہ نہیں ہے، حاجب کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شخص کو اندر جانے دے اور دوسرے کو روک دے۔ صحیح حدیث میں ہے جس کو امام حاکم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو لوگوں کے امور میں سے کسی کا بھی ذمہ دار بن جائے اور وہ حاجب مقرر کرے تو اللہ اس کو قیامت کے دن اس کو روک دے گا"۔ (ابوداود: کتاب الخراج والإمارۃ والفیئ، باب فیما یلزم الإمام من أمر الرعیۃ والحجبۃ عنہ ۲۹۴۸، مستدرک حاکم، کتاب الأحکام ۷۰۹۰) یعنی اللہ اس کو اپنے حضور حاضری سے محروم کر دے گا۔

اس کا دل پرسکون ہو: اگر قاضی غیر فطری نفسیاتی یا اعصابی حالت میں ہو تو قضاءت کے لیے بیٹھنا اس کے لیے مکروہ ہے، مثلاً وہ غصہ، سخت بھوک، سخت پیاس یا سخت بیماری یا سخت خوف یا سخت خوشی کی حالت میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "کوئی حَکَم دو کے درمیان غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے"۔ (بخاری: کتاب الأحکام، باب ھل یقضی القاضی أو یفتی وھو غضبان ۷۱۵۸، مسلم: کتاب الأقضیۃ، باب کراھۃ قضاء القاضی وھو غضبان ۱۷۱۷، یہ روایت ابو بکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے ہے)

۔قاضی جنازہ میں شریک ہو، مریضوں کی عیادت کرے، حاجی کے آنے پر ملنے جائے اور سبھی ولیموں میں شرکت کرے یا سبھی ولیموں کو چھوڑ دے۔ان اعمال میں شریک ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ ان کی وجہ سے قضاءت کی ذمہ داری کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ آتی ہو، کیوں کہ قاضی قضاءت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے اس کے جو دوست اور رشتہ دار تھے اور وہ ان کی ملاقات کے لیے جاتا تھا، اس وجہ سے وہ اپنے گھر والوں اور دوستوں کی ملاقات کے لیے قاضی بننے کے بعد بھی جا سکتا ہے، ولیموں میں اس کی حاضری میں صاحب ولیمہ کا اکرام ہے اور ان سب کا مقصد ثواب حاصل کرنا ہے، اسی وجہ سے مستحب یہ ہے کہ یا تو سبھی ولیموں میں شرکت کرے یا کسی بھی ولیمہ میں نہ جائے۔(بغوی نے "التهذيب" میں اس کو ترجیح دی ہے ۷/ ۱۷۵)

قاضی دونوں فریق سے کہہ سکتا ہے: بولو، وہ دونوں کو اس مقصد سے خاموش کر سکتا ہے کہ ان دونوں سے کوئی ایک اپنی بات شروع کرے۔

۔جب مدعی جمع ہو جائیں تو عام طور پر پہلے آنے والے کو مقدم کیا جائے گا۔

اگر چند مدعی ایک ساتھ آئیں تو قاضی ان کے درمیان قرعہ اندازی کر سکتا ہے، جس کے نام قرعہ آئے گا اس کو اپنا دعوی پیش کرنے میں مقدم کیا جائے گا۔ عام طور پر مقدم کیا جاتا ہے، کیوں کہ قاضی مسافر کو مقیم پر مقدم کر سکتا ہے اور اسی طرح عورتوں کو مردوں پر مقدم کر سکتا ہے۔

۔پہلے آنے والے کو صرف ایک دعوی میں مقدم کیا جائے گا تاکہ ایک ہی شخص میں طویل وقت نہ گزر جائے اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچے، البتہ مرد یا عورت مسافر ہو تو اس کے دعوی کو مقدم کیا جائے گا چاہے دوسرے لوگوں کا نقصان ہو جائے۔(مکمل فائدہ کے لیے دیکھا جائے "كتاب أدب القضاء" ابن أبي الدم ص ۱۳٤)

اگر کوئی فریق زیادہ تیز زبان استعمال کرے تو قاضی اس کو روکے گا، اگر وہ دوبارہ ایسا ہی برتاؤ کرے تو اس کی تعزیر کرے گا۔

مثلاً کوئی مدعی اپنے جھگڑے میں مبالغہ کرے اور گواہوں پر جھوٹے ہونے کا الزام

لگائے تو اس صورت میں قاضی اس کو اس برتاؤ سے روکے گا، اگر وہ سرکشی، سخت کلامی اور گواہوں کے جھٹلانے کو جاری رکھے تو قاضی مناسب انداز میں اس کی تادیب کرے گا۔

۔مختلف رایوں کے سامنے آنے کی صورت میں قاضی کے لیے مناسب امانت دار علماء سے مشورہ کرنا سنت ہے، یہ فرمانِ الہی پر عمل کرتے ہوئے ہے جس میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ"۔ (۱۵۹- آل عمران) اور ان کے ساتھ امور میں مشورہ کیجئے۔

اگر وہ مجتہد ہے تو کسی دوسرے کی تقلید نہ کرے، کیوں کہ مجتہد کسی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا ہے۔

۔قاضی اللہ کی سزا کے علاوہ میں اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس کے لیے چار شرطیں ہیں:

۱۔قاضی مجتہد ہو (ابن ملقن نے "عجالة المحتاج" میں مجتہد کی شرطیں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے ۴/۱۷۹۸-۱۷۹۹) برخلاف ضرورت کے قاضی کے جو آج قضاءت کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں، جو اپنے علم اور اطلاع کے مطابق کسی مسئلہ میں فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں۔

یہ فیصلہ الہی سزا یعنی حد یا تعزیر نہ ہو، کیوں کہ الہی سزاؤں کی بنیاد ستر پوشی اور چھپانے پر ہے۔

اسی طرح دلیل اس کے علم واطلاع کے خلاف نہ ہو۔

اور وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنے میں اپنی دلیل کی وضاحت کرے۔

اگر کسی بھی مسئلہ میں قاضی کے علم اور اطلاع کے ساتھ بینہ کا ٹکراؤ ہو جائے تو وہ دوسرے طریقے سے حقیقت کو تلاش کر سکتا ہے تاکہ حقیقت اس کے سامنے واضح ہو جائے، وہ نہ صرف اپنے علم پر فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ صرف بینہ پر۔

۔اگر اپنے یا دوسرے کے فیصلہ میں اس کے سامنے غلطی ظاہر ہو جائے تو وہ اس فیصلہ کو رد کر سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی کسی ایسے فیصلہ کو رد کر سکتا ہے جس کی غلطی اس کے سامنے ظاہر ہو، چاہے یہ فیصلہ اس کا ہو یا کسی دوسرے قاضی کا، مثلاً یہ فیصلہ غیر عادل گواہوں کی بنیاد پر کیا گیا ہو

یا اس میں قرآن وحدیث کی مخالفت ہو، یا قاضی مجتہد نہ ہو اور وہ اپنے فیصلہ میں اپنے مسلک کے امام کی رائے کی مخالفت کرے، یا اس کا فیصلہ علماء کے اجماع کے مخالف ہو یا قیاس جلی کے خلاف ہو، مثلاً اللہ عزوجل اپنی کتاب قرآن مجید میں والدین کے تئیں بچوں کی ذمہ داری کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ" (الاسری ۲۳) اس آیت کے مطابق قیاس جلی یہ ہے کہ اس حکم کے مطابق والدین کو قول وعمل کے ذریعہ کسی بھی طرح کی تکلیف دینا جائز نہیں ہے۔ متساوی قیاس یہ ہے کہ یتیم کے مال کو جلانے کے حرام ہونے میں یتیم کا مال کھانے پر قیاس کیا جائے، قیاس ادنی یہ ہے کہ لوگوں کے لیے غذا ہونے میں بھٹے کو گیہوں پر قیاس کیا جائے، کیوں کہ گیہوں روٹی بنانے میں وسیع پیمانہ پر استعمال ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ قاضی کے سامنے اپنے فیصلہ کی غلطی واضح ہو جائے تو اس پر یہ فیصلہ رد کرنا ضروری ہے۔ ("عجالة المحتاج" ابن ملقن)

۔اگر فیصلہ کی غلطی کسی دوسرے اجتہاد کی وجہ سے ظاہر ہو جس کے مطابق اس نے فیصلہ کیا ہو یعنی مستقبل میں دوسرے اجتہاد سے فیصلہ کیا ہو، اس صورت میں دوسرا اجتہاد پہلے اجتہاد کو ختم نہیں کرے گا، کیوں کہ اجتہاد کے ذریعہ اجتہاد نہیں ٹوٹتا ہے۔

۔قاضی جرح وتعدیل یعنی کسی کے غیر ثقہ ہونے یا ثقہ ہونے کی بات دو عادل مردوں سے ہی قبول کرے گا، ان کے علاوہ کسی دوسرے سے نہیں، اسی طرح ترجمہ بھی۔

۔اگر قاضی کو گواہوں کی باتوں میں شک ہو جائے تو ان میں سے ہر ایک کو تنہائی میں پوچھے گا، اگر ان کی باتوں میں اختلاف ہو جائے تو قاضی کو ان کی گواہی رد کرنے کا اختیار ہے، یہ قضاءت کے معاملہ میں مکمل طور پر ثبوت میں سے ہے۔

۔کسی کو ثقہ قرار دینے میں صرف یہی کہنا کافی ہے: یہ عادل ہے۔ یہ نہ کہے تو بھی فرق نہیں پڑتا: میرے نزدیک یا میرے لیے۔

۔دوسرے کے عادل ہونے کی گواہی دینے میں شرط یہ ہے کہ گواہ کو اس شخص کی اندرونی معلومات صحبت یا پڑوس میں رہنے یا اس کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آنے کی وجہ سے معلوم ہو۔ ("روضۃ الطالبین" ۱۱/۱۷۰)

۔اندرونی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ اس شخص کے ساتھ گفتگو کی جائے، اس کے اخلاق اور پڑوسیوں کے ساتھ سلوک وبرتاؤ کو معلوم کیا جائے، مقصد یہ ہے کہ صرف ظاہری معرفت اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ کسی کو ثقہ قرار دینے کی گواہی صحیح بن جائے۔

۔ثقہ قرار دینے والے، قاضی کے کاتب اور اس کے مشیروں کا تعدیل اور تحریر اور مشورہ میں پیش آنے والے امور سے واقف رہنا ضروری ہے، قاضی ان میں سے کسی کو گواہوں کے پڑوسیوں سے معلومات کرنے اور ان کے حالات کی توثیق کرنے کے لیے بھیج سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ سب گواہوں کو ثقہ قرار دینے میں تحقیق کی کیفیت کو جانتے ہوں تاکہ گواہوں کے عادل ہونے کی تاکید ہو اور وہ قاضی کی مجلس کے رجسٹر میں لکھنے کا بھی تجربہ رکھتے ہوں۔

۔صندوق یا الماری یا فائلوں کو مہر بند کیا جائے جس میں قضیوں کے ضروری کاغذات اور وثائق کو اور مجلس قضاء کے رجسٹر کو محفوظ کیا جاتا ہے، اس کا مقصد ان دستاویزات کو محفوظ رکھنا اور اس کی امانت داری کی ضمانت حاصل کرنا ہے تاکہ ضرورت کے وقت یہ چیزیں موجود رہیں۔

۔مہر دیکھنے کے بعد ہی اس کو قاضی کھولے، تاکہ اس کا یقین ہو کہ کسی نے قضیہ کے کاغذات اور اس کی دستاویزات کے ساتھ کھلواڑ نہیں کیا ہے۔

گواہی سننے یا فیصلہ کے تعلق سے قاضی کسی دوسرے قاضی کا خط اس وقت قبول کرے گا جب دو گواہ اس کے بارے میں قاضی کے پاس گواہی دیں۔ تاکہ یہ بات موکد ہو جائے کہ جو خط دوسرے قاضی نے اس کے پاس بھیجا ہے اس کی بنیاد دو عادل گواہوں کی گواہی پر ہے، کیوں کہ خط جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی لوگوں کے حقوق کی حفاظت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لے اور اپنے پاس پہنچنے والی معلومات کے یقین کی حد تک پہنچنے پر ہی فیصلہ کرے اور اپنے معاونین کے انتخاب میں بڑی باریکی سے کام لے تاکہ وہ اپنے کام میں علماء اور تجربہ کار لوگوں کا انتخاب کرے، چاہے وہ کاتب ہو یا ثقہ یا غیر ثقہ کی تعیین کرنے والا یا مشیر۔

تقسیم کے مسائل

(تفصیلات کے لیے دیکھئے: ''الوسیط'' غزالی ۷/۲۳۴، ''التہذیب'' بغوی ۷/۲۰۶، ''روضۃ الطالبین'' بحاشیۃ البلقینی ۹/۳۵۵، ''أدب القضاء'' ابن ابی الدم ۵۲۵)

یہ فصل تقسیم یعنی بعض حصوں کو بعض حصوں سے الگ کرنے کے بیان میں ہے، یعنی اصحاب حق کے مطابق حصوں کی تقسیم سے متعلق ہے۔

تقسیم کی تین قسمیں ہیں: تقسیم افراز، تقسیم متشابہات اور تقسیم تعدیل۔

''تقسیم افراز'' کو ''تقسیم اجزاء'' بھی کہا جاتا ہے مثلاً تین کمروں پر مشتمل گھر کو تین لوگوں میں تقسیم کرنا۔

تقسیم متشابہات: مثلاً غلوں کی تقسیم مثلاً گیہوں اور جو وغیرہ، اسی طرح درہم اور مثلی چیزوں کی تقسیم۔

تقسیم تعدیل: یہ اس چیز کی تقسیم ہے جس کے اجزاء قیمت کے اعتبار سے مساوی اور برابر نہ ہوں مثلاً زمین کے کسی حصہ کی تقسیم جس کے ایک جزء میں اچھی پیداوار ہوتی ہو اور دوسرے حصہ میں کم پیداوار ہوتی ہو، بعض حصہ میں نمکینیت پائی جاتی ہو جہاں کھیتی نہ اگتی ہو، اس صورت میں ہر جزء کی الگ قیمت طے کی جائے گی اور جو زیادہ قیمت والا حصہ لے گا وہ باقی مستحقین کو قیمت کا فرق ادا کرے گا۔

تقسیم کی مشروعیت کی دلیل قرآن، حدیث اور اجماع ہے، اللہ تبارک تعالی کا فرمان ہے: ''وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوْفاً'' (نساء ۸) (اور جب تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو ان کو اس میں سے کھلاؤ اور ان سے بھلی بات کہو) اس حکم الہی میں رشتے داروں کے آپسی روابط کو مضبوط کرنے اور قریبی رشتے داروں کے درمیان تعلقات کو مستحکم

کرنے کی تاکید ہے، اس وجہ سے اللہ تبارک وتعالی وارثین سے فرما رہا ہے کہ وہ وراثت تقسیم کرتے وقت اس وراثت میں سے غیر وارثین رشتے داروں کو بھی کچھ دیں تاکہ رشتے داروں کے درمیان تعلقات باقی اور جاری رہیں، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ سبھی وارثین بالغ ہوں، البتہ اگر وارثین نابالغ ہیں تو ذوی الارحام سے بہتر بات کرنا کافی ہے، کیوں کہ کم عمر وارثین کے حصوں میں کوئی بھی تصرف نہیں کر سکتا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مالِ غنیمت کو اس کے مستحقین میں تقسیم کرتے تھے، اسی طرح وراثت کی تقسیم اور مالِ مشترک کی ان کے مالکوں کے درمیان تقسیم پر امت کا اجماع ہے۔ (دیکھا جائے: صحیح بخاری: کتاب الجہاد، باب سہم الفرس ۶/۵۱، صحیح مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب کیفیۃ قسمۃ الغنیمۃ الحاضرین ۱۷۶۲، یہ روایت ابن عمرؓ سے ہے)

تقسیم کرنے والے کی اجرت: جس کو امام مقرر کرے تو اس کی اجرت بیت المال سے دی جائے گی، پھر شریکوں پر ان کے حصوں کے بقدر اجرت واجب ہوتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم جس کو مال تقسیم کرنے کی ذمے داری دے تو اس کی اجرت اس کے کام کے مطابق بیت المال سے دی جائے گی، اگر یہ میسر نہ ہو تو اس کی اجرت وہ شریک دیں گے جن کے درمیان مال تقسیم کیا جا رہا ہے، وہ اپنے حصوں کے مطابق اجرت آپس میں تقسیم کریں گے، اگر تقسیم میں ایک کو نصف اور دوسرے کو ایک تہائی اور تیسرے کو چھٹا حصہ ملتا ہے تو اجرت چھ حصوں میں تقسیم کی جائے گی جن میں سے تین حصے کی ذمے داری آدھا پانے والے کی ہے اور دو حصے ایک تہائی پانے والا اور ایک حصہ چھٹا حصہ پانے والے پر ہوگا۔ (تمام شریکوں پر اجرت اس وقت ہوگی جب وہ سب تقسیم کرنے کا مطالبہ کریں، ورنہ کہا گیا ہے کہ صرف مطالبہ کرنے والے کی ذمے تقسیم کی اجرت ہے۔ ''مغنی المحتاج'' ۶/۳۷۶)

کیوں کہ تقسیم کی اجرت ملکیت کے مصارف میں شمار کی جاتی ہے۔

یہ طریقہ تقسیم تعدیل کے علاوہ میں اپنایا جائے گا، البتہ تقسیم تعدیل میں دوسرا طریقہ ہے؛ اگر کوئی زمین تقسیم کی جائے جس کے آدھے حصے کی قیمت دوسرے آدھے سے زیادہ

ہوتو جو زیادہ قیمت والے حصہ کو لے گا تو اس کے ذمے تقسیم کرنے والے کی دوتہائی اجرت
کی ادائیگی ہے اور ایک تہائی اجرت کی ادائیگی دوسری کم قیمت والی زمین لینے والے کے
ذمہ ہے، یہ تقسیم اس وقت کی جائے گی جب تقسیم کرنے والے کی اجرت پر ان کے درمیان
اتفاق نہ ہو، اگر ان کے درمیان تقسیم سے پہلے اجرت پر اتفاق ہو تو وہ اس اتفاق کے مطابق
عمل کر سکتے ہیں، چاہے اجرت کسی کو زیادہ دینی پڑے اور کسی کو کم۔

اگر ایک کے علاوہ سبھی تقسیم پر متفق ہو جائیں اور مطالبہ کرنے والوں کو اس سے فائدہ
ہو رہا ہو تو اجباری تقسیم کی جائے گی: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سبھی شریک تقسیم پر متفق ہوں اور
صرف ایک شخص اس سے انکار کر رہا ہو اور تقسیم کا مطالبہ کرنے والے اس تقسیم سے فائدہ
اٹھانے والے ہیں اور جو تقسیم کا مطالبہ نہ کرے بلکہ اس کا انکار کرے، وہ اس تقسیم سے فائدہ
اٹھانے والا نہ ہو تو اس صورت میں وہ اجباری تقسیم کے اصول پر عمل کر سکتے ہیں اور انکار کرنے
والے شریک کو تقسیم پر مجبور کیا جائے گا۔

مثلاً کسی شخص کی گھر میں دس میں سے نو حصے کی ملکیت ہو اور اس کا ایک شریک ہو جو
دسویں حصہ کا مالک ہو، نو حصوں کا مالک تقسیم کرنا چاہتا ہو تاکہ وہ اپنے حصے سے جس طرح
چاہے فائدہ اٹھائے، جب کہ دسویں حصہ کا مالک اس سے انکار کر رہا ہو، اس صورت میں
دس میں سے نو حصوں کا مالک اپنے شریک یعنی ایک حصہ کے مالک کو تقسیم قبول کرنے
پر مجبور کر سکتا ہے، کیوں کہ پہلا معذور ہے اور اس کا شریک تقسیم کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔
اگر اس کے برعکس ہو یعنی دسویں حصہ کا مالک تقسیم کرنا چاہتا ہو اور نو حصوں کا مالک تقسیم نہ
چاہتا ہو تو یہ تقسیم مکمل نہیں ہوگی کیوں کہ دسویں حصہ کا مالک پارٹنر اس تقسیم کے ذریعہ اپنے
شریک کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

۔قرعہ کے ذریعہ تقسیم کی جائے گی: اس صورت میں ناپی جانے والی چیز میں ناپ کر،
وزن کی جانے والی چیزوں میں وزن کر کے اور گنی جانے والی چیزوں میں گن کر حصوں
میں سب سے کم حصہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، تقسیم کرنے والا ایک ہی حصہ الگ کرنے

سے باز رہے گا کہ چھٹے حصہ والے سے ابتدا نہ کرے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرعہ اندازی اس وقت کی جائے گی جب پارٹنرس راضی نہ ہوں
اور تقسیم کرنے والا غلوں کی تقسیم میں ناپ کو استعمال کرے گا، اور سونے چاندی وغیرہ
معادن کی تقسیم میں وزن کو، زمین اور کپڑے وغیرہ، مسافت دیکھی جانے والی چیزوں
میں مسافت کو اور تعداد میں دی جانے والی چیزوں مثلاً پھل میں تعداد کو استعمال کرے گا،
اور سب سے کم حصے کو تقسیم کے لیے بنیاد بنایا جائے گا، اگر حصے نصف، ایک تہائی اور چھٹا
حصہ ہوں تو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، اگر حصے دوتہائی، ایک چوتھائی اور چھٹا ہو تو
۱۲ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، ان میں دوتہائی حصہ والا آٹھ حصے لے گا اور ایک چوتھائی
والا تین اور چھٹے حصہ والا دو لے گا۔

جن کے درمیان قرعہ اندازی ہو رہی ہو تو چھوٹی پرچیوں پر نام لکھے جائیں گے
اور ایک برتن میں ان کو ڈال دیا جائے گا اور بچے یا ان پڑھ شخص سے کوئی پرچی نکالنے کے
لیے کہا جائے گا، جس کے نام قرعہ نکلے گا وہ اپنا حصہ لے گا۔ اگر شریک تقسیم کرنے والے کی
تقسیم پر راضی ہوں تو قرعہ کی ضرورت نہیں ہے اور کسی بھی شریک کو نقصان پہنچانے سے
تقسیم کرنے والے کو باز رہنا ضروری ہے۔

۔اگر کوئی اجباری تقسیم میں یا رضامندی کی تقسیم میں غلطی کا دعوی کرے اور یہ تقسیمِ
اجزاء ہو تو مدعی علیہ کی بات قسم لے کر مانی جائے گی۔

۔کسی کو گھر کا نچلا حصہ لینے اور دوسرے کو اوپر والا حصہ لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر
دو منزلہ عمارت کی تقسیم ہو رہی ہو تو ایک کو نچلی منزل لینے پر اس لیے مجبور نہیں کیا جائے گا کہ
دوسرا اوپر والی منزل لے، بلکہ رضامندی سے یا قرعہ اندازی کے ذریعہ تقسیم کرنا ضروری
ہے۔ (''التہذیب'' بغوی ۷/۲۰۹) اس صورت میں گھر کی چھت دونوں کی مشترکہ ہوگی اگر اس
بارے میں تقسیم کے وقت کوئی اتفاق نہ ہو، اگر کوئی چھت سے دوسرے کے حق میں دست
بردار ہو جائے تو صحیح ہے۔

۔اگر غلطی کے سلسلہ میں مدعی بینہ پیش کرے یا مدعی علیہ کے قسم کھانے سے انکار کی صورت میں قسم کھائے تو یہ تقسیم کالعدم ہوجائے گی اور تقسیم نہ ہونے کی طرح ہوجائے گا پھر دوبارہ تقسیم کرنا ضروری ہے،جس طرح کسی بھی دعوی میں فیصلہ ہونے اوراس کے تعلق سے صادر ہونے والے فیصلہ میں غلطی ہونا ثابت ہوجاتا ہے،اس صادر ہونے والے فیصلہ کی وجہ سے پہلے والاحکم کالعدم ہوجاتا ہےاور نئے سرے سے دعوی اور قضیہ کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

یہ بات معروف ہے کہ اجزاء کی تقسیم تقسیم افراز ہوتی ہے،لیکن جب اجزاء کے درمیان مماثلت نہیں پائی جاتی ہے بلکہ ہر جزء کے درمیان قیمت میں فرق پایا جاتا ہے تو یہ تقسیم،تقسیم افراز نہیں ہوتی ہے۔

اگر تقسیم کے وقت سبھی شریک آپس میں راضی ہوں اور زمین کی نوعیت کے اختلاف کی وجہ سے جس کو وہ تقسیم کرنا چاہتے ہوں کسی شریک کو زمین کا بڑا حصہ دینے پر متفق ہوجائیں اور دوسرے کو زمین کا چھوٹا حصہ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ یہ شخص زمین کا جو حصہ لے رہا ہے وہ دوسرے حصہ سے افضل ہے، اس اتفاق میں خرید وفروخت کی چھاپ ہے اوراس میں کوئی غلطی بھی نہیں ہے۔

جب تقسیم کسی شریک کو ۶۰ درہم قیمت والی زمین دینے اور دوسرے کو ۴۰ درہم والی زمین دینے کی بنیاد پر ہو تو تقسیم مردود ہوگی۔

اگر دونوں شریک اس بات پر راضی ہوجائیں کہ پہلا شریک دوسرے کو اس کے حصے کے علاوہ ۱۰ درہم اضافی دے گا تو یہ اتفاق بیع کی ایک قسم ہوگی اوراس میں کوئی غلطی بھی نہیں ہے یا مکمل ہونے والی تقسیم کالعدم بھی نہیں ہوئی ہے۔

۔مثلاً میت کے ذمے قرض ثابت ہوجائے: مثلاً کسی میت کا مال تقسیم کیا جائے، تقسیم کے بعد معلوم ہوجائے کہ میت قرض دار ہے، اس وقت تقسیم باطل ہوجائے گی، کیوں کہ قرض کی ادائیگی سے پہلے وراثت کی تقسیم باطل تصرف ہے۔(اس بارے میں مسلک میں اختلاف ہے جس کو بغوی نے ''التہذیب'' میں بیان کیا ہے ۷/۲۱۵۔۲۱۶)

۔اگر تقسیم کردہ مال میں سے کسی مال کا مستحق ہو اور وہ چیز متعین ہو، مشترک نہ ہو تو یہ تقسیم باطل ہوجاتی ہے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مال کی تقسیم کے بعد واضح ہوجائے کہ جس مال کی تقسیم ہوئی ہے اس کا ایک حصہ شریکوں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت ہے اوراس متعین حصہ کو اس کے مالک کے پاس لوٹانے کی صورت میں شریکوں کے درمیان تقسیم عادلانہ نہیں رہتی ہے تو یہ تقسیم باطل ہوجاتی ہے۔

مثلاً ۲۰ بکرے زید اور عمرو کے درمیان دس دس تقسیم ہوجائیں، تقسیم کے بعد معلوم ہوجائے کہ عمرو کو ملی ہوئی دس بکریوں میں سے ایک بکری بکر کی ہے اور یہ ان دونوں کے مورث کی ملکیت نہیں ہے اور بکر عمرو کی بکریوں میں سے اپنی بکری واپس لے،اس صورت میں عمرو کی بکریوں کی تعداد گھٹ کر ۹ ہوجاتی ہے اور یہ تقسیم غیر عادلانہ ہوجاتی ہے، اس طرح یہ تقسیم باطل ہوجاتی ہےاوران دونوں کے درمیان نئے سرے سے تقسیم کی جائے گی۔

اگر زید اور عمرو آپس میں ایک زمین کو تقسیم کرلیں اوراس کے بعد معلوم ہوجائے کہ عمرو کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ اور زید کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ بکر کا ہے تو بکر کے ان دونوں حصوں کی تقسیم باطل ہوجائے گی اور تقسیم کا باقی حصہ اس معنی میں صحیح ہوجائے گا کہ بکر کو عمرو اور زید دونوں کے حصوں میں سے پانچواں حصہ ملا اور باقی تقسیم اپنی حالت میں باقی رہے گی۔(''التہذیب'' ۷/۲۱۵ ''عجالۃ المحتاج'' ۴/۱۸۲۶)

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ عمرو کے حصہ میں سے ایک بکری بکر کی ہو اور زید کے حصوں میں سے ایک بکری بھی بکر کی ہو تو بکر ان دونوں سے ایک ایک بکری لے گا اوران دونوں میں سے ہر ایک کے پاس نو بکریاں باقی رہے گی،اس طرح تقسیم کالعدم نہیں ہوتی ہے۔

۔ایک ہی چیز کے کئی اصناف ہوں تو ان کو اجباری تقسیم نہیں کیا جائے گا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی ایسی چیز کے اصناف میں کمی بیشی ہو جس کو تقسیم کیا جاتا ہے تو مجبور کر کے اس کی تقسیم مکمل نہیں ہوتی ہے، مثلاً اگر ہم تین بکریوں کو تقسیم کرنا چاہیں

جن میں سے ایک پہاڑی، دوسری صومالی اور تیسری ہندوستانی ہو اور تین بھائی وارث بنتے ہوں تو کسی ایک بھائی کو کم قیمت والی بکری لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ ان تینوں بکریوں کی قیمت مساوی نہیں ہے، اس صورت میں ہر بکری کی قیمت مقرر کی جائے گی اور جو زیادہ قیمت والی بکری لے گا وہ باقی بھائیوں کو قیمت کا فرق ادا کرے گا۔

یہی حکم اس صورت میں بھی ہے جب تین قسم کے کپڑے تقسیم کیے جارہے ہوں جن میں سے ایک ریشم کا کپڑا ہو، دوسرا کاٹن اور تیسرا ساٹن تو اس صورت میں کسی ایک شریک کو متعین کپڑا لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ تینوں کپڑوں کی قیمت لگائی جائے گی، اس کے بعد تقسیم کیا جائے گا، جو زیادہ قیمت کا کپڑا لے گا، وہ باقی شریکوں کو قیمت کا فرق ادا کرے گا۔

۔ایک ہی صنف کی دو چیزوں میں سے کسی کو لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا مثلاً دو گھر ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک گھر ہو جائے:

دو مشابہ چیزوں کی تقسیم دو پارٹنروں میں کافی نہیں ہے کہ ان سے کہا جائے: ہر ایک آدھا آدھا لے۔ مثلاً اگر دو گھروں کی تقسیم ہو اور یہ دو بھائیوں کے درمیان ہو رہی ہو تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک دو گھروں میں سے ایک گھر لے، کیوں کہ ہر گھر کا جائے وقوع اور اس گھر اور بازار کے درمیان کی مسافت سے اس کی قیمت متعین ہوتی ہے، اس صورت میں ہر ایک کی قیمت لگانا ضروری ہے تاکہ جو زیادہ قیمت والا گھر لے تو وہ اپنے شریک کو قیمت کا فرق ادا کرے۔

البتہ ایک ہی قسم کی منقولہ چیزوں میں اجباری تقسیم کی جائے گی جن میں کوئی اختلاف نہ پایا جاتا ہو، اسی طرح دو ایک ہی سائز کی دکانیں ملی ہوئی ہوں تو ان کی بھی اجباری تقسیم کی جاسکتی ہے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر منقولہ مال میں ایک ہی قسم کی دو چیزیں ہوں اور ان دونوں کی قیمت میں کوئی فرق نہ ہو مثلاً ایک ہی قسم کے تین کپڑوں یا ملی ہوئی تین دکانوں کو تقسیم کیا جارہا ہو تو تین بھائیوں کے درمیان اجباری تقسیم کی جائے گی، کیوں کہ دکانیں مساحت میں اور جائے وقوع کے اعتبار سے یکساں ہیں اور اجباری تقسیم میں یہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

شہادات

(گواہی کے احکام)

''**شہادۃ**'' کے معنی حاضر ہونے کے ہیں۔

اس کے لغوی معنی مخصوص لفظ سے خبر دینے کے ہیں جس کی ابتدا ''میں گواہی دیتا ہوں'' کے جملہ سے ہوتی ہے۔

گواہی کے مشروع ہونے کی دلیل قرآن، حدیث اور اجماع امت ہے، قرآن کریم میں فرمان الٰہی ہے: ''وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ'' (بقرہ ۲۸۳) (اور گواہی مت چھپاؤ) یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے: ''وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ'' (۲۸۲ بقرہ) (اور جب تم خرید و فروخت کرو تو گواہ بناؤ) صحیحین کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارے لیے بس تمھارے دو گواہ ہیں یا اس کی قسم ہے''۔ (بخاری: کتاب الشہادات، باب الیمین علی المدعی علیہ فی الأموال والھدود ۲۵۴۶، مسلم: کتاب الإیمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرۃ بالنار ۲۲۳) اسی طرح شہادت و گواہی پر امت کا اجماع ہے۔

۔اس کے ارکان پانچ ہیں: گواہی دینے والا، جس کے خلاف گواہی دی جاتی ہے (مشہود علیہ) جس کے حق میں گواہی دی جاتی ہے یعنی مشہود لہ، جس بات کی گواہی دی جاتی ہے یعنی مشہود بہ اور صیغہ۔

۔گواہی قبول کیے جانے کے اعتبار سے پانچ قسموں میں منقسم ہے۔ (''روضۃ الطالبین'' ۲۵۲/۱۱ ''عجالۃ المحتاج'' ۱۸۳۶/۴)

۱۔ایک گواہ؛ یہ رمضان کا چاند دیکھنے میں ہوتی ہے، رمضان کا چاند دیکھنے میں صرف

ایک شخص کی گواہی کافی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جس کو ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کو ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''میں نے نبی ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزے رکھنا کا حکم دیا''۔(ابن حبان: کتاب الصوم، باب رؤیۃ الھلال، ذکر الخبر المدحض قول من زعم أن ھذا الخبر تفرد بہ ۳۵۰۶، ابوداود: کتاب الصوم، باب فی شھادۃ الواحد علی رؤیۃ ھلال رمضان ۲۰۰۸)

مقام عرفہ میں کھڑے ہونے کے دن کی تعیین کرنے کے لیے ذی الحجہ کا چاند دیکھنے میں ایک گواہ کافی ہے، حج کا احرام باندھنا صحیح ہونے کے لیے شوال کا چاند دیکھنے میں ایک گواہ کافی ہے، کھجور اور انگور میں فرض زکوۃ کی تعیین کے لیے ان کے زکوۃ کے نصاب کا اندازہ لگانے میں ایک ماہر شخص کافی ہے، قسامہ میں قتل ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ایک گواہ کافی ہے؛ ان تمام صورتوں میں ایک گواہ کافی ہے۔

۲۔مال میں ایک گواہ اور ایک قسم۔ گواہی کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ایک گواہ اور مدعی کی طرف سے مال میں حق ثابت کرنے کے لیے ایک قسم ضروری ہوتی ہے اور ہر اس چیز میں جس کو مال میں شمار کیا جاتا ہو، مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک گواہ اور ایک قسم پر فیصلہ کیا۔(مسلم: کتاب الأقضیۃ، باب القضاء بالیمین والشاھد ۳۳۱۶، ابوداود: کتاب الأقضیۃ، باب القضاء بالیمین والشاھد ۳۶۰۸، یہ روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) شافعی نے اضافہ کیا ہے کہ مالوں میں۔ اس بنیاد پر خرید وفروخت، حوالہ، اقالہ یعنی خرید وفروخت سے رجوع، فسخ، ضمانت، خیار، مدت، شفعہ میں اپنا حق ثابت کرنے کے لیے اور وطی شبہ میں مہر ثابت کرنے کے لیے ایک گواہ اور ایک قسم مدعی پر ضروری ہے۔

۳۔ایک گواہ اور دو عورتیں؛ یہ مال میں اور ان چیزوں میں ہوتا ہے جس کو عام طور پر مرد نہیں دیکھتے ہیں مثلاً عورت کا پوشیدہ عیب، پردہ بکارت، ولادت اور حیض، کیوں کہ یہ فرمانِ الٰہی عام ہے: ''فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ'' (بقرہ ۲۸۲) (اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں) خفیہ عیب باندی کے لیے گھٹنے اور ناف کے درمیان کا عیب ہے اور

آزاد عورت میں ہتھلیاں اور چہرے کو چھوڑ کے پورے جسم کے کسی حصہ میں پایا جانے والا عیب ہے۔(''عجالۃ المحتاج'' ۱۸۳۸/۴) یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ عیب قمیص اور لنگی کے پیچھے ہو، اگر عورت میں برص کا عیب ہو تو طبیب اس کو دیکھ سکتا ہے مثلاً جسم کے کسی حصہ پر عیب ہو یا فرج یعنی اگلی شرمگاہ میں زخم ہو۔ عورتوں کے مخصوص مسائل میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی گواہی پر اطمینان کیا جا سکتا ہے۔

۴۔زنا اور اس کے معنی یعنی لواطت وغیرہ کے علاوہ دوسرے امور میں دو گواہ، کیوں کہ یہ فرمان الٰہی عام ہے: ''وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ'' (البقرۃ: ۲۸۲) (اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ) زنا اور اس کے معنی یعنی لواطت اور جانور کے ساتھ جماع کرنے کے علاوہ میں کا مطلب یہ ہے کہ ان امور کے ثابت ہونے میں چار گواہوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۵۔دو گواہ اور ایک قسم: ان صورتوں میں جن کا تذکرہ قسم کے باب میں ہوا ہے مثلاً میت کے خلاف دعوی کیا جائے، غیر حاضر شخص کے خلاف دعوی کیا جائے یا باقی سات حالتوں میں جن کا تذکرہ قسم کے باب میں ہوا ہے۔

۶۔چار عورتیں؛ ان معاملات میں جن کو عام طور پر مرد نہیں دیکھتے ہیں، اس کی مثالیں گزر چکی ہیں مثلاً حمل، ولادت، پردہ بکارت اور حیض سے متعلق گواہی، ان مسائل میں ایک مرد اور دو عورتوں کی یا چار عورتوں کی گواہی قبول کی جاتی ہے۔ ہم نے ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی میں واضح کر دیا ہے کہ مرد کا طبیب ہونا ضروری ہے تاکہ وہ عورت کے مریض ہونے یا اس کے لیے علاج کی ضرورت ہونے کی گواہی دے۔ ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ زہریؒ نے کہا: ''یہ سنت ہے کہ عورتوں کی گواہی ان امور میں جائز ہے جن سے ان کے علاوہ دوسروں کا واقف ہونا ممکن نہ ہو مثلاً عورتوں کی ولادت اور ان کے عیوب''۔(مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب البیوع والاقضیۃ، ما تجوز فیہ شھادۃ النساء ۲۰۲۷۲) اس پر اس معنی کی چیزوں مثلاً پردہ بکارت، حیض اور حمل کو قیاس کیا جائے گا۔

۷۔زنا کی گواہی میں چار مرد گواہ ضروری ہوتے ہیں ،یہی حکم لواطت ، مادہ جانور کے ساتھ کسی مرد کے جماع کرنے اور مردہ عورت کے ساتھ جماع کرنے کی گواہی میں بھی ہے، اس گناہ کے سخت ہونے اوراس کی سزا کے بھی سخت ہونے کی وجہ سے اس کے ثابت کرنے میں بھی سختی کی گئی ہے،اس کی سزا شادی شدہ ہونے کی صورت میں سنگ ساری ہے ،علماء کا خیال ہے کہ اس گواہی میں سختی کی حکمت یہ ہے کہ کوئی بھی اس گناہ کی گواہی نہ دے، کیوں کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے گناہوں کو چھپانا اورستر پوشی کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ گواہوں کے لیے یہ گواہی دینا ضروری ہے کہ اس شخص نے ایسی عورت کی اگلی شرمگاہ میں اپنا آلہ تناسل داخل کیا ہے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے، یہ بہت ہی سخت معاملہ ہے، چار گواہوں کی شرط ہونے کی دلیل یہ فرمان الہی ہے:"وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ" (نور ۴)(اور جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ نہیں لاتے)اس بنیاد پر شادی شدہ زانی اور غیر شادی شدہ زانی پر اس وقت حد نافذ کی جائے گی جب چار گواہ گواہی دیں۔

۔اگر یہ گواہ فیصلہ سنائے جانے سے پہلے اپنی گواہی سے رجوع کرلیں تو حاکم اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا۔یعنی اگر چار گواہ کسی آدمی کے خلاف حاکم کے سامنے گواہی دیں کہ اس نے زنا کیا ہے اور حاکم کی طرف سے زانی کے خلاف فیصلہ سنائے جانے سے پہلے گواہ رجوع کرلیں اور مکر جائیں، وہ بیان کریں کہ انہوں نے اپنی گواہی میں جھوٹ کہا ہے تو حاکم پر ضروری ہے کہ وہ زانی کے متعلق سزا سنانے سے باز رہے، کیوں کہ اس کو معلوم نہیں ہے کہ گواہ نے پہلی مرتبہ میں جھوٹ بولا ہے یا دوسری مرتبہ میں۔

اگر فیصلہ کیے جانے اور حد نافذ کیے جانے کے بعد رجوع کریں تو طلاقِ بائن، آزاد کرنے اور مال، حرام کرنے والی رضاعت ،لعان ،عیب کی وجہ سے فسخ اور قتل میں یہ لوگ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی گئی ہو) کو تاوان دیں گے، مثلاً وہ کہیں :ہم سے اپنی گواہی میں غلطی ہوئی ؛ کیوں کہ ان لوگوں نے اس شخص کا حق ضائع کردیا ہے۔

اگر گواہ حاکم کے فیصلہ اوراپنے حکم کو نافذ کرنے کے بعد رجوع کریں تو اس صورت میں گواہ

تاوان دیں گے، جب وہ گواہی دیں کہ زید نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے، پھر زید اور اس کی بیوی کے درمیان علحیدگی کی جائے ،اس صورت میں گواہوں پر ضروری ہے کہ وہ زید کو اس کی طلاق شدہ بیوی کا مہر مثل دیں۔جب وہ گواہی دیں کہ زید نے اپنے غلام رشود کو آزاد کردیا ہے تو وہ زید کو اس کے غلام کی قیمت دیں گے۔اگر گواہ یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کا دودھ پیا ہے، جس کی وجہ سے یہ اس پر حرام ہے، جس کے نتیجہ میں دونوں میں علحیدگی ہوجائے تو گواہوں پر اس کی بیوی کا مہر مثل زید کو دینا ضروری ہے۔(کیوں کہ ان امور کا تدارک کرنا ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے اس میں قیمت مثل واجب ہے"التہذیب" ۷/۳۰۰)یہی حکم لعان اور عیب کی وجہ سے فسخ میں گواہی دینے کا ہے، اگر گواہ اس بات کی گواہی دیں اور اس کے بعد اپنے جھوٹ کا اعتراف کریں تو ان پر شوہر کو مہر مثل دینا واجب ہے، جس کو اپنی بیوی سے علحیدگی کا نقصان ہوا ہے۔

اگر گواہ عمداً کسی شخص کے خلاف گواہی دیں کہ اس نے قتل کیا ہے اور ان کی گواہی کی وجہ سے اس کو قتل کردیا جائے تو گواہوں کو قصاص کے طور پر قتل کردیا جائے گا، اگر یہ گواہی عمداً نہ ہو بلکہ غلطی سے ہو تو ان پر مقتول کے اولیاء کو دیت مغلظہ دینا واجب ہوجاتا ہے۔اگر گواہ کسی کے خلاف عمداً زنا کی گواہی دیں پھر اس پر زنا کی حد نافذ کی جائے اور موت تک اس کو سنگ سار کیا جائے اور گواہوں کی طرف سے عمداً جھوٹی گواہی دینا ثابت ہوجائے تو ان گواہوں کو بھی قصاص میں قتل کردیا جائے گا۔(مسلک میں اس کی سزا کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ ان کو تلوار سے قتل کیا جائے گا یا ان کو بھی قصاص کے طور پر رجم کیا جائے گا؟ قول اصح یہ ہے کہ ان کو رجم کیا جائے گا۔"عجالۃ المحتاج" ابن ملقن ۴/۱۸۴۷) اگر گواہ فیصلہ نافذ ہونے سے پہلے رجوع کرلیں تو فیصلہ نافذ نہیں کیا جائے گا، چاہے یہ فیصلہ میاں بیوی کے درمیان علحیدگی یا غلام کی آزادی کا ہو یا زنا کے الزام میں سنگ سار کرنے کا ہو۔

۔گواہ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ آزاد، عادل، بینا، بولنے والا اور عاقل ہو، اسی طرح غفلت والا اور بے مروت نہ رہنا ضروری ہے:

غلام کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی ،اسی طرح اندھے، بہرے اور گونگے کی گواہی قبول نہیں ہے ، غافل رہنے والے کی گواہی بھی قبول نہیں ہے ،اسی طرح بے مروت کی

گواہی بھی قبول نہیں ہے، اندھے کے احکام میں اندھے کی گواہی کی تفصیلات آرہی ہیں، بچے کی گواہی قبول نہیں ہے اور نہ اس کی گواہی جس پر پابندی لگائی گئی ہو، جس میں مروءت نہ ہو تو اس کی بھی گواہی قبول نہیں ہے، یہ وہ شخص ہے جو بازار میں کام کرتا ہو اور اس کے باوجود راستہ میں کھانے پینے اور بازار میں بغیر چپل کے چلنے میں کوئی عار نہ سمجھتا ہو، رشد سے مراد عقل اور بلوغ ہے۔ بے مروءت وہ شخص بھی ہے جو لوگوں میں بے تکے واقعات کو بیان کرتا پھرتا ہو۔ (بے مروءت کا تفصیلی تذکرہ امام نووی نے ''روضۃ الطالبین'' میں کیا ہے ۲۳۲/۱۱)

۔اللہ کی سزا اور شادی شدہ ہونے میں گواہی پر گواہ بنانا:

فاسق کی گواہی جائز نہیں ہے، بیٹے کے حق میں والدین کی گواہی قبول نہیں ہے، ماں یا باپ کے حق میں بیٹے کو گواہی قبول نہیں ہے، اپنے غلام کے حق میں آقا کی گواہی قبول نہیں ہے، نہ اپنے آقا کے حق میں غلام کی، ان میں سے کوئی بھی گواہی قبول نہیں ہے اور ان کی گواہیوں پر گواہ بنایا جائے تو قبول نہیں ہوتی ہے۔

الٰہی سزا کو ثابت کرنے والی گواہی پر گواہ بنانا صحیح نہیں ہے مثلاً زنا کے خلاف گواہی، شراب پینے یا چوری کرنے کے خلاف گواہی، کیوں کہ ان صورتوں میں گواہی پر گواہ بنانا صحیح نہیں ہے۔

زنا کے مرتکب شخص کے شادی شدہ ہونے کی گواہی صحیح نہیں ہے تا کہ اس کو رجم کر دیا جائے، کیوں کہ الٰہی سزاؤں کی بنیاد اللہ کے بندوں کی ستر پوشی پر ہے تا کہ کسی گناہ کے ارتکاب کی صورت میں ان کو رسوا نہ کیا جائے بلکہ وہ خود گناہ سے باز آئیں، کسی کے لیے بھی کسی شخص کی شادی کی گواہی دینا جائز نہیں ہے یعنی اگر اس نے زنا کیا ہے تو اس کی سزا میں سختی کرنے اور اس کو سنگ سار کرنے کے ارادہ سے اس کے شادی شدہ ہونے کی گواہی دینا جائز نہیں ہے، البتہ اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زنا کرنے والے شخص نے حیا کے تمام پردوں کو چاک کر دیا ہو اور وہ اپنی برائیوں پر فخر کرنے والا ہو تو اس کی برائیوں سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کو سزا دلانے کے لیے جائز ہے، حالانکہ گواہی پر گواہ بنانا اس کے حق میں جائز نہیں ہے۔

خرید و فروخت، قرض، فسخ، اقالہ، قصاص، حدِ قذف میں گواہی کے خلاف گواہی قبول

کی جاتی ہے، گواہ کہے: میں فلاں کے خلاف فلاں کام کی گواہی دیتا ہوں۔ اور میں تم کو اپنی گواہی پر گواہ بناتا ہوں۔ یا کہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ زید نے عمرو کو ایک ہزار روپے قرض دیے ہیں اور میں تم کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے تمھارے سامنے اس کی گواہی دی ہے۔ اس صورت میں سننے والا گواہ کی طرح بن جائے گا۔ یا وہ سنے کہ زید نے حاکم کے سامنے گواہی دی ہے کہ عمرو نے اپنا گھر بکر کو بیچ دیا ہے۔ اس کے بعد وہ گواہی دے کہ اس نے زید کو حاکم کے سامنے گواہی دیتے ہوئے سنا ہے کہ عمرو نے اپنا گھر بکر کو بیچا ہے۔ یا زید سے سنے کہ عمرو اس کا ایک ہزار روپیوں کا قرض دار ہے اور اس کی گواہی دے۔ تو ان تینوں صورتوں میں گواہی پر گواہ بنانا جائز ہے۔ (ابن ملقن نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کی ضرورت پڑتی ہے اور واقعہ کے گواہ غیر حاضر بھی رہ سکتے ہیں یا مر بھی سکتے ہیں۔ دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ۱۸۴۴/۴)

۔دو اصلی گواہوں میں سے ہر ایک کے لیے دو گواہوں کا پایا جانا شرط نہیں ہے بلکہ یہی دو ان دونوں میں سے ہر ایک کی گواہی پر گواہی دیں گے، اس صورت میں دو اصلی گواہوں پر دو گواہوں کا ہونا گواہی پر گواہ بننے کے لیے کافی ہے، پھر ان دونوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ دونوں اپنے گواہ بننے پر دو گواہ لے آئیں۔

۔اپنے غلام کے حق میں مالک کی گواہی قبول نہیں ہے چاہے وہ غلام مکاتب ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح اصل کی گواہی فرع کے حق میں اور فرع کی گواہی اصل کے حق میں قبول نہیں ہے یعنی باپ اور ماں کی گواہی ان کے بچوں کے حق میں صحیح نہیں ہے اور نہ والدین کے حق میں بچوں کی گواہی، کیوں کہ یہ گواہی کسی شخص کا اپنے حق میں گواہی دینے کی طرح ہے، اسی بنیاد پر اصل یا فرع کی گواہی ان میں سے کسی کے مفاد اور حق میں قبول نہیں کی جائے گی۔

۔البتہ دوسرے کے خلاف گواہی ہو تو قبول ہو جائے گی، یہاں تک کہ دو بیٹوں کی اپنے باپ کے خلاف یہ گواہی قبول کی جائے گی کہ اس نے ہماری ماں کی سوکن کو طلاق دیا ہے یا اس پر زنا کا الزام لگایا ہے:

یعنی اگر فرع یا اصل کی طرف سے دوسرے کو گواہی کی وجہ سے نقصان ہوتا ہو تو یہ گواہی

قبول ہوتی ہے، چاہے بیٹوں میں سے دو اس بات کی گواہی دیں کہ ان کے والد نے ماں کی سوکن کو طلاق دی ہے یا اس پر زنا کا الزام لگایا ہے، کیوں کہ اس صورت میں نقصان کی گواہی سے ان دونوں میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ (التہذیب' بغوی ۲۷۶/۷)

۔میاں بیوی کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول ہے۔ (بغوی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان کے درمیان صرف رشتہ ازدواج کا معاہدہ ہے، اگر کسی کو مزدور بنایا جائے تو مزدور رکھنے والے کے حق میں اس کی گواہی قبول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ گواہی میں کوئی تہمت کا خدشہ نہیں ہے "التہذیب" ۲۷۶/۷۔۲۷۷) بھائی کی گواہی بھی بھائی کے حق میں قبول ہوتی ہے کیوں کہ اس سے کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔

۔غلامی اور ظاہری کفر کی وجہ سے کسی کی گواہی رد کی جائے پھر وہ آزاد اور مسلمان ہونے کے بعد یہی گواہی دوبارہ دے تو اس کی بات قبول کی جائے گی، اگر وہ ملزم ہو تو قبول نہیں ہوگی مثلاً فاسق، آقا، دشمن اور بے مروت۔

۔جب دو بینہ میں تعارض ہو جائے تو یہ دونوں ساقط ہو جاتے ہیں:

مثلاً زید اپنے گھر میں بیٹھا ہو۔ عمرو دو گواہوں کو حاضر کرے جو کہیں کہ یہ گھر عمرو کی ملکیت ہے۔ بکر دو گواہوں کو لے آئے جو کہیں کہ یہ گھر بکر کی ملکیت ہے تو اس صورت میں چاروں گواہوں کی گواہی ساقط ہو جاتی ہے۔ یا زید دو مرتبہ قسم کھائے کہ گھر اس کا ہے اور عمرو کا اس گھر میں کوئی حق نہیں ہے، اور یہ گھر اس کی ملکیت ہے اور بکر کو بھی اس گھر میں کوئی حق نہیں ہے، اس طرح گھر کی ملکیت زید کے لیے ثابت ہو جائے گی اور عمرو و بکر دونوں کا قبضہ گھر سے ختم کیا جائے گا۔

دعوی اور بینات

دعوی کے لغوی معنی طلب کرنے کے ہیں۔

شرعی معنی وہ قول ہے جس سے انسان دوسرے پر موجود اپنے حق کو ثابت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

بینات بینة کی جمع ہے، اس سے مراد وہ چیز ہے جس سے حق واضح کیا جاتا ہے، بینہ میں گواہ، دستاویزات، کاغذات، قرائن وعلامات شامل ہیں جن کے ذریعہ حاکم حق کو حق ثابت کر سکتا ہے، یہاں مراد گواہ اور دعوی کی دلیل ہے۔

یہ قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے، فرمانِ الٰہی ہے: "وَإِذَا دُعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ" (نور ۴۸) (اور جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ اعراض کرنے والا ہے) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ منافقین کی طرف سے شریعت کے حکم کا انکار ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ طاغوت کو حَکَم بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: "اگر لوگوں کو ان کے دعوؤں کے مطابق دیا جائے تو لوگ دوسروں کے مال اور خون کا دعوی کر لیں گے، اس لیے مدعی علیہ پر قسم ہے"۔ (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، سورۃ البقرۃ، باب إن الذین یشترون بعهد اللہ وأیمانهم ثمنا قلیلا ۴۵۵۲، مسلم: کتاب الأقضیة، باب الیمین علی المدعی علیه ۱۷۱۱، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) بیہقی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: "البتہ بینہ مدعی پر ہے اور انکار کرنے والے پر قسم ہے۔" (السنن الکبری للبیہقی: کتاب الدعوی والبینات، باب البینة علی المدعی ۲۱۸۰۵، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے، اور اس کی سند جید ہے جیسا کہ "عجالة المحتاج" ابن ملقن میں ہے: ۱۸۴۹/۴)

- محال اور ناممکن چیز کا دعوی سنا نہیں جائے گا۔ مثلاً احد پہاڑ کے برابر سونا یا چاندی کا دعوی کرے، اور نہ اس چیز کا دعوی جس کو شریعت نے باطل کیا ہو مثلاً شراب کی قیمت یا آزاد شخص کی قیمت کا دعوی، اور اس شخص کا دعوی بھی صحیح نہیں ہے جس کا کوئی اعتبار نہ ہو مثلاً بچہ اور پاگل اور نہ اس حربی کا دعوی جس کو امان نہ ہو۔

زید اگر یہ دعوی کرے کہ اس کو عمرو سے احد پہاڑ کے برابر سونا آنا ہے یا ایک ملین ٹن گیہوں آنا ہے تو یہ دعوی اس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے سنا نہیں جائے گا، اگر کوئی آزاد شخص کی قیمت کا دعوی کرے تو بھی مانا نہیں جائے گا کیوں کہ نہ اس کو خریدا جاتا ہے اور نہ بیچا۔ اسی طرح بچے اور پاگل کا دعوی قبول نہیں کیا جائے گا کیوں کہ شریعت نے مال میں ان کو تصرف سے روکا ہے اور ان دونوں کا ذمے دار دوسرے کو بنایا ہے جو ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، اگر ان کے خلاف مال ضائع کرنے کا دعوی کیا جائے تو یہ دعوی سنا جائے گا اور ان کے ولی کے واسطے سے ان کے مال میں سے ضائع کردہ چیز کا معاوضہ لیا جائے گا۔

حربی کافر کا دعوی سنا نہیں جائے گا جو کسی امان کے بغیر اور بغیر اجازت مسلمانوں کے علاقے میں داخل ہوا ہو۔

دعوی کی شرطیں:

دعوی کی چھ شرطیں ہیں:

۱۔ دعوی کرنے والا مکلّف ہو یعنی وہ عاقل اور بالغ ہو۔

۲۔ دعوی حربی کافر کی طرف سے نہ ہو۔

۳۔ دعوی کی تفصیل ہو: مدعی مدعی علیہ کے خلاف اس کے ذمے میں موجود امانت کا مطالبہ کرے۔

۴۔ یہ ثابت کیا جائے کہ دعوی مدعی علیہ کے ذمے کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

۵۔ مدعی علیہ متعین ہو۔

۶۔ دعوی میں تضاد نہ پایا جائے۔

- جب دعوی سنا جائے تو فریق مخالف اقرار کرے یا اس کے خلاف بینہ ثابت ہو جائے تو دعوی ثابت کرنے کے لیے یہ کافی ہے، ورنہ قسم کھلائی جائے گی۔

اگر مدعی علیہ قسم کھائے کہ اس کے ذمہ مدعی کا کوئی حق نہیں ہے، جب مدعی اپنا حق ثابت کرنے کے لیے گواہ یا بینہ پیش کرنے سے عاجز ہو تو دعوی ساقط ہو جاتا ہے اور مدعی علیہ پر قسم کھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ (دیکھا جائے ''کفایۃ الاخیار'' ۲/۳۷۵) اس سے تین مسائل مستثنی ہیں:

اگر بچے کے خلاف اس کے بالغ ہونے کا دعوی کیا جائے اور وہ بچہ انکار کردے۔ یا حاکم کے خلاف فیصلہ میں زیادتی کا دعوی کیا جائے، یا گواہ کے خلاف جھوٹا ہونے کا دعوی کیا جائے، تو اس صورت میں بچہ قسم نہیں کھائے گا کیوں کہ وہ بچہ ہے۔ (دیکھا جائے ''الوسیط'' ۷/۴۲۷) حاکم اپنے مقام ومرتبہ کی وجہ سے قسم نہیں کھائے گا اور گواہ اپنی کرامت وعزت کی وجہ سے قسم نہیں کھائیں گے، ورنہ کوئی بھی گواہی دینے کے لیے آگے نہیں آئے گا۔

- کسی حد میں قسم نہیں ہے، سوائے لعان میں اور سوائے زنا کا الزام لگائے جانے کی حد میں:

اگر زید پر کوئی زنا کا الزام لگائے تو اس کو قسم کھانے کے لیے نہیں کہا جائے گا اور نہ اس صورت میں جب کوئی اس پر چوری کا الزام لگائے اور نہ اس صورت میں جب کوئی اس پر شراب پینے کا الزام لگائے، کیوں کہ یہ سب ایسے الزامات ہیں جو گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہوتے ہیں اور اس شخص سے قسم کھانے کا بھی مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیوں کہ شرعی اصول یہ ہے کہ شرعی حدود میں قسم نہیں ہے، اس سے دو صورتیں مستثنی ہیں: لعان جب شوہر اپنی بیوی پر الزام لگاتا ہے کہ اس عورت کا بچہ اس سے نہیں ہے بلکہ یہ زنا کا بچہ ہے، اس صورت میں اس شخص سے قسم کھانے کا مطالبہ کیا جائے گا، اس کی تفصیلات لعان کے باب میں بیان کی جا چکی ہیں۔

جب عمرو زید پر الزام لگائے کہ اس نے زنا کیا ہے اور زید قسم کھائے کہ اس نے زنا نہیں کیا ہے تو عمرو کو اسّی کوڑے مارنے ضروری ہو جاتے ہیں جو زنا کا الزام لگانے کی حد ہے، اگر زید قسم کھانے سے انکار کردے تو اس پر زنا کی حد نہیں لگائی جائے گی، اگر زنا کا

الزام لگانے والا قسم نہ کھائے تو اس کو اسّی کوڑے حد کے طور پر مارے جائیں گے، لعان اور زنا کے الزام کے علاوہ دوسری حد میں قسم نہیں ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''شبہات کی وجہ سے حدود کو دور کردو''۔ (ابن عساکر: ''تاریخ دمشق'' ۲/۱/۱۷/۱۹، صحیح یہ ہے کہ یہ روایت ابن مسعودؓ پر موقوف ہے، طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' ۸۹۴۷ میں اس کو روایت کیا ہے۔ البتہ یہ حدیث جس میں آپ نے فرمایا ہے: ''جتنا ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دور کردو، اگر اس کے لیے کوئی نکلنے کی راہ ہو تو اس کی راہ چھوڑ دو، کیوں کہ امام معاف کرنے میں غلطی کرے یہ اس کے لیے سزا دینے میں غلطی کرنے سے بہتر ہے'' ترمذی وغیرہ نے یہ روایت کی ہے: ترمذی: ابواب الحدود عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی درء الحدود ۱۳۸۲، لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ دیکھا جائے ''التیسیر بشرح الجامع الصغیر'' محدث مناوی ۵۳/۱)

آدمی اگر اپنے فعل یا اپنے غلام کے فعل پر قسم کھائے تو اس کو مطلقاً قبول کیا جائے گا، چاہے یہ بات نفی میں ہو یا اثبات میں، مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے: تم میرے ایک ہزار روپیوں کے قرض دار ہو تو اس پر قسم کھانا واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہے: میرے غلام مبروک نے تم کو ایک ہزار درہم قرض دیا ہے تو اس پر قسم کھانا واجب ہے۔

دوسرے شخص کے کام پر قسم کھانے کی صورت میں اس کو زمانہ یا جگہ میں مقید کرنا ضروری ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے: اللہ کی قسم! تم آج تک میرے باپ کے ایک ہزار روپیوں کے قرض دار ہو۔ یا مثلاً کہے: اللہ کی قسم! تم نے آج تک مجھے کوئی رقم نہیں دی ہے۔ اس طرح کی قسم کا جگہ کے ساتھ مقید رہنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً کہے: اللہ کی قسم! تم نے میرے گھر میں مجھے کوئی بھی رقم نہیں دی ہے۔ اصول یہ ہے کہ ثابت کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ہے اور نفی مدعی علیہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مثلاً کہے: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔

۔یا دوسرے کے عمل سے لاعلمی پر مطلقاً قسم کھائے: مثلاً کہے: اللہ کی قسم! مجھے نہیں معلوم کہ میرے والد نے تم سے قرض لیا ہے۔ جب مدعی کہے کہ اس کے والد نے میرے ذمہ موجود قرض معاف کردیا ہے مثلاً بیٹا قرض لینے والے سے کہے: اللہ کی قسم مجھے معلوم

نہیں ہے کہ میرے والد تمھارے ذمہ موجود قرض سے دست بردار ہو گئے ہیں۔

۔اگر فریق مخالف اس کا حق دینے سے باز رہے، چاہے انکار کرتے ہوئے ہو یا اقرار کرتے ہوئے اور اس کو لینے سے عاجز ہو، اور مال لینے پر قدرت رکھتا ہو تو وہ اپنے حق کے بقدر مال لے سکتا ہے چاہے وہ اس کے حق کی جنس میں سے ہو یا اس کے علاوہ کسی دوسری جنس سے۔ (دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۳۵۱/۷-۳۵۲، انہوں نے رسول اللہ کے اس فرمان سے دلیل دی ہے جو آپؐ نے ہندہ سے کہی جب انہوں نے آپ کے پاس اپنے شوہر ابوسفیان کے بخل کی شکایت کی: ''جو تمھارے لیے اور تمھارے بچے کے لیے کافی ہو اتنا بھلے طریقہ سے لو''۔ مسند امام احمد ۲۴۱۱۷، بخاری: کتاب الاحکام، باب القضاء علی الغائب ۷۱۸۰، مسلم: کتاب الاقضیۃ، باب قضیۃ ہند ۱۷۱۴، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے ہے)

مثلاً عمرو زید کو ایک ہزار روپئے قرض دے اور وہ زید سے یہ قرض لینے سے عاجز ہو، زید طاقتور ہو اور عمرو کمزور ہو۔ اگر ایسا موقع ہو کہ زید کا قرض دار ایک ہزار روپئے لے آئے اور اس سے درخواست کرے کہ وہ یہ رقم لے کر زید کے حوالے کرے تو وہ زید سے اپنا حق لینے سے عاجز ہونے کے بدلے یہ مبلغ لے سکتا ہے۔ اسی طرح عمرو کے پاس زید کا سونا مل جائے جس سے وہ اپنا قرض پورا کر سکتا ہو تو وہ سونے سے اپنے قرض کا حصہ لے سکتا ہے جب اس کو موقع ملے۔

عمرو ایسا اس وقت کر سکتا ہے جب اس کے پاس اپنا حق ثابت کرنے اور حاکم کے ذریعہ زید سے اپنا حق لینے کے لیے سند یا گواہ نہ ہوں۔

۔اگر مدعی علیہ قسم کھانے سے انکار کردے تو اس پر انکار کرنے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ مدعی کے قسم کھانے کی وجہ سے مدعی کے حق میں فیصلہ ہوگا، کیوں کہ آپؐ نے طالبِ حق پر قسم کو لوٹا دیا ہے۔ یہ روایت حاکم نے کی ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (مستدرک حاکم: کتاب الأحکام ۱۰۰/۴، السنن الکبری للبیہقی: کتاب الشھادات، باب النکول ورد الیمین ۱۸۴/۱۰۔ ابن حجر نے ''التلخیص الحبیر'' میں اس کو ضعیف کہا ہے: ۲۰۹/۴) اگر ایسے مدعی کا دعوی ہو جس کے پاس بینہ نہ ہو تو مدعی علیہ سے مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ قسم کھائے، وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو حاکم مدعی علیہ کے خلاف اس کے انکار کی وجہ سے اپنا حکم صادر نہیں کرے گا، بلکہ حاکم پر ضروری ہے کہ وہ

مدعی علیہ کو یہ بات پہنچائے کہ اگر وہ قسم نہیں کھائے گا تو قسم مدعی کی طرف محول کی جائے گی۔ اگر مدعی قسم کھائے تو قاضی مدعی علیہ کے انکار کرنے کا فیصلہ سنائے گا اور اس کے خلاف حق ثابت ہو جائے گا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مدعی علیہ کے قسم کھانے سے انکار کرنے کی صورت میں قسم کو مدعی کی طرف محول کیا اور مدعی علیہ پر مدعی کا حق ثابت کیا۔

۔اگر مدعی علیہ ایسی میت کے مال کے بارے میں قسم کھانے سے انکار کرے جس کا کوئی وارث سے نہیں ہے یا وقف کے بارے میں یا مسجد پر وقف کے سلسلہ میں قسم کھانے سے باز رہے تو اس کو قسم کھانے یا اقرار کرنے تک قید کیا جائے گا۔ (یہی قول اصح ہے جیسا کہ ''روضۃ الطالبین'' میں ہے ۱۲/۵۰، دوسرا قول یہ ہے کہ ضرورت کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کیا جائے گا کیوں کہ یہ جھگڑے کی انتہا ہے ۷/۴۲۸)

۔اگر میت کا وصی کسی وارث کے خلاف دعوی کرے کہ اس نے اپنے ایک تہائی مال کی وصیت فقراء کے لیے کی ہے، اور وارث انکار کرے اور قسم کھانے سے بھی باز رہے تو اس کو قسم کھانے یا اقرار کرنے تک قید کیا جائے گا۔

آزاد کرنے کے مسائل

فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ آزادی کے مسائل کو اپنی کتابوں کا آخری باب بناتے ہیں، اسی طرح فقہ کے ابواب کے مطابق ترتیب دیے ہوئے فتاوی میں بھی اس باب کو نیک فال لیتے ہوئے اخیر میں بیان کرتے ہیں کہ یہ باب ان کے اعمال کا خاتمہ بن جائے اور اللہ تعالی ان پر اور ان کے اہل عیال پر یہ فضل کر دے کہ جہنم کے آگ سے آزاد کر دے۔

''عتق'' کے لغوی معنی خلاصی اور آزادی کے ہیں۔

اور شرعی معنی کسی آدمی کی غلامی کو ختم کرنے کے ہیں۔

آزادی کے مشروع ہونے کی دلیل قرآن، حدیث اور اجماع امت ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ''فَکُّ رَقَبَۃٍ'' (بلد۱۳) اس کے معنی غلامیت سے غلام کو آزاد کرنے کے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''جو بھی آدمی کسی مسلمان کو آزاد کر دے تو اللہ غلام کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو جہنم سے آزاد کر دے گا یہاں تک کہ فرج یعنی اگلی شرمگاہ کو فرج کے بدلے آزاد کر دے گا''۔ (بخاری: کتاب العتق، باب فی العتق وفضلہ ۲۵۱۷، مسلم: کتاب العتق، باب فضل العتق ۱۵۰۹، یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے)

آزاد کرنے کے ارکان

آزاد کرنے کے تین ارکان ہیں: آزاد کرنے والا، آزاد کردہ اور صیغہ مثلاً کوئی اپنے غلام سے کہے: ''اللہ تعالی کی خاطر تم آزاد ہو''۔

۔یا تو آزاد کرنا اجباری ہوتا ہے: مثلاً کوئی خود اپنی ذات کا مالک بن جائے یا کوئی شخص اپنی یعنی والدین وغیرہ یا اپنی فرع یعنی اولاد و پوتوں وغیرہ کا مالک بن جائے، یا کوئی شخص غلام کے آزاد کیے جانے کی گواہی دے لیکن اس کی گواہی قبول نہ کی جائے، پھر گواہی

دینے والا ہی اس غلام کا مالک بن جائے۔

اس کی شکل یہ ہے کہ غلام خود کو اپنے آقا سے خرید لے، جب وہ اپنے آقا کو مکمل قیمت ادا کرے تو وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ یا کوئی شخص اپنے اصل مثلاً باپ یا دادا اوپر تک میں سے کسی کو خریدے۔ یا ماں نانی دادی اوپر تک میں سے کسی کو خریدے، چاہے وہ ان کو خریدنے میں ان کو آزاد کرنے کا ارادہ کرے یا نہ کرے۔ یا کوئی شخص اپنی فرع یعنی بیٹے یا بیٹی نیچے تک میں سے کسی کو خریدے تو قیمت ادا کرتے ہی فرع آزاد ہو جاتا ہے، چاہے خریدنے والے کا ارادہ آزاد کرنے کا ہو یا نہ ہو۔

یا کوئی شخص گواہی دے کہ مبروک نامی کسی دوسرے شخص کا غلام آزاد ہو چکا ہے۔ لیکن یہ گواہی قبول نہ کی جائے۔ اس کے بعد وہی گواہ جس کی گواہی قبول نہ ہوئی ہو مبروک کو خرید کر مالک بن جائے تو اس صورت میں صرف خریدنے کی وجہ سے ہی مبروک آزاد ہو جاتا ہے، یہ اس کی سابقہ گواہی کی وجہ سے ہے، چاہے اس نے خرید کر آزاد کرنے کا ارادہ کیا ہو یا نہ ہو، یہ اجباری آزادی کی شکلیں ہیں۔

اختیاری آزادی صریح لفظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے مثلاً کہے: میں نے آزاد کیا۔ اور کنایہ لفظ سے بھی ہوتی ہے یعنی جس میں آزادی اور اس کے علاوہ دوسرے معنی پائے جاتے ہوں۔ (''التہذیب'' بغوی'' ۳۵۴، ''مغنی المحتاج'' شربینی الخطیب ۶/۴۸۸) مثلاً کوئی کہے: تم پر میری ملکیت نہیں ہے۔ یا تم پر میرا قابو نہیں ہے۔ یا میرے لیے تم پر کوئی راہ نہیں ہے۔ صریح آزادی یہ کہنے سے ہو جاتی ہے: میں نے تم کو آزاد کیا۔ تم آزاد ہو۔ میں نے تمھاری گردن آزاد کر دی۔

اگر کنایہ لفظ سے آزادی ہو تو اس میں نیت کا پایا جانا ضروری ہے، جب کہ صریح میں نیت شرط نہیں ہے کیوں کہ یہ لفظ سے ہی ہو جاتی ہے، اگر کنایہ آزادی میں نیت نہ ہو تو آزادی محقق نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ کبھی آقا غصہ کی حالت میں ایسی عبارت کہتا ہے لیکن اپنے غلام کو آزاد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ طلاق کے باب میں اگر شوہر اپنے بیوی سے کہے: میں نے تم کو آزاد کیا۔ اگر اس سے مقصود طلاق دینا ہو تو طلاق ہو جاتی ہے۔ اسی طرح

اگر آقا اپنے غلام سے کہے: میں نے تم کو طلاق دی۔ اور اس سے مراد آزاد کرنا ہو تو آزادی ہو جاتی ہے۔

۔اگر کوئی غلام کو اپنی صحت میں آزاد کر دے تو اس غلام کی آزادی آقا کے راس المال میں سے مانی جائے گی، چاہے اس کے پاس اس آزاد کردہ غلام کے علاوہ کوئی دوسری ملکیت کی چیز نہ ہو۔

۔یا اپنے مرض الموت میں آزاد کر دے اور اس پر اتنا قرض نہ ہو کہ پورا مال ہی ختم ہو جائے تو یہ ایک تہائی مال میں سے ہوگا۔ (''التہذیب'' بغوی ۸/۳۷۴) کیوں کہ آزاد کرنا تبرع ہے اور یہ مرض الموت میں ایک تہائی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر اس کو ایک تہائی مال غلام کی قیمت سے کم ہو جائے تو غلام میں سے ایک تہائی مال کے بقدر آزاد کر دیا جائے گا، کیوں کہ مریض کو اپنے مرض الموت میں ہی یا تبرع یا وصیت کے ذریعہ صرف اپنے ایک تہائی مال میں تصرف کرنے کا اختیار رہے، اس سے زائد میں نہیں۔ اگر اس کے اوپر اتنا قرض ہو کہ وہ اس کی ملکیت کے برابر ہو تو غلام ہی باقی رہتا ہے۔ اور غلام کو اس غرض سے آزاد نہیں کیا جائے گا، تاکہ اس کو اپنے آقا کے قرض کے ادائیگی میں ترکہ اور وراثت کے ایک حصہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

۔البتہ اس سے ام ولد مستثنٰی ہے، کیوں کہ اس کی قیمت راس المال میں سے نکالی جاتی ہے، اگر بچہ اس کے مرض الموت میں ہو جائے تو اس کا مال شہوتوں میں خرچ کرنے کی طرح ہے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرض الموت میں مریض ام ولد کو آزاد کر دے تو وہ آزاد ہو جاتی ہے، چاہے وہی ایک باندی اس کی کل ملکیت ہو، اس کو صرف ایک تہائی مال میں سے آزاد نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ اس باندی کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا جس طرح اس کے مالک نے اپنی شہوتوں اور خواہشات کی چیزوں میں پورا مال خرچ کر دیا ہو مثلاً اچھے کپڑوں اور لذیذ کھانوں وغیرہ میں۔

۔اگر دو پارٹنروں میں سے ایک اپنا حصہ آزاد کر دے تو اس کا حصہ آزاد ہو جاتا ہے،

کیوں کہ وہ اپنے حصہ میں تصرف کا مالک ہے اوراس وجہ سے بھی جس کی وجہ حدیث میں بیان کی گئی ہے جوآگے آرہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب غلام کے مشترکہ مالکوں میں سے کوئی اپنا حصہ آزاد کردے تو اس کے حصہ کا غلام آزاد ہوجاتا ہے، غلام کا یہ حصہ فوراً آزادی پاتا ہے، کیوں کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق ہے، اس کی دلیل بخاری ومسلم کی یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جوکوئی کسی غلام میں اپنے حصہ کوآزاد کردے اوراس کے پاس اتنا مال ہوجوغلام کی قیمت تک پہنچتا ہوتوغلام کی انصاف پرمبنی قیمت طے کی جائے گی پھروہ اپنے پاٹنروں کوان کے حصے دے گا اوراس صورت میں غلام آزاد ہوجائے گا، ورنہ اتنا ہی حصہ آزاد ہوگا جتنا اس نے آزاد کیا ہے۔

۔اگروہ تنگ دست ہویااپنی موت کے بعداپنے حصہ کوآزاد کرنے کی وصیت کرے تواس کی بات قبول ہوگی، جوپورے غلام کی آزادی پرنافذ نہیں ہوگی، اس کی وجہ مذکورہ حدیث نبوی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ غلام کے کسی حصے کی آزادی غلام کے باقی حصوں پرجاری نہیں ہوتی اگراس میں شرکاء اور پارٹنرس ہوں، البتہ اگر پارٹنرجس نے اپنے حصہ کوآزاد کیا ہے غلام کے باقی پارٹنروں کوان کے حصوں کی قیمت ادا کرے تووہ غلام آزاد ہوجاتا ہے، یاباقی غلام آزادی کے بغیر باقی رہتا ہے، اورصرف اسی حصہ کوآزادی ملتی ہے جس کوآزاد کیا گیا ہو۔

۔اگرایک تہائی بہت سے غلاموں کوآزاد کرنے کے لیے کافی نہ ہواورسبھوں کوایک ہی دفعہ آزاد کردے توآزادی کوقرعہ کے ذریعہ ممتاز کیا جائے گا:

یعنی اگرغلام کے آقا کے پاس موجود مال میں سے ایک تہائی اتنا نہ ہوکہ اس کی طرف سے آزاد کردہ سبھی غلاموں کی قیمت کے لیے کافی ہے تواس صورت میں اس کے ایک تہائی مال کے بقدر جتنے غلاموں کی آزادی ہوجاتی ہے، اتنے غلاموں کوقرعہ اندازی کے ذریعہ آزاد کیا جائے گا، باقی غلام ہی رہیں گے۔

مثلاایک شخص کے پاس تین غلام ہیں جن کی قیمتیں برابر برابر ہیں اوراس کے تہائی مال میں صرف ایک کوآزاد کرنے کی گنجائش ہے تواس صورت میں ان تین غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی، جس کا نام نکلے گا وہ آزاد ہوجائے گا۔(''التہذیب''بغوی ۳۷۵/۸)

مدبّر بنانے کے احکام

(تفصیل کے لیے دیکھا جائے:''الوسیط''غزالی:۴۹۳/۷،''التھذیب''بغوی:۴۰۶/۸،''مغنی المحتاج'' شربینی ۵۱۴/۶)

تدبیر کے لغوی معنی امور ومعاملات کے انجام پرغورکرنے کے ہیں۔

شریعت میں موت پرغلام کی آزادی کومعلق بنانے کوتدبیر کہتے ہیں۔

جب آقا اپنے غلام سے کہے: اگرتم گھر میں داخل ہوگئے تومیری موت کے بعدتم آزاد ہو۔جب غلام گھر میں داخل ہوجائے تووہ اپنے آقا کی موت کے بعد آزاد ہوجاتا ہے۔اگرآقا غلام کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے مرجائے تووہ آزاد نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ آزادی صرف ایک شرط پرمعلق نہیں تھی کہ اس کا آقا مرجائے، بلکہ آزادی اس کے آقا کی زندگی میں گھر میں داخل ہونے پرمعلق تھی، یہ ایک شرط کی طرح ہے جوپوری نہیں ہوئی اوردوسری شرط یہ تھی کہ اس کا آقا مرجائے، اگرچہ صرف یہ ایک شرط پوری ہوئی ہے جو آزاد ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔

مدبر بنانے کی دلیل بخاری اورمسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا جس کا نام ابومذکورہ تھا، اس نے اپنے غلام کی آزادی کواپنی موت پرمعلق کیا، اس غلام کا نام یعقوب تھا، غلام کے آقا پر بہت سے قرض تھے۔نبی ﷺ عمومی ولایت اور امت کی مصلحتوں پرغورکرنے کا اختیار رہنے کی وجہ سے غلام کو بیچنے کے لیے کھڑے ہوگئے، قرآنی نص کی وجہ سے آپؐ مومنین پرخودان کی جانوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔نبی ﷺ نے آٹھ سودرہم میں غلام کوبیچ دیا اوریہ قیمت غلام کے مالک ابومذکورہ کے پاس بھیجی اورکہا:''اپنا قرض ادا کرو''۔رسول اللہ ﷺ نے مدبر بنانے پرموافقت کی اوراس کوشرعی طورپرصحیح تصرف مانا، اسی طرح مدبر بنانے کی مشروعیت پرامت کا اجماع ہے۔(بخاری:

کتاب کفارات الأیمان، باب عتق المدبر ۶۷۱۶، مسلم: کتاب الزکاۃ، باب الابتداء فی النفقۃ بالنفس ثم أھلہ ثم القرابۃ ۹۹۷، یہ روایت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے)

بالغ، عاقل اور آزاد کی طرف سے مدبر بنانا صحیح ہے، اور اس بچے کی طرف سے صحیح نہیں ہے جو ممیّز ہو چکا ہو کیوں کہ وہ بالغ نہیں ہوا ہے۔ (یہی قول اظہر ہے، اس کو نووی نے ''المنہاج'' میں بیان کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ممیّز کی طرف سے صحیح ہے کیوں کہ اس میں ملکیت ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی ملکیت باقی رہتی ہے۔ دیکھا جائے ''عجالۃ المحتاج'' ابن ملقن ۱۸۸۰/۴) پاگل کی طرف سے مدبر بنانا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وہ عاقل نہیں ہے اور نہ مجبور کردہ کی طرف سے صحیح ہے کیوں کہ وہ بااختیار نہیں ہے۔

۔پھر آزادی کو ایک صفت کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے جو آقا کی موت ہے، یہ وصیت نہیں ہے، اس وجہ سے موت کے بعد آزاد کرنے اور غلام کی طرف سے قبول کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے اس سے نہ قولاً رجوع کرنا جائز ہے اور نہ عملاً مثلاً جماع کرے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مدبر بنانا آزادی کو ایک وصف پر معلق بنانا ہے جو غلام کے مالک کی موت ہے، یہ صفت وصیت کے حکم میں نہیں ہے، اس وجہ سے وارثین کی طرف سے اس کو دوبارہ آزاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ وارثین کی موافقت اور رضامندی پر اس کی آزادی موقوف رہتی ہے اور نہ آزادی میں رجوع کرنا جائز ہے، نہ قول کے ذریعہ یا عمل کے ذریعہ مثلاً مدبر باندی کے ساتھ جماع کرے۔

۔اس سے یہ شکل مستثنی ہے کہ غلام سے اپنی ملکیت کو ختم کردے مثلاً اس کو بیچ دے تو یہ بھی سبھی معلق بنائے ہوئے امور کی طرح ہے، اس صورت میں مدبر بنانا ملکیت کے موت تک جاری رہنے پر موقوف ہے، اگر اس کی ملکیت ختم ہوجائے تو مدبر بنانا باطل ہوجاتا ہے۔

۔جس باندی کو مدبر بنایا گیا ہو تو مدبر بنانے کے بعد اور آقا کی موت سے پہلے ہونے والے بچے اپنی ماں کے تابع نہیں رہتے ہیں، جس طرح رہن میں رکھے ہوئے جانور کا بچہ اپنی ماں کے تابع نہیں رہتا ہے۔ شوافع کے علاوہ باقی تین مسالک میں یہی رائے ہے کہ مدبرہ کے تابع اس کے بچے نہیں رہتے ہیں۔

شوافع کے نزدیک اگر آقا اپنی حاملہ باندی کو مدبر بنائے تو اس حمل کے لیے بھی مدبر بنانے کا حکم ثابت ہوجاتا ہے، اگر وہ حمل کو مستثنی نہ کرے، کیوں کہ یہ باندی کے ایک جزء اور حصہ کی طرح ہے۔

اگر وہ حمل کو مستثنی کرے تو مدبر ہونے میں یہ بچہ اپنی ماں کے تابع نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باندی کو مدبر بنایا جارہا ہو تو وہ حاملہ ہو یا آقا کی موت کے وقت حاملہ ہو یا مدبر بناتے وقت حاملہ ہو تو یہ حمل اپنی ماں کے تابع ہے، البتہ ان تین صورتوں کے علاوہ میں بچہ اپنی ماں کے تابع نہیں ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھا جائے: ''التہذیب'' بغوی ۴۱۵/۸۔۴۱۶)

۔اگر موت یا کسی دوسرے سبب کی وجہ سے باندی کی تدبیر ختم ہوجائے، یا حمل اس کے آقا کی موت سے پہلے نکل آئے تو اس بچہ کی تدبیر باقی رہتی ہے، جس طرح دو غلاموں کو مدبر بنایا جائے اور ان میں سے ایک کی موت آقا کی موت سے پہلے ہوجائے یا اس کی ملکیت ختم ہوجائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بچہ ہونے کے بعد اس کو بیچ دیا جائے تو بچہ کی تدبیر باقی رہتی ہے، یا مدبرہ باندی حاملہ ہوا اور اپنے آقا کی موت کے بعد بچہ جنے تو بچہ مدبر ہونے کی وجہ سے آزاد ہوجائے گا، یہ اس طرح ہے جب کوئی اپنے دو غلاموں کو مدبر بنائے پھر ان میں سے ایک کو بیچ دے یا ایک کی موت ہوجائے تو دوسرا مدبر باقی رہتا ہے۔

۔مدبر بنانے کا صریح لفظ یہ ہے کہ آقا کہے: تم میری موت کے بعد آزاد ہو۔ یا کہے: میں نے تم کو اپنی موت کے بعد آزاد کردیا۔ یا کہے: میں نے تم کو مدبر بنایا۔ یا کہے: تم مدبر ہو۔ چاہے اس صورت میں یہ نہ کہے کہ میری موت کے بعد۔

۔کنایہ یہ ہے کہ کہے: میری موت کے بعد میں نے تمھاری راہ چھوڑ دی۔ یا کہے: میں نے اپنی موت کے بعد تم کو روک دیا۔ اور مدبر بنانے کی نیت ہو۔ اس صورت میں نیت پائی جانی ضروری ہے۔ (''الوسیط'' غزالی ۴۹۵/۷)

۔اگر کوئی مدبر بنائے پھر مکاتب بنائے، یا مکاتب بنائے پھر مدبر بنائے تو جائز ہے۔ ان دونوں صورتوں میں غلام مدبر مکاتب بنتا ہے۔ آقا پہلے مرے تو وہ آزاد ہوجائے گا۔ اگر

اپنی قسطیں آقا کے مرنے سے پہلے ادا کرے تو بھی آزاد ہوجائے گا۔

اگر آقا اپنے غلام کو مدبر بنائے اور ایک ہزار روپیوں پر مکاتب بنائے اور آقا کی موت ایک ہزار روپیوں کی ادائیگی سے پہلے ہوجائے تو غلام آزاد ہوجاتا ہے اور غلام سے باقی قسطیں معاف ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ اپنے آقا کی موت سے پہلے قسطیں ادا کردے تو غلام مکاتب بننے کی وجہ سے آزاد ہوجائے گا اور اس کی تدبیر باطل ہوجائے گی، اگر وہ مدبر ہونے کی وجہ سے اپنی آزادی حاصل کرے تو اس کی کمائی اس کے لیے باقی رہتی ہے اور اس کے بچے آزاد ہوجاتے ہیں۔

ام ولد کے احکام ومسائل

اس باب میں ان باندیوں کے احکام بیان کیے گئے ہیں جو اپنے آقاؤں کے جماع کی وجہ سے ان کی اولاد کی مائیں بن گئی ہوں جن کو ام ولد کہا جاتا ہے۔

ام ولد کے احکام کی مشروعیت کی دلیل صحیح حدیث ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو بھی باندی اپنے آقا سے جنے تو اس کی موت پر وہ آزاد ہے''۔ ابن ماجہ اور حاکم نے یہ روایت کی ہے اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (مستدرک حاکم: کتاب البیوع ۲۱۳۳۔ انھوں نے کہا کہ اس روایت کی سند صحیح ہے، البتہ بخاری ومسلم نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ ابن ماجہ: کتاب العتق، باب امہات الأولاد ۲۵۱۵)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ام ولد کو نہ بیچا جائے گا اور نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ وراثت میں تقسیم کیا جائے گا، اس کا آقا جب تک زندہ ہے اس سے لطف اندوز ہوگا، جب آقا مرجائے تو وہ آزاد ہے''۔ دارقطنی نے یہ روایت کی ہے۔ (کتاب المکاتب ۴۷۱۸)

۔ جب کوئی باندی کسی آزاد کے جماع کی وجہ سے حاملہ ہوجائے چاہے وہ شخص مکمل آزاد ہو یا اس کا بعض حصہ آزاد ہو، چاہے وہ کافر ہو یا پاگل ہو، چاہے جماع کے بغیر ہو یا حرام جماع کی وجہ سے ہو، پھر اس کو بچہ ہوجائے چاہے وہ ناقص حمل ہی ہو تو ام ولد بن جاتی ہے۔ بغیر جماع کے حمل ہونے کی صورت یہ ہے کہ باندی اپنے آقا کی منی لے اور اس کو اپنی اگلی شرمگاہ میں ڈال دے۔ حرام جماع کے ذریعہ حمل یہ ہے کہ باندی حائضہ ہو یا احرام میں ہو یا فرض روزہ یعنی رمضان کا روزہ رکھے ہوئے ہو۔

گرنے والا حمل بھی اس وقت حمل مانا جاتا ہے جب جنین مضغہ بن جاتا ہے یعنی گوشت کا لوتھڑا جس میں آدمی کی شکل پائی جاتی ہے۔ جب مضغہ کو پانی میں ڈالا جاتا ہے تو

وہ آدمی کی شکل اختیار کرتا ہے اور حاملہ اپنے حمل کی دیت کی مستحق بن جاتی ہے جب حمل اس مرحلہ کو پہنچتا ہے یعنی مضغہ بن جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ باندی جب اپنے آقا کا بچہ جنتی ہے تو وہ ام ولد بن جاتی ہے، اگر وہ مضغہ گراتی ہے جو آدمی کی اصل ہے تو اس کے ثابت ہونے کے لیے چار عورتوں یا دو تجربہ کار مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کی ضرورت پڑتی ہے، اگر وہ اپنے آقا سے حاملہ ہو جائے اور اس کو بچہ ہو جائے چاہے وہ مردہ ہو یا نامکمل حمل ہو تو وہ ام ولد بن جاتی ہے۔ (دیکھا جائے ''مغنی المحتاج'' ۵۵۹/۶) اور اپنے آقا کی موت سے آزاد ہو جاتی ہے چاہے وہ اپنے آقا کو قتل کر دے، چاہے وہ آقا مبعّض ہو، قتل کرنے کی صورت میں اس کے بدلے قصاص میں باندی کو قتل کیا جائے گا، اگر اس کو قتل نہ کیا جائے تو اس پر دیت لازم آتی ہے اور یہ دیت باندی کے ذمے میں رہتی ہے، اصول یہ کہتا ہے کہ ''جو کسی چیز کو اس کے آنے سے پہلے جلدی حاصل کر لے تو اس کی سزا یہ دی جاتی ہے کہ اس چیز سے اس کو محروم کر دیا جاتا ہے''۔ چناں چہ جو اپنے مورث کو قتل کر دے تاکہ وہ وارث کا حق دار بن جائے تو وہ وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جو باندی ام ولد بن گئی ہے تو اپنے آقا کو قتل کرنے کی صورت میں وہ اپنی آزادی سے محروم ہو جاتی ہے۔ باندی کے ام ولد ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا آقا اس کے بچے کا باپ بنتا ہو۔

۔ام ولد بننے میں اعتبار اس بات کا ہے کہ اس کے رحم میں نطفہ اس کے آقا کے جماع کے نتیجہ میں ٹھہرا ہو یعنی وہ باندی اس شخص کی ملکیت ہو۔ اگر باندی کے رحم مادر میں کسی ایسے شخص کا نطفہ ٹھہرے جو اس کا مالک نہ ہو اور اس نے باندی کو اپنی آزاد بیوی سمجھ کر جماع کیا ہو یا اس کو اپنی باندی سمجھا ہو یا اس کو آزاد سمجھ رہا ہو جس کے ساتھ لوگوں نے دھوکہ دے کر شادی کرائی ہو جب کہ وہ باندی ہے تو ان تمام صورتوں میں اگر باندی اپنے آقا کے علاوہ سے حاملہ ہو جائے تو بچہ ہونے کی صورت میں وہ ام ولد نہیں بنتی ہے۔ کیوں کہ اس کے رحم میں نطفہ اس کے آقا کا نہیں ہے، بلکہ دوسرے کا ہے، اس سے صرف ایک شکل مستثنی ہے کہ جب باندی کے آقا کا بیٹا اس کے ساتھ جماع کرے اور اس سے حاملہ ہو جائے تو وہ

اس بیٹے کی ام ولد بن جاتی ہے۔

۔آقا اپنی باندی کو نکاح پر مجبور کر سکتا ہے۔ ہاں اگر آقا کافر ہو اور باندی مسلمان ہو تو آقا کو اپنی باندی کی شادی کرانے کا اختیار نہیں ہے بلکہ حاکم آقا کی اجازت سے باندی کی شادی کرائے گا۔ (کیوں کہ کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے، جس کی تفصیلات ولایت کے باب میں گزر چکی ہیں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ام ولد کا آقا اپنی ام ولد باندی کو شادی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے کیوں کہ وہ ابھی تک باندی کے حکم میں ہے، البتہ اگر اس کا آقا کافر ہے تو وہ اس کی شادی نہیں کرا سکتا ہے، بلکہ حاکم اس کے آقا کی اجازت سے اس کی شادی کرائے گا۔

۔ام ولد اور مدبرہ کے درمیان سات مسائل میں فرق ہے: (''مغنی المحتاج'' ۶/۵۶۴)

ام ولد کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ اس کو ہبہ کیا جا سکتا ہے جس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ حدیث ہے۔ جب کہ مدبرہ کو بیچنا بھی جائز ہے اور ہبہ کرنا بھی۔

اس کو نہ رہن میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بارے میں وصیت کی جا سکتی ہے کیوں کہ وہ اپنے آقا کی موت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مدبرہ کو بھی رہن میں رکھنا جائز نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں وصیت کرنا جائز ہے، اور ام ولد کی آزادی آقا کے راس المال سے ہوگی، صرف اس کے ایک تہائی مال سے نہیں، جب کہ مدبرہ کی آزادی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی قیمت ایک تہائی وراثت سے زیادہ نہ ہو۔

غلام کے احکام

اس باب میں غلام کے احکام کی وضاحت کی گئی ہے اور غلام و آزادی کے درمیان فروق کو بیان کیا گیا ہے۔

۔آزاد کے مقابلہ میں غلام پر جمعہ فرض نہیں ہے اور اس سے جمعہ منعقد نہیں ہوتا ہے، اس کے برخلاف آزاد پر جمعہ کی نماز فرض ہے اور وہ جمعہ میں حاضر ہو تو جمعہ منعقد ہوتا ہے جب وہ چالیس آزاد لوگوں کے ساتھ شریک ہو، البتہ اگر غلام جمعہ کی نماز میں حاضر ہو اور نماز ادا کرے تو اس کی نماز صحیح ہو جاتی ہے اور یہ اس کے حق میں ظہر کی نماز کے قائم مقام بن جاتی ہے۔(کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے سوائے چار لوگوں کے: غلام، باندی، بچہ اور بیمار۔ ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ ۱۰۶۷، حاکم: کتاب الجمعۃ، باب من تجب علیہ الجمعۃ ۲۸۸/۱، یہ روایت طارق بن شہابؓ سے ہے)

۔باندی کا ستر مرد کی طرح ہے یعنی ان دونوں کا سر ستر میں شامل نہیں ہے، البتہ غیر محرم کے لیے باندی کے پورے جسم کا دیکھنا حرام ہے۔

یعنی باندی کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اور باندی مرد کے ساتھ اس میں مشترک ہے کہ ان دونوں کا سر ستر نہیں ہے، اس کے باوجود غیر محرم کے لیے اس کے پورے جسم کو دیکھنا حلال نہیں ہے، بلکہ غیر محرم کو باندی کے چہرے اور ہتھیلیوں کو بھی دیکھنا جائز نہیں ہے، بہت سی باندیاں آزاد عورتوں سے بھی زیادہ خوبصورت رہتی ہے۔

۔غلام پر نہ حج فرض ہے اور نہ عمرہ، البتہ وہ نذر مانے تو واجب ہو جاتا ہے، اگر وہ حج یا عمرہ کرے پھر اس کو آزاد کر دیا جائے تو اس کے آزاد ہونے سے پہلے کیا ہوا حج فرض حج اور عمرہ کی طرف سے کافی نہیں ہے، بلکہ فرض کی ادائیگی کے لیے اس کو دوبارہ حج اور عمرہ کرنا ضروری

ہے۔(کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو بھی غلام حج کرے پھر اس کو آزاد کر دیا جائے تو اس پر دوسرا حج واجب ہے''۔ ''الاوسط'' طبرانی ۲۷۵۲، ''السنن الکبری'' ۳۲۵/۴۔ اس کو ہیثمی نے مجمع الزوائد'' ۲۰۶/۳ میں روایت کیا ہے اور کہا ہے: طبرانی نے ''الاوسط'' میں یہ روایت کی ہے۔ اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں)

۔غلام گواہ نہیں بن سکتا ہے اور نہ ترجمان، نہ قیافہ شناس بن سکتا ہے، نہ تقسیم کرنے والا، نہ کھجور و انگور کا اندازہ لگانے والا، نہ کسی چیز کی قیمت طے کرنے والا اور نہ حاکم کا امین اور نہ امام اعظم یعنی خلیفہ، نہ قاضی، نہ نکاح یا قصاص وغیرہ میں ولی، نہ وصی بن سکتا ہے اور نہ عمومی امارت اس کے حوالے کی جا سکتی ہے۔

یہاں ان عمومی ذمے داریوں کو بیان کیا گیا ہے جو غلام کے حوالے کیا جانا جائز نہیں ہے۔ سب سے پہلی ذمے داری یہ ہے کہ غلام گواہ نہیں بن سکتا ہے، کیوں کہ گواہی کے لیے آزاد ہونا ضروری ہے(کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے''وَأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ''(طارق۲) یہاں خطاب آزاد لوگوں سے ہے، کیوں کہ گواہی کمال اور فضیلت اور دوسرے پر نفوذ حاصل رہنے کی صفت ہے، کیوں کہ یہ ولایت اور سرپرستی ہے اور غلام ولایت کا اہل نہیں ہے۔ دیکھا جائے ''کفایۃ الاخیار'' تقی حصنی ۳۸۰/۲۔۳۸۱) وہ حاکم کے سامنے فریقین کی باتوں کا ترجمان بھی نہیں بن سکتا اور نہ گواہوں کی باتوں کا۔

غلام قیافہ شناس نہیں ہو سکتا ہے، یہ وہ شخص ہے جس پر بچے کی نسبت اس کے باپ کی طرف کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں بھروسہ کیا جاتا ہے۔ یعنی جب سانولی بیوی سانولے باپ سے گورا بچہ جنے تو قیافہ شناس اس بات کی تعیین کر سکتا ہے کہ یہ بچہ اس کے باپ کا ہے یا نہیں۔

پارٹنروں یا وارثین کے درمیان مال کی تقسیم کی ذمے داری غلام کو دینا جائز نہیں ہے، وہ کھجور یا کشمش کے حصول کے لیے اندازہ لگانے والا نہیں بنایا جا سکتا ہے چاہے یہ مقدار اس حد تک پہنچی ہو جس میں زکوۃ واجب ہوتی ہے یا وہاں تک نہ پہنچی ہو۔

غلام کو سامان کی قیمت کا اندازہ لگانے کی ذمے داری دینا بھی جائز نہیں ہے، کیوں کہ اندازہ لگانے کا کام ایک قسم کی گواہی ہے۔ حاکم یہ ذمے داری کسی غلام کو نہیں دے سکتا ہے، اگر شرکاء اپنے درمیان تقسیم کی ذمے داری یا اپنے سامان کی قیمت طے کرنے پر راضی

ہو جائیں تو جائز ہے اور غلام ان کی رضامندی سے یہ ذمے داری ادا کرسکتا ہے۔

حاکم اپنا امانت دار یا اپنے رجسٹروں اور دستاویزات اور محضر کو تحریر کرنے والا کاتب کسی غلام کو مقرر نہیں کرسکتا ہے، وہ مسلمانوں کا خلیفہ بھی نہیں بن سکتا ہے، وہ قضاءت کی ذمے داری بھی نہیں نبھا سکتا ہے۔ وہ شادی پر عورت کی موافقت کا گواہ بھی نہیں سکتا ہے۔ البتہ باندی اپنی شادی کرسکتی ہے چاہے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔

مجرم سے قصاص یا دیت لینے کی ذمے داری غلام کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح دوسرے حدود نافذ کرنے کی ذمے داری بھی اس کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے مثلاً ہاتھ کاٹنا یا شرابی پر حد نافذ کرنا یا حد قذف وغیرہ، کیوں کہ حدود اور قصاص نافذ کرنا حاکم کی ذمے داریوں میں سے ہے۔

کسی بھی طرح کی عمومی ولایت غلام کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے غلام کو کسی شہر کا محاسب یعنی ٹیکس اور عمومی مال کو جمع کرنے کا ذمہ دار نہیں بنایا جاسکتا ہے، اس کو ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے: ''غلام کو کسی عمومی معاملہ کی ذمے داری نہیں سونپی جائے گی''۔

۔وہ کسی چیز کا مالک نہیں بنتا ہے چاہے اس کا مالک اس کو کوئی چیز دے۔ وہ ملکیت کی وجہ سے جماع نہیں کرسکتا ہے، چاہے وہ مکاتب ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ اس کی کوئی ملکیت نہیں ہے یا وہ کمزور ہے اور طلاق کی وجہ سے باندی کی ہلاکت کا اندیشہ رہتا ہے، کیوں کہ غلام اپنی جان کا مالک نہیں ہے، مکاتب اس لیے کہ وہ کبھی دوبارہ غلام بن سکتا ہے، اگر وہ اپنے آقا کو طے شدہ قسطیں ادا نہ کرپائے۔

۔غلام پر زکوۃ فرض نہیں ہے، صرف فطرہ واجب ہے جس کی ادائیگی بھی اس کے آقا کے ذمہ ہے۔

۔اس سے کوئی جرم ہونے کی صورت میں مالی کفارہ کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے، البتہ قسم کے کفارہ میں روزے اس پر واجب ہوتے ہیں۔

۔اس کو زکوۃ اور کفارہ میں سے کوئی چیز نہیں دی جائے گی، البتہ مکاتب کو زکوۃ میں سے

اس کا حصہ دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ غلام کا نفقہ اس کے آقا کے ذمہ رہتا ہے، البتہ اگر غلام اپنے آقا کے ساتھ مکاتب کا معاہدہ کرے تو اس کو زکوۃ کے مال میں سے مکاتبین کا حصہ اس کی آزادی میں تعاون کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ (''کفایۃ الاخیار'' ۱/۲۸۶)

۔غلام فرض کے علاوہ کوئی روزہ اس صورت میں نہیں رکھے گا جب اس کے روزہ رکھنے سے اس کو یا اس کے آقا کو نقصان ہوتا ہے، اگر آقا اجازت دے تو رکھ سکتا ہے، باندی اپنے آقا کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہیں رکھ سکتی ہے چاہے روزہ رکھنے سے باندی کو نقصان نہ ہوتا ہو۔

۔اگر غلام مکاتب نہ ہو اور اس کو معاملات کی اجازت نہ ہو تو اس پر فی الحال واجب ہونے والے کسی مال کا اقرار کرنا لازم نہیں ہے، کیوں کہ اس کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ذمے میں لازم ہوجاتا ہے تا کہ اس کے آزاد ہونے کے بعد اس کا مطالبہ کیا جائے۔

۔مال غنیمت میں اس کا کوئی حصہ نہیں بلکہ اس کو خوشی سے تھوڑا سا دیا جائے گا، اور وہ گری ہوئی چیز نہیں لے گا، البتہ دوسرے کی اجازت سے اس کی نیابت کرتے ہوئے لے سکتا ہے۔

اگر غلام جہاد میں شریک ہو اور اس جہاد میں مالِ غنیمت ہاتھ لگے تو اس کو جنگجو کا مکمل حصہ نہیں دیا جائے گا بلکہ تھوڑا بہت دیا جائے گا، غلام کسی جگہ پڑے ہوئے مال یا راستے میں پڑے ہوئے مال کو نہیں لے سکتا ہے، البتہ اگر کوئی آزاد شخص اس کو اپنی طرف سے نائب بن کر مال اٹھانے کی ذمے داری سونپے تو لے سکتا ہے۔ (کیوں کہ یہ ولایت ہے ''کفایۃ الاخیار'' ۲/۱۴)

۔نہ وہ وارث بنتا ہے اور نہ دوسرے اس کے وارث بنتے ہیں اور آقا کی اجازت کے بغیر اس کی کفالت بھی صحیح نہیں ہے، اس کے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین پر جتنے اخراجات آتے ہیں وہ اس کے آقا کے ذمے ہے چاہے وہ مکاتب ہی کیوں نہ ہو، غلام کسی کو حاضر کرنے کی کفالت اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتا ہے، اگر آقا اجازت دے تو لے سکتا ہے۔

۔وہ دیت کا ضامن نہیں بنتا ہے بلکہ آزاد سے دیت کی صورت میں جو ضمانت لی جاتی ہے وہی اس سے قیمت کی صورت میں ضمانت لی جائے گی اور غلام کے عاقلہ پر اس قیمت

کی ادائیگی ہوگی:

جب دیت یعنی خون کی قیمت کسی آزاد شخص پر لازم ہوتی ہے تو غلام کی قیمت غلام کے ذمے لازم ہو جاتی ہے۔ جب آزاد کسی دوسرے شخص کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے عاقلہ پر اس کی دیت ادا کرنے کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اگر غلام دوسرے کو غلطی سے قتل کر دے تو قاتل غلام کی قیمت لگائی جائے گی اور قاتل غلام کے عاقلہ مظلوم کے خاندان کو یہ قیمت ادا کریں گے، چاہے اس کی قیمت دیت کے برابر ہو یا کم ہو یا زیادہ۔

یہ بات معلوم ہی ہے کہ غلام کی دیت آزاد کی دیت کی آدھی ہے، جب اعضاء پر جرم کیا جائے مثلاً ہاتھ تو کٹے ہوئے ہاتھ کی دیت غلام میں آزاد کی دیت سے آدھی ہے۔

غلام کسی دوسرے شخص سے دیت کو نہیں اٹھائے گا، البتہ وہ اپنے کسی بھی عمداً جرم کی دیت برداشت کرے گا۔

غیر شادی شدہ غلام زنا کرے تو اس کی سزا آزاد زانی کی آدھی ہے۔ چاہے وہ غلام ہو یا باندی، دونوں پر یہی اصول منطبق ہوتا ہے، غلام یا باندی کے لیے پچاس کوڑے ہیں اور آزاد مرد وعورت کے لیے سو کوڑے ہیں جب وہ غیر شادی شدہ ہوں اور غلام کو چھ مہینوں کے لیے جلاوطن کیا جائے گا اور آزاد کو ایک سال کے لیے۔ البتہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں زنا میں غلام اور باندی کو رجم نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ رجم میں آدھا نہیں ہوتا ہے۔ (''فتح الوہاب'' شیخ الاسلام زکریا ۱۵۸/۲) البتہ قتل عمد میں آزاد قاتل اور غلام قاتل کی سزا یکساں ہے، دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

۔غلام دو باندیوں سے نکاح کر سکتا ہے اور دو سے زائد شادی نہیں کر سکتا ہے اور اس کو طلاق کا اختیار صرف دو ہے، اس کی تفصیلات نکاح اور طلاق کے باب میں گزر چکی ہیں۔

۔باندی کی عدت دو طہر ہے اگر اس کو حیض آتا ہو، اگر حیض نہ آتا ہو مثلاً بوڑھی ہو تو ڈیڑھ مہینہ ہے۔

۔باندی اور اس کے آقا کے درمیان لعان نہیں ہے، کیوں کہ لعان صرف شوہر اور بیوی

کے درمیان ہوتا ہے، باندی اور اس کے آقا کے درمیان نہیں، یہاں قسم لعان کی جگہ لیتی ہے، اگر باندی شادی شدہ ہو تو اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان لعان جائز ہے۔

۔غلام ایک ہی ساتھ آزاد اور باندی کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے، جب کہ آزاد شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے، باندی سے آزاد کی شادی کے لیے چند شرطیں ہیں جن کا تذکرہ نکاح کے باب میں کیا جا چکا ہے۔

۔آزاد غلام کا قتل کرے تو آزاد سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور نہ مبعّض غلام سے:

یعنی جب کوئی آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ بطور قصاص آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ (''کفایۃ الاخیار'' ۲۱۴/۲) جب کوئی مبعّض یعنی آدھا آزاد اور آدھا غلام کسی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے مبعض کو قتل نہیں کیا جائے گا، اس طرح کے حالات میں غلام کی قیمت اس کے آقا کو دی جائے گی اور قاتل کی تعزیر کی جائے گی، اور اس پر قتل کا کفارہ بھی لازم ہے۔

۔اس کے ذریعہ فرض کفارات ادا کیے جاتے ہیں یعنی متعین گناہ کے ارتکاب کی صورت میں بطور کفارہ غلام آزاد کرنا فرض ہو جاتا ہے، اس صورت میں مالک اپنے غلام کو آزاد کرے گا۔

کوئی غلام پر زنا کا الزام لگائے تو اس پر زنا کے الزام کی حد نافذ نہیں ہوگی، جب کہ کوئی آزاد پر زنا کا الزام لگائے تو اس پر حد قذف نافذ ہوتی ہے۔

۔وہ خود سے اپنا نکاح نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے آقا کی اجازت ضروری ہے، کیوں کہ اس کی بیوی کا نفقہ آقا کے ذمے ہے جب کہ آزاد بالغ کو شادی کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

۔باندی کو نکاح پر اس کے آقا کے واسطہ سے مجبور کیا جائے گا، کیوں کہ اس کے سبھی بچے اس کے آقا کے غلام بن جاتے ہیں۔

۔باندی کی تقسیم آزاد عورت کی تقسیم کی آدھی ہے یعنی جب کوئی آزاد شخص ایک باندی اور ایک آزاد عورت سے شادی کرے تو باندی کے پاس ایک رات گزارے گا اور آزاد کے

پاس دوراتیں۔

باندی کا مہراس کونہیں ملتا ہے، بلکہ دوسرے کوملتا ہے یعنی اس کے آقا کو۔

اس کا بچہ اس کے آقا کی طرف منسوب نہیں ہوگا، جب تک کہ آقا اپنی باندی کے ساتھ جماع کرنے کا اقرار نہ کرے۔

جب کہ آزادعورت کے بچے کی نسبت اس کے شوہر کی طرف ہی کی جاتی ہے جب شادی پر اتنی مدت گزر جائے کہ اتنی مدت میں بچہ ہونے کا امکان ہو، یہ مدت چھ ماہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بچہ بستر والے کا ہے''۔(بخاری: کتاب الفرائض، باب الولد للفراش ۶۳۷۹، مسلم: کتاب الرضاع، باب الولد للفراش ۲۷۲۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

مبعض غلام کے احکام

مبعض وہ ہے جس کا کچھ حصہ آزاد ہواور کچھ حصہ غلام ہو چکا ہے وہ مرد ہو یا عورت۔

مبعض بعض احکام میں غلام کی طرح ہے مثلاً نکاح اور طلاق، عدت، سزاؤں، گواہی، جمعہ کے واجب اور منعقد ہونے، قصاص اور رشتے دار کو نفقہ دینے میں۔ مبعض باندی ہواوراس کی شادی کسی غلام سے ہوئی ہو تو اس کو شادی فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، نہ وہ وارث بنتا ہے اور نہ اس پر حج یا عمرہ فرض ہے، اسی طرح وہ قاضی بھی نہیں بن سکتا اور نہ ولی۔

مبعض اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتا ہے، اور دو سے زائد بیویاں نہیں رکھ سکتا ہے، اوراس کو دو سے زائد طلاق کا حق نہیں ہے، مبعض باندی اگر حیض والی ہو تو اس کی عدت دو طہر ہے، اگر حیض والی نہ ہو مثلاً بوڑھی تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہے۔

مبعض پر دیت آزاد پر واجب دیت کی آدھی ہے، شراب پینے کی صورت میں آزاد کو چالیس کوڑے مارے جاتے ہیں جب کہ مبعض کو بیس کوڑے، جب مبعض پر کوئی آزاد زنا کا الزام لگائے تو آزاد کی تعزیر کی جائے گی، مبعض کی گواہی قبول نہیں ہے جس طرح غلام کی قبول نہیں ہے، مبعض پر جمعہ کی نماز فرض نہیں ہے اور نہ اس سے جمعہ منعقد ہوتا ہے جب چالیس آزاد مردوں میں سے وہ بھی ہو، کیوں کہ جمعہ کے انعقاد کے لیے چالیس آزاد مردوں کا پایا جانا ضروری ہے، اگر وہ جمعہ میں حاضر ہو تو اس کی نماز صحیح ہوتی ہے، پھر وہ ظہر کی نماز ادا نہیں کرے گا، اس کے قاتل کو قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ دیت ادا کرے گا۔ اگر مبعض دوسرے مبعض غلام کو قتل کردے تو اس کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی قیمت مجرم سے لے جائے گی اوراس کی تعزیر کی جائے گی۔

قریبی رشتے داروں کے نفقہ میں اس پر ماں باپ کا نفقہ، اسی طرح چھوٹے بچے کا

نفقہ واجب ہے، مبعض باندی کے لیے جس کا شوہر غلام ہو تو اپنی شادی فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے جب باندی کا بعض حصہ آزاد ہو جائے۔

مبعض کسی کا وارث نہیں بنتا، مبعض پر نہ حج فرض ہے اور نہ عمرہ، وہ خلیفہ یا قاضی یا ولی نہیں بن سکتا، اسی وجہ سے وہ آزاد ہونے والی باندی کے لیے کفو نہیں ہے، آزاد شخص مبعض باندی کے ساتھ شادی نہیں کرسکتا ہے، البتہ اگر آزاد کی شادی باندی کے ساتھ صحیح ہونے کی سبھی شرطیں پائی جائیں تو کرسکتا ہے۔

بعض مسائل میں مبعض آزاد کی طرح ہے، وہ یہ کہ غلام کے بدلے اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اور مال کے ذریعہ وہ کفارہ ادا کرسکتا ہے اگر وہ مالدار ہو وغیرہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مبعض جب کسی غلام کو قتل کرے تو اس کے بدلے قصاص میں مبعض کو قتل نہیں کیا جائے گا چاہے مقتول غلام مکمل غلام ہو یا مبعض ہو، مبعض مالی کفارات بھی دے سکتا ہے اگر اس کے پاس مال موجود ہو۔ یعنی اگر وہ قسم کھائے اور قسم کو توڑ دے تو وہ اس کا کفارہ مسکینوں کو کھلا کر یا ان کو کپڑا دے کر کرسکتا ہے، اس کے علاوہ وہ اپنے لیے مخصوص وقت میں یعنی آزاد حصہ کے اوقات میں سنت نمازیں ادا کرسکتا ہے، اس کے لیے اس وقت میں اپنے آقا کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اپنے وقت میں اس کے لیے خرید وفروخت صحیح ہے اور اس کی وصیت بھی صحیح ہے، وہ اپنے آزاد وقت میں جتنا کمائے گا وہ اس کے وارثین کو پہنچے گا، اور اپنے آقا کے لیے مخصوص وقت میں کمائے تو اس کی یہ کمائی آقا کے لیے ہوگی، مبعض کے اوقات کی تقسیم عمومی طور پر اس طرح ہوتی ہے کہ اپنے وقت کا ایک حصہ آقا کے لیے مقرر کرے اور ایک حصہ اپنے لیے مثلاً مبعض ایک دن کام اپنے لیے کرے اور ایک دن اپنے آقا کے لیے۔

ملکیت اور وراثت کے علاوہ میں اگر مبعض دوسرے مبعض کو قتل کردے تو اس پر مقتول کے آزاد حصہ کے بقدر دیت واجب ہوگی اور اس پر نصف دیت لازم آئے گی کیوں کہ اس میں غلام کا حصہ بھی ہے، یا آزاد اور غلام کے حصہ کے بقدر دیت تقسیم ہو جائے

گی، اگر اس کا آدھا غلام ہے تو اس سے نصف دیت لی جائے گی۔

مبعض اپنے آقا کے ساتھ مل کر طے کرلے کہ وہ ایک دن اپنے آقا کے لیے کام کرے گا اور ایک دن اپنے لیے۔ (''التہذیب'' بغوی ۸/۲۱۳) اگر مبعض اور اس کے آقا کے درمیان یہ اتفاق نہ ہو تو اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات اس کے آقا پر لازم ہوں گے، اگر اتفاق ہوا ہو تو جس دن اس کا انتقال ہوا اس دن کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر وہ اپنے لیے مخصوص دن میں انتقال کرجائے تو اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات اس کے مال سے پورے کیے جائیں گے، اگر وہ اپنے آقا کے لیے مخصوص دن میں انتقال کرجائے تو اس کی تجہیز وتکفین کی ذمے داری آقا کی ہوگی۔

قرعہ اندازی کے مسائل

قرعہ اندازی کے دوطریقے ہیں جن کی وضاحت مندرجہ ذیل مثال سے ہوجائے گی:
تین آدمی مساوی مساحت اور قیمت والی تین زمینوں کے سلسلہ میں قرعہ اندازی کرنا چاہتے ہیں جن کے نام حمید، مجید اور فرید ہیں،اس صورت میں تینوں کے نام الگ الگ پرچیوں پر لکھے جائیں گے اوران کو بندکر کے کسی ڈبے وغیرہ میں ڈال دیا جائے گا، پھر کسی بچے یاان پڑھ شخص کو پرچی نکالنے کے لیے کہا جائے گا،جس کا نام پہلے نکلے گا وہ پہلی زمین لے گا، دوسری مرتبہ جس کا نام نکلے گا وہ دوسری زمین لے گا اورجس کا نام باقی رہے گا، وہ زمین کا باقی حصہ لے گا۔

یا تینوں زمین کے نام پرچیوں پر لکھے جائیں اور پرچی اٹھائی جائے تو پہلی پرچی ان میں سے پہلے والے کے لیے ہوگی اوردوسری نکلنے والی پرچی دوسرے شخص کے لیے اورتیسری تیسرے کے لیے۔

مال میں قرعہ اندازی ہوتی ہے، یہ دومسئلوں میں ہوتا ہے:
تقسیم میں ملکیت سے آزادی کوممیّز کرنے میں:
مثلاً ایک آدمی کے تین غلام ہیں،اس نے مرض الموت میں ان تینوں کوآزادکردیا تو اس صورت میں تینوں کوآزادکرنے کا حق نہیں ہے،ان پر صرف ایک تہائی کی آزادی کا اصول منطبق ہوجائے گا اوران تینوں غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی،جس کے نام قرعہ نکلے گا اس کوآزادکر دیا جائے گا اور باقی دوغلام ہی رہیں گے،اسی طرح آزادی اورملکیت کے درمیان تفریق کرنے کے لیے قرعہ اندازی کا استعمال ہوجائے گا۔

اسی طرح تقسیم میں قرعہ اندازی ہوتی ہے۔

۔مال کے علاوہ دوسرے امور میں بھی قرعہ اندازی ہوتی ہے، وہ مندرجہ ذیل سات مسائل ہیں: (ان میں سے اکثر مسائل کا تذکرہ اس کتاب کے مختلف ابواب میں ہوا ہے)

ا۔ بیویوں کے درمیان باری تقسیم کرتے وقت: مثلاً ایک شخص سفر سے آئے اوراپنی بیویوں کے درمیان باری تقسیم کرنا چاہے تو چار بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کرسکتا ہے، جس کے نام قرعہ نکلے گا اس سے باری شروع کرے گا اوررات گزارے گا۔ (یہی مسلک کا صحیح قول ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ شوہر کواختیار رہے، دیکھا جائے ’’عجالۃ المحتاج‘‘ ابن ملقن ۳/۱۳۲۴)

۲۔اپنی بیویوں میں سے کسی کوسفر پر لے جانا چاہے تو وہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کرسکتا ہے، جس کے نام قرعہ نکلے گا اس کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے۔ (یہ طویل اور مختصر دونوں سفر کے لیے ہے۔طویل سفر کے سلسلہ میں بخاری (۵۲۱۱) وغیرہ کی حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کرتے‘‘۔البتہ چھوٹے اسفار کو قیاس کیا گیا ہے، کیوں کہ چھوٹے اسفار عام طور پر ہوتے رہتے ہیں اوران میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔دیکھا جائے ’’عجالۃ المحتاج‘‘ ۳۵/۱۳۲۷)

۳۔کسی لڑکی کے چار بھائی ہوں اوران میں سے ہرایک اپنی بہن کا نکاح کرانا چاہتا ہو اورولی بننے میں جھگڑا ہوجائے تو وہ کسی ایک کومنتخب کرنے کے لیے آپس میں قرعہ اندازی کرسکتے ہیں۔

۴۔قصاص لینے کی ولایت میں جب سبھی یکساں درجے کے ولی بنتے ہوں مثلاً مقتول کے چار حقیقی بھائی ہوں اوران میں ہرایک کہے کہ میں قاتل کوقتل کرنا چاہتا ہوں تو وہ آپس میں قرعہ اندازی کرسکتے ہیں،جس کے نام قرعہ نکلے گا وہی قاتل کوقتل کرے گا۔

۔کسی بنجر زمین کوزندہ کرنے کے لیے سلسلہ میں اختلاف ہوجائے مثلاً ایک بنجر زمین ہو اوردس افراد دعوی کریں کہ ان میں سے ہرایک اس کوآباد کرے گا تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی اورجس کے نام قرعہ نکلے گا اس کے حوالے زمین کی جائے گی۔

۶۔کسی ظاہری یا باطنی کان کوزندہ کرنے میں چندلوگوں کا جھگڑا ہوجائے مثلاً ایک

زمین کا ٹکڑا ہو جہاں ظاہری کان مثلاً نمک کی کان ہو یا باطنی مثلاً ماچس کی کان ہو اور دو لوگوں کا جھگڑا ہو جائے اور دونوں وہاں موجود دولت کے لیے اپنی ملکیت کا دعوی کریں تو اس صورت میں ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی، جس کے نام قرعہ نکلے گا وہ اس زمین اس کی ہوگی۔

۷۔ حاکم کے پاس دعوی کرنے کی صورت میں؛ مثلاً بیس لوگ حاکم کے پاس آئیں جن میں سے دس مدعی ہوں اور دس مدعی علیہ ہوں اور ان کے درمیان اختلاف ہو جائے کہ حاکم ان میں سے کس کا فیصلہ کرے گا تو اس صورت میں ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی، جس کے نام قرعہ نکلے گا حاکم اس کے دعوی کو پہلے سنے گا اور فیصلہ کرے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

اندھے کے احکام ومسائل

اس باب میں اندھوں کے مخصوص احکام بیان کیے گئے ہیں، اور اندھے اور بینا کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

۔اندھا سبھی احکام میں بینا کی طرح ہی ہے، البتہ بعض مسائل میں فرق ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۔اندھے پر جہاد نہیں ہے جیسا کہ اس فرمانِ الٰہی میں ہے: ''**لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ**'' (نور۶۱) (اندھے کے لیے کوئی حرج نہیں ہے) یعنی جہاد چھوڑنے میں۔

۔قبلہ کے سلسلہ میں وہ اجتہاد نہیں کرے گا، کیوں کہ قبلہ کے سبھی دلائل کا تعلق بصارت سے ہے۔ (البتہ وہ محراب کو چھو کر معلوم کرسکتا ہے، کیوں کہ کہ محراب کو قبلہ کی سمت معلوم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ''کفایۃ الاخیار'' ۱/۱۴۰)

۔اندھے کی خرید وفروخت صحیح نہیں ہے اور وہ سبھی امور صحیح نہیں ہیں جن میں دیکھنے کا اعتبار کیا جاتا ہے مثلاً ہبہ اور رہن، وہ ان سبھی امور میں کسی بینا کو اپنا وکیل بنائے گا۔

۔اس کی آنکھوں میں دیت نہیں ہے یعنی اگر کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو دیت نہیں ہے، بلکہ اس کو معاوضہ دیا جائے گا، یہ معاوضہ حاکم طے کرے گا۔

۔اس کی گواہی قبول نہیں ہے، اس سے پانچ مواقع مستثنی ہیں:

☆ ترجمہ اور سنانے میں، اس میں دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ترجمہ میں ایک زبان سے دوسری زبان میں باتوں کو منتقل کرنا ہے، یا مدعی اور مدعی علیہ کی باتوں کو قاضی کو سنانا ہے یا گواہ کی بات قاضی کو سنانا ہے۔

☆ ان امور میں جو معلومات سے ثابت ہوتے ہوں مثلاً نسب، عتق، موت، نکاح

اور وقف، یہ ایسے حالات و امور ہیں جو لوگوں کی معرفت سے ثابت ہوتے ہیں مثلاً زید محمود کا بیٹا ہے، یا احمد نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا ہے، یا محمود کی وفات فلاں سال ہوئی ہے، یا یہ کہ حامد نے سکینہ سے شادی کی ہے۔ یا یہ کہ باغ تقی نے فقراء پر وقف کیا ہے۔

☆ جو خبر اس نے اندھا ہونے سے پہلے حاصل کی ہو، اگر مشہود لہ یعنی جس کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے۔ اور مشہود علیہ یعنی جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہو، دونوں کا نام اور نسب معروف ہو، کیوں کہ اس گواہی کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے کہ یہ گواہی اس کے مفاد میں ہے۔

☆ اندھا اقرار کرنے والے کو پکڑ لے اور اس کے خلاف قاضی کے پاس گواہی دے۔ مثلاً کوئی شخص اندھے کے کان میں چپکے سے کہے: وہ فلاں کا دس ہزار روپیوں کا قرض دار ہے۔ یہ کہتے ہی اندھا اس کو پکڑ لے اور اس سے کہے: میں تم کو ضرور قاضی کے پاس لے جاؤں گا تا کہ میں اس اقرار کی گواہی اس کے پاس دوں۔ اس صورت میں اس کی گواہی اس اقرار کے تعلق سے قبول کی جائے گی۔

۔ اس کو تنہا موذن بنانا مکروہ ہے کیوں کہ وہ کبھی وقت کے بارے میں غلطی کر سکتا ہے، اگر کوئی بینا اذان دینے میں اس کا رفیق ہو تو مکروہ نہیں ہے یعنی وہ بینا اندھے کو وقت شروع ہونے کے بارے میں بتا دے تو اس صورت میں اندھے کا اذان دینا مکروہ نہیں ہے۔ مثلاً ابن ام مکتوم نبی اکرم ﷺ کی مسجد کے بلال کے ساتھ موذن تھے، بلال بینا تھے، جب کہ ام مکتوم اندھے تھے۔

۔ اندھے پر جمعہ فرض نہیں ہے کیوں کہ جمعہ میں شریک ہونے سے اس کو نقصان ہوتا ہے، اگر جمعہ مسجد دور رہو، اگر مسجد قریب ہو اور وہ اپنے ڈنڈے کے ذریعہ محسوس کر کے پہنچ سکتا ہو تو اس پر جمعہ فرض ہے، یا وہ کسی کو اپنا رہبر اجرت دے کر رکھ سکتا ہو تو اس پر فرض ہو جاتا ہے۔

۔ اندھے پر حج فرض ہونے کے لیے اس کا رہبر رہنا ضروری ہے، اس کے ساتھ رہبر کا توشہ اور سواری بھی ضروری ہے:

اندھے کے لیے رہبر عورت کے حق میں محرم رہنے کی طرح ہے، کیوں کہ رہبر اس

کو چڑھنے اور اترنے میں مدد کرتا ہے، چاہے جانور پر ہو یا گاڑی یا ہوائی جہاز پر، اسی طرح وہ اس سے عصا لیتا ہے، یہ رہبر بطور مدد کے بھی خدمات انجام دے سکتا ہے یا اجرت پر اگر اندھے کے پاس دینے کے لیے مال ہو، یا رہبر اس کا غلام ہو۔

جہاد میں شریک ہونے والے تنخواہ دار مجاہدین میں اس کا نام لکھا نہیں جا سکتا، کیوں کہ اندھے پر جہاد نہیں ہے، اس وجہ سے اس کا نام مجاہدین کے رجسٹر میں نہیں لکھا جائے گا۔

۔ کفارہ میں اندھے غلام کو آزاد نہیں کیا جائے گا کیوں کہ جن کفارات میں غلام یا باندی آزاد کرنا ضروری ہوتا ہے تو ان میں اندھے غلام کو آزاد کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ غلام کا عیوب سے پاک رہنا ضروری ہے۔

۔ اندھے کے ذمے بچے کی پرورش اور حضانت کی ذمے داری نہیں کی جائے گی مثلاً باپ اندھا ہو یا ماں اندھی ہو جب وہ تنہا بچے کی پرورش کے ذمے دار ہوں۔

۔ اندھے کا ذبیحہ مکروہ ہے، یعنی وہ ذبیحہ مکروہ ہے جس کو اندھا ذبح کرے کیوں کہ وہ حیوان یا پرندے کو ذبح کرنے کی جگہ کی تعیین نہیں کر سکتا ہے۔

۔ تیر اندازی یا جانور کے ذریعہ اس کا شکار حرام ہے۔

کیوں کہ اندھا شکار پر تیر چلانے کے بجائے انسان پر تیر چلا سکتا ہے، اسی طرح جانور مثلاً شکاری کتے کے ذریعہ بھی اندھے کا شکار کرنا حرام ہے کیوں کہ وہ انسان پر بھی کتا چھوڑ سکتا ہے۔

۔ اس کا قاضی ہونا جائز نہیں ہے اور نہ خلیفہ بننا، کیوں کہ یہ گواہی کی طرح ہے، اسی طرح وہ زکوۃ کی وصولی کرنے والا، پھلوں کا اندازہ لگانے والا اور تقسیم کرنے والا نہیں بن سکتا ہے جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

باندیوں کی اولاد اور جانوروں کے چھوٹے بچوں کے احکام ومسائل

۔مکاتب باندی کی کتابت کے معاہدہ کے بعد ہونے والی اولاد آزادی اور غلامی میں اس کے تابع ہے:

جو باندی اپنے آقا کے ساتھ کتابت کا معاہدہ کرے تو یہ معاہدہ ہونے کے بعد والے بچے اپنی ماں کے تابع ہوں گے، اگر ان کی ماں اپنے معاہدہ کتابت کی قسطوں کو ادا کرنے سے عاجز ہو اور وہ دوبارہ باندی بن جائے تو اس کے بچے بھی آقا کے غلام بن جائیں گے ۔اگر ماں معاہدہ کی قسطوں کو ادا کرے تو اس کے بچے آزاد ہو جاتے ہیں جس طرح ام ولد کا معاملہ ہے جو اپنے آقا کی موت کے بعد آزاد ہو جاتی ہے اور اس کے بچے بھی تابع بن کر آزاد ہو جاتے ہیں، البتہ ام ولد کے بچوں اور مکاتب باندی کے بچوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ام ولد کا انتقال اپنے آقا کی زندگی میں ہو جائے یعنی باندی ہونے کی حالت میں ہی تو بھی اس کا بیٹا اپنے آقا کی موت کے بعد آزاد ہو جاتا ہے، البتہ مکاتب باندی کا بیٹا اس صورت میں آزاد نہیں ہوتا ہے۔

۔قربانی کے جانور اور ہدی کے جانوروں کی اولاد جن کی قربانی متعین کی گئی ہو تو ان کی قربانی ضروری ہے:

یعنی جس قربانی اور ہدی کے جانور کو مکہ میں لے جا کر قربانی کرنا متعین کیا جائے تو اس کے بچہ کی قربانی واجب ہے جب قربانی کا جانور مکہ میں ذبح کیے جانے سے پہلے مر جائے، اگر مکہ مکرمہ میں قربانی کا جانور ذبح کیا جائے تو اس کے بچے مالک کے ہوں گے۔

مثلاً کوئی شخص کہے: یہ قربانی کا جانور ہے۔ چاہے وہ اونٹ ہو یا گائے ہو یا مینڈھا،

اس نیت سے مکہ مکرمہ میں قربانی کے دنوں میں جانور کو ذبح کرنا اور اس کو گوشت فقراء میں تقسیم کرنا واجب ہے اور قربانی کرنے والا اس میں سے نہیں کھا سکتا ہے۔

یا کوئی کہے: میں نے اس جانور کو قربانی کا بنایا تو قربانی کے دنوں میں اس جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے۔ یا کہے: یہ قربانی کا جانور میرے ذمے ہے۔ یا کہے: اللہ کی خاطر مجھ پر ضروری ہے کہ میں اس بکری کی قربانی کروں۔ ان چار صورتوں میں قربانی واجب ہوتی ہے۔ اگر قربانی کے متعین جانور کے ساتھ اس کے بچے کو بھی ذبح کرے تو وہ بچے کا گوشت کھا سکتا ہے۔ اگر جانور مر جائے تو وہ اس کے بدلے قربانی کے جانور کے بچے کو ذبح کر سکتا ہے، لیکن اس صورت میں وہ اس کا گوشت نہیں کھا سکتا۔

۔بیچے جانے والی باندی کا حمل یا جانور کا حمل اس کے تابع ہے، کیوں کہ یہ بیچے جانے والی ہے اور اس کے مقابلہ میں قیمت بھی طے کی جائے گی کیوں کہ یہ معلوم چیز ہے۔

باندی کا حمل اور جانور کا حمل خرید وفروخت میں اس کے تابع ہے، اگر باندی کو ایک ہزار درہم سے بیچا جائے اور وہ حاملہ ہو تو وہ اور اس کا حمل اس کے نئے آقا کی ملکیت ہے۔ اگر حاملہ اونٹنی کو بیچا جائے تو وہ اور اس کا حمل خریدنے والے کی ملکیت ہے۔ اس وجہ سے قبضہ سے پہلے باندی کا حمل یا اونٹنی کا حمل ساقط ہو جائے یعنی قیمت کی ادائیگی سے پہلے تو مشتری کو گرے ہوئے حمل کے بدلے قیمت کا ایک حصہ کم کرنے کا اختیار ہے۔ اگر بیچنے والا کہے: اس نے باندی یا اونٹ کو اس کے حمل کے بغیر بیچا تھا تو یہ خرید وفروخت صرف ماں کی ہوگی چاہے باندی ہو یا جانور۔

۔رہن میں رکھی ہوئی باندی، مجرم باندی، اجرت پر دی ہوئی اور عاریت پر دی ہوئی باندی کا بچہ اس کے تابع نہیں ہے:

مادہ جانور جو رہن میں رکھا ہوا ہو تو اس کا حمل اس کے تابع نہیں ہے، اسی طرح رہن میں رکھی ہوئی باندی کا حمل بھی اس کے تابع نہیں ہے، اگر باندی کوئی جرم کرے یا مادہ جانور سے کوئی جرم ہو جائے تو ان دونوں کا حمل ان کے تابع نہیں ہے، عاریت میں دی ہوئی

باندی کا حمل اور عاریت پر دیے ہوئے جانور کا حمل اس کے تابع نہیں ہے۔

۔باندی اور مادہ جانور اس وقت اپنی ماں کے تابع نہیں ہے جب یہ حمل وصیت اور وصیت کرنے والے کی وفات کے درمیان مکمل ہوا ہو؛ چاہے ولادت وصیت کرنے والے کی موت سے پہلے ہو یا اس کے بعد: اعتبار اس تاریخ کا ہوتا ہے جس میں اس بچہ کا نطفہ ٹھہرا ہو، اور یہ بچہ وصیت کرنے والے اور اس کے بعد اس کے وارثین کے لیے ہے، اگر باندی موصی لہ (یعنی جس کے حق وصیت کی گئی ہے) کے حوالے ہونے کے بعد حاملہ ہو جائے تو موصی لہ اس کا بھی مالک ہوتا ہے اور اس کے حمل کا بھی جب اس کو بچہ ہو جائے۔ یہی حکم مادہ جانور کا بھی ہے۔ یہی حکم اس وقت بھی ہے جب مالک اپنی باندی یا مادہ جانور کو ہبہ کرے اور وہ حاملہ ہو تو حمل بھی ہبہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

۔فائدہ: جب باپ ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع کرے تو ہبہ کے بعد ٹھہرنے والے حمل میں رجوع نہیں کرے گا جو قبضہ کے بعد پیدا ہوا ہو۔

۔غصب کیے ہوئے جانور، عاریت پر دیے ہوئے اور فاسد بیع کے ذریعہ قبضہ میں لیے ہوئے جانور کا بچہ، اور بیع قبضہ سے پہلے، ان صورتوں میں حمل ضمانت میں اپنی ماں کے تابع ہے:

اگر کوئی شخص مادہ جانور غصب کرے تو اس کی قیمت کا ضامن بنتا ہے اور اگر وہ حاملہ ہے تو اس کے حمل کی قیمت کا بھی ضامن بنتا ہے، اسی طرح اگر کوئی خدمت کے لیے باندی کو عاریت پر لے یا مادہ جانور کو اس کے دودھ سے فائدہ اٹھانے کے لیے لے تو وہ باندی اور اس کے پیٹ میں موجود حمل کا ضامن ہوتا ہے، اسی طرح فاسد بیع کے ذریعہ قبضہ میں آنے والی حاملہ باندی اور حاملہ جانور کو خریدے تو وہ حمل کا بھی ضامن بنتا ہے، مثلاً اس کی قیمت میں شراب ادا کرے، اگر حاملہ باندی یا حاملہ مادہ جانور قبضہ سے پہلے اور بیع مکمل ہونے کے بعد مر جائے تو بیچنے والا اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

اصول یہ ہے کہ ”جو ماں کا ضامن ہوتا ہے تو وہ خرید وفروخت وغیرہ میں اس کے حمل کی قیمت کا بھی ضامن بنتا ہے مثلاً ضائع ہو جائے، غصب کرے، عاریت پر لے یا فاسد

بیع کے ذریعہ قبضہ کرے، بیچنے والا بھی اس کے حمل کی قیمت کا ضامن ہوتا ہے اگر عاریت کی مدت کے دوران اس کا حمل ساقط ہو جائے۔ جب باندی کو عاریت میں دیا جائے اور اس کو بچہ ہو جائے اور عاریت لینے والے کے اختیار میں بچے کو اس کے مالک کے پاس لوٹانے کی قدرت ہو اور نہ لوٹائے تو وہ اس کی قیمت کا ضامن بنے گا۔

۔مرتد میاں بیوی کا بچہ اگر حالت ارتداد میں ہوا اور اس کے والدین مرتد ہی رہیں تو وہ ان کے تابع مرتد ہی ہوتا ہے، اگر وہ ارتداد سے پہلے ہوا ہو یا ارتداد کی حالت میں اور اس کے اصول میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو وہ مسلمان ہے:

مثلاً جورج کے والد اور والدہ دونوں مرتد ہیں، لیکن اس کے والد کے دادا مسلمان ہیں، یا وہ مسلمان ہے تو اس صورت میں اس بچے کو مسلمان مانا جائے گا، کیوں کہ اسلام بلند ہوتا ہے اور اس پر کسی کو بلندی نہیں ہے۔ اگر اس کا باپ کافرِ اصلی ہو اور اس کی ماں مرتد ہو تو اس بچے کو کافرِ اصلی مانا جائے گا، ان احکام کی تفصیلات ماں باپ کی طرف بچے کے انتساب کے سلسلہ میں گزر چکی ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

خاتمہ

’’قُلْ هُوَاللّٰهُ أَحَدٌ ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ ،لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ،وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ‘‘۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ’’دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں، میزان میں بھاری ہیں اور رحمان کے بڑے پسندیدہ ہیں: سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم‘‘۔ بخاری ومسلم نے یہ روایت کی ہے۔(بخاری: کتاب الدعوات، باب فضل التسبیح ۶۰۵۱، مسلم: کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب فضل التہلیل والتسبیح والدعاء ۴۹۶۶)

امام شیخ الاسلام زکریا انصاری کی کتابوں اور ان پر لکھے گئے حواشی سے استفادہ کر کے فقہاء کے اقوال کو نقل اور جمع کرنے کا کام مکمل ہو گیا۔ (ان میں سے اہم کتابیں ’’اسنی المطالب شرح روضۃ الطالب‘‘ اور ’’فتح الوھاب بشرح منہج الطلاب‘‘ ہیں) اللہ ان سبھوں کو جزاء خیر عطا فرمائے، جو بھی بات صحیح ہے تو ان کی طرف سے ہے اور جو غلطی ہوئی ہے وہ میری طرف سے ہے۔ اللہ تعالی ان کو دو گنا اجر عطا فرمائے۔

میں اللہ سبحانہ وتعالی کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ اپنے فضل وکرم اور احسان سے اس متواضع کام کو قبول فرمائے، مجھے، میرے والدین، میری اولاد اور میرے دوست واحباب اور جمیع مسلمانوں کو معاف فرمائے۔ وہی میرے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے، وہ بہترین مولی اور بہترین مددگار ہے۔

درود وسلام ہو رحمت للعالمین، امام المتقین، شفیع المذنبین، صاحبِ مقام محمود، قیامت کے دن شفاعتِ عظمی کے حق دار محمد ﷺ پر اور آپ کے پاکیزہ اہل وعیال اور صحابہ کرام اور قیامت تک ان کی بہترین پیروی کرنے والوں پر۔

اس کام کی تکمیل بروز پیر صبح سوا گیارہ بجے ۷ رمضان المبارک ۱۴۱۸ ہجری بلدِ حرام مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

والحمد للّٰہ رب العالمین، جس کے سوا کوئی پروردگار نہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرا بھروسہ کے لائق نہیں، وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ والتابعین عددما کان ویکون۔

مراجع

١-الابتهاج في بيان اصطلاح المنهاج: أحمد بن ابي بكر بن سُمَيْط، نسخة مطبوعة في المجلد الأول من النجم الوهّاج للدميري.

٢-الإجماع: ابن المنذر، دارالكتب العلمية، بيروت، ط١، ١٩٨٥م.

٣-أحاديث المختارة: الضياء المقدسي، محمد بن عبد الواحد الحنبلي، تحقيق عبدالملك بن عبدالله بن دهيش، مكتبة النهضة الحديثة، مكة المكرمة، ط١، ١٤١٠ه.

٤-أحكام القرآن: أبو بكر بن العربي، تحقيق علي محمد البجّاوي، دارالمعرفة، بيروت، ١٩٧٢م.

٥-إحياء علوم الدين: الإمام الغزالي، دارالفكر، بيروت، ط٣، ١٩٩١م.

٦-أدب القضاء: ابن أبي الدم الحموي، تحقيق د، محمد مصطفى الزحيلي، دار الفكر، دمشق، ط٢، ١٩٨٢م.

٧-الأذكار: الإمام النووي، تحقيق أحمد راتب حموش، دار الفكر، دمشق، ط١، ١٤٠٣هـ = ١٩٨٣م.

٨-أساس البلاغة: أبوالقاسم الزمخشري، دارصادر، بيروت، ط١، ١٩٩٢م.

٩-أسنى المطالب: شيخ الإسلام زكريا الانصاري، مصوَّرة بيروت عن الطبعة الميمنية بمصر.

١٠-أصول الفقه الإسلامي: الدكتور وهبة الزحيلي، دار الفكر، دمشق، ط١، ١٤٠٦هـ ١٩٨٦م.

١١-إعانة الطالبين على حلّ ألفاظ فتح المعين: الشيخ بكري شطا، مصوَّرة دار الفكر ببيروت عن الطبعة المصرية القديمة.

١٢-إعلام الساجد بأحكام المساجد: بدر الدين الزركشي، تحقيق مصطفى

المراغي، لجنة احياء التراث الاسلامي، وزارة الاوقاف ،مصر ٢، ١٩٨٢م.

١٣-الإعلام: خير الدين الزركلي، دار العلم للملايين، بيروت، ط١١، ١٩٩٥م.

١٤-الإقناع فى حل ألفاظ أبى شجاع :الشربينى الخطيب، دار الخير، بيروت . دمشق، بدون تاريخ.

١٥-إكمال المعلم بفوائد مسلم : القاضى عياض ، تحقيق د-يحى اسماعيل ، دارالوفاء المنصورة، ط١، ١٩٩٨م.

١٦-الأم :الإمام الشافعى ، بعناية محمد زهرى النجار ،دارالمعرفة ،بيروت، بدون تاريخ.

١٧-الأنساب :الإمام السمعاني، تقديم وتعليق عبدالله البارودى، دارالكتب العلمية ، بيروت ، ط١، ١٩٨٨م.

١٨-أنيس الفقهاء: قاسم بن عبدالله بن أمير على القونوى الرومى الحنفى، تحقيق د-احمد بن عبد الرزاق الكبيسى ، دار الوفا-جدة الطبعة الاولى، ١٤٠٦ه.

١٩-الإيضاح فى المناسك :الإمام النووى ، ومعه حاشية الشيخ عبد الفتاح حسين راوه المكى المسمّاة:الإفصاح على مسائل الإيضاح ، دار البشائر الإسلامية ببيروت والمكتبة الامدادية بمكة المكرمة ،ط ،١٤١٤ه - ١٩٩٤م.

٢٠-البحر الرائق شرح كنز الدقائق : ابن نجيم الحنفى ، مصورة بيروت عن الطبعة المصرية القديمة.

٢١-البحر المحيط فى أصول الفقه : بدرالدين الزركشى ، تحقيق د-محمد محمد تامر -دار الكتب العلمية ،بيروت ، ط١، ٢٠٠٠م.

٢٢-بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع : الإمام علاء الدين الكاسانى ، تحقيق محمد عد نان درويش ،دار إحياء التراث العربى ، بيروت ،ط٢، ١٩٩٨م.

٢٣-بداية المجتهد :ابن رشد ،تحقيق يوسف المر عشلى وعد نان حلاق ، عالم الكتب ،بيروت،ط١، ١٩٨٧م.

٢٤-البداية والنهاية :ابن كثير الدمشقى ، مكتبة المعارف ،بيروت ،١٩٩٠م.

٢٥ـبشرى الكريم بشرح مسائل التعليم (المقدمة الحضرمية):الشيخ سعيدبن محمد باعشن الحضرمى ،مكتبة الثقافة بعدن ،دون تاريخ.
٢٦ـتاريخ بغداد :الخطيب البغدادى ، المكتبةالسلفية ،المدينة ،بدون تاريخ.
٢٧ـتبيين الحقائق شرح كنز الدقائق :فخر الدين الزيلعى ،دار الكتاب الاسلامى ،ط ٢، بدون تاريخ.
٢٨ـتحفة المحتاج :ابن حجر الهيتمى ،مصورة دار الفكر ببيروت عن الطبعة المصرية القديمة.
٢٩ـالترغيب والترهيب :الإمام المنذرى،تحقيق وتخريج أيمن صالح ،دار الحديث ، القاهرة ، ط١، ١٩٤٤م.
٣٠ـالتقريرات السديدة فى المسائل المفيدة (قسم العبادات):حسن أحمد الكاف ، دارالعلم والدعوة ، تريم حضر موت ، ط ١، ١٤٢٣هـ ـ٢٠٠٣م.
٣١ـالتلخيص الحبيرفى تخريج أحاديث الرافعى الكبير :ابن حجر العسقلانى ،عنى بتصحيحه السيد عبدالله هاشم المدنى ، دار المعرفة ، بيرو ت ، بدون تاريخ.
٣٢ـالتهذيب فى الفقه الشافعى :الإمام البغوى ، الحسين بن مسعود ،تحقيق عادل عبدالموجود وعلى معوض ،دار الكتب العلمية ، بيروت ،ط ١، ١٩٩٧م.
٣٣ـالتهذيب فى علم الفرائض والوصايا:أبو الخطاب الكلوذانى ، حققه وعلق عليه محمد أحمد المولى،مكتبة العبيكان ،ط١، ١٩٩٥م.
٣٤ـالتوقيف على مهمات التعاريف :عبد الرؤوف المناوى ، تحقيق دـمحمد رضوان الداية ، دارالفكر ، دمشق ،ط١، ١٩٠٠.
٣٥ـجامع البيان عن تأويل آى القرآن :محمد بن جرير الطبرى ، دارالفكر، بيروت ، ١٩٨٨م.
٣٦ـالجامع لأحكام القرآن :الإمام القرطبى دار إحياء التراث العربى ،بيروت ،١٩٨٥م.
٣٧ـحاشية الباجورى على شرح ابن قاسم :الشيخ إبراهيم الباجورى ، دار الفكر ،بيروت ، بدون تاريخ.
٣٨ـحاشية البجيرمى على الإقناع فى حل ألفاظ أبى شجاع : الشربينى

الخطيب،مصورة بيروت عن الطبعة المصرية القديمة.
٣٩ـحاشية قليوبى وعميرة : الإمام القليوبى ، مكتبة الإيمان ، المنصورة ، بدون تاريخ.
٤٠ـالحاوى الكبير :الإمام أبى الحسن على بن محمد الماوردى ،دار الفكر، بيروت ، ط١، ١٩٩٤م.
٤١ـ حلية العلماء فى معرفة مذاهب الفقهاء : القفال الشاشى،مؤسسة الرسالة ،دارالارقم.
٤٢ـ الخزائن السنية من مشا هير الكتب الفقهية لأئمتنا الفقها ء الشافعية :عبد القادر بن عبد المطلب المنديلى الإند ونيسى ،اعتنى به عبدالعزيز بن السا يب ، مؤسسة الرسالة ، بيروت ،ط١، ١٤٢٥هـ ـ٢٠٠٤م.
٤٣ـخزانة الادب : عبد القادر البغدادى ، تحقيق وشرح عبد السلام هارون، مكتبة الخانجى ، القاهرة ،ط ٣، ١٩٨٩م.
٤٤ـالخصائص الكبرى :الإمام السيوطى ،دار الكتا ب العربى ، بيروت ،بدون تاريخ.
٤٥ـخلاصة الأثر فى أعيان القرن الحادى عشر :محمد المحبى ،دار صادر، بيروت ،بدون تاريخ.
٤٦ـ دقائق المنهاج :الإمام النووى ،تحقيق إيا د أحمد الغوج ،دار ابن حزم، بيروت ،١٩٩٦م.
٤٧ـدلائل النبوة :أبو بكرالبيهقى ،تحقيق د،عبد المعطى قلعجى ، دار الريان، القاهرة ،ط١، ١٩٩٨م.
٤٨ـديوان النابغة الذبيانى : تحقيق محمد أبوالفضل إبراهيم،دار المعارفـ القاهرة ،١٩٨٥ م.
٤٩ـالذخيرة : الإمام القرافى ، تحقيق دـمحمد حجى ،دار الغرب الإسلامى، بيروت ،ط ١، ١٩٩٤م.
٥٠ـروضة الطالبين :الإمام النووى ،بحاشية البلقينى ،المكتبة ا لتجارية، مكة المكرمة، دار الفكر بيروت، بدون تاريخ.
٥١ـالزواجر عن اقتراف الكبائر :ابن حجر الهيثمي، دارالمعرفة، بيروت، ١٩٨٨م.
٥٢ـسبل السلام شرح بلوغ المرام: الأمير الصنعاني، دار الفكر، بيروت، ١٩٨٨م.

٥٣ـسلّم المتعلِّم المحتاج إلى معرفة رموز المنهاج: أحمدشميلة الأهدل، طبعة خاصة مصورة من خط اليد.
٥٤ـسنن ابن ماجه : نشرة محمد فؤادعبد الباقي، المكتبة العلمية، بيروت، بدون تاريخ.
٥٥ـسنن الترمذى :تحقيق أحمد محمد شاكر ومحمد فؤاد عبد الباقي، دار الكتب العلمية، بيروت، بدون تاريخ.
٥٦ـسنن الدارقطنى:على بن عمر ، عنى بتصحيحه السيد عبداللّٰه هاشم المدني، دار المحاسن، القاهرة، ط١، ١٣٨٦هـ
٥٧ـسنن الدارمى :تحقيق فوّاز زمرلى و خالد السبع العلمي، دارالكتاب العربي، بيروت، ط١،١٤٠٧ه.
٥٨ـالسنن الكبرى :الإمام البيهقى،دار المعرفة ، صورة عن الطبعة الهندية، ١٩٩٢م.
٥٩ـسنن النسائي بحاشية السندي :دارالكتاب العربي ،بيروت، بدون تاريخ.
٦٠ـالسنن: أبوداود السجستانى، دراسة وفهرسة كمال الحوت، دارالجنان، بيروت ،ط١، ١٩٨٨م.
٦١ـسهم الالحاظ فى وهم الألفاظ : ابن الحنبلى،محمد بن إبراهيم ،تحقيق د. حاتم صالح الضامن ،عالم الكتب ،بيروت ،١٩٨٧م.
٦٢ـسير أعلام النبلاء: شمس الدين الذهبي، تحقيق شعيب الأرنؤوط وآخرين، مؤسسة الرسالة، بيروت ، ط٩،١٩٩٣م.
٦٣ـالسيرة النبوية: ابن هشام، تحقيق محمد محيُّ الدين عبدالحميد، دارالفكر، بيروت، ١٩٨١م.
٦٤ـشرح الرحبية في الفرائض: سبط ابن المارديني، تحقيق كمال يوسف الحوت، مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت، ط٢، ١٩٩٣م.
٦٥ـالشرح الكبير (فتح العزيز شرح الوجيز): الإمام أبوالقاسم الرافعي، تحقيق عادل عبدالموجود و علي معوّض، دار الكتب العلمية، بيروت، ط١، ١٤١٧هـ = ١٩٩٧م.
٦٦ـالشرح الكبير: الإمام الدردير، أبوالبركات أحمد بن محمد العدوي، مصوَّرة بيروت عن الطبعة المصرية.

٦٧ـشرح معاني الآثار: أبوجعفر الطحاوي، حقّقه و علّق عليه محمد زهري النجار، دارالكتب العلمية، بيروت، ط١، ١٩٧٩م.
٦٨ـالشفا بتعريف حقوق المصطفىﷺ: القاضي عياض، دارالكتب العلمية، بيروت، ط٢، ٢٠٠٢م.
٦٩ـالصحاح: إسماعيل بن حمّاد الجوهري، تحقيق أحمد عبد الغفور عطّار، دارالعلم للملايين.بيروت،ط٣،١٩٨٤مـ
٧٠ـصحيح ابن خزيمة :تحقيق شعيب الأرناؤوط،مؤسسة الرسالة ، بيروت ، ط،١٩٩٣م ـ
٧١ـصحيح ابن خزيمة : تحقيق د.محمد مصطفى الأعظمى ،المكتب الإ سلامى ، ط٢،١٩٩٢ـ
٧٢ـصحيح مسلم بشرح النووى : دار الحديث،القاهرة ،ط١،١٩٩٤مـ
٧٣ـالضوء اللامع لاهل القرن التاسع : شمس الدين السخاوى،منشورات مكتبة الحياة ،بيروت ، بدون تاريخ ـ
٧٤ـضوء المصابيح فى صلاة التراويح : تقى الدين السبكى ، مخطوط، نسخة الخزانة السليمانية باسطنبول ـ
٧٥ـطبقات الشافعية الكبرى : تاج الدين السبكى ، تحقيق محمود الطناحى وعبد الفتاح الحلو، دار إحياء الكتب العربية ، القاهرة ، بدون تاريخ ـ
٧٦ـطبقات الفقهاء الشافعية : ابن قاضى شهبة ، تحقيق د ـعلى محمد عمر، مكتبة الثقافة الدينية ، القاهرة ،بدون تاريخ ـ
٧٧ـالطبقات الكبرى :محمد بن سعد،بعناية احسان عباس،دارصادر ، بيروت،بدون تاريخ ـ
٧٨ـعجائب الآثار فى التراجم والأخبار:عبد الرحمن الجبرتى ، تحقيق د.عبد الرحيم عبدالرحمن،الهيئة المصرية العامة للكتاب،٢٠٠٣مـ
٧٩ـعجالة المحتاج إلى توجيه المنهاج :سراج الدين بن الملقن ،تحقيق هشام البدرانى ، دارالكتاب، الأردن ،ط١ ٢٠٠١مـ
٨٠ـعمدة السالك وعدة الناسك :شهاب الدين بن النقيب المصرى ،تحقيق

صالح مؤذن ،ومحمد غیاث الصباغ ،مکتبة الغزالی ، ط۲، ۱۹۹۰م۔
۸۱۔غریب الحدیث: أبو عبید القاسم بن سلام ،تحقیق د۔محمد عبدالمعید خان ،طبعة حیدر آباد الدکن ، ۱۹٦٤م۔
۸۲۔فتاوی الرملی :بهامش الفتاوی الکبری الفقهیة لابن حجر الهیثمی، مؤسسة التاریخ العربی ، بیروت ،بدون تاریخ ۔
۸۳۔فتاوی السبکی :تقی الدین السبکی ، تحقیق حسام الدین القدسی ، دار الجیل ، ط۱ ،۱۹۹۲م۔
۸٤۔فتاوی العلائی: الحافظ العلائی،تحقیق عمر حسن القیام ، دارالفتح للدراسات والنشر ،الأردن ،ط۱، ۲۰۰۹م۔
۸۵۔فتح الوهاب بشرح منهج الطلاب :شیخ الإسلام زکریا ، دارالفکر، بیروت، بدون تاریخ ۔
۸٦۔فتح باب العنایة:ملّاعلی القاری،اعتنی به محمد نزار تمیم وهیثم نزار تمیم، دارالأرقم ، بیروت ،ط۱،۱۹۹۷م۔
۸۷۔الفوائد المکیة فیمایحتاجه طلبةالشافعیة (ضمن :مجموعة سبعة کتب مفیدة) السید علوی ابن احمدالسقاف،مطبعة البابیی الحلبیی وأولاده بمصر،۱۹٤۰م۔
۸۸۔القاموس الفقهی لغة واصطلاحاً:سعدی ابوجیب ،دار الفکر ،دمشق ،ط۳،۱۹۹۳م۔
۸۹۔القاموس المحیط: الفیروز آبادی ،مؤسسة الرسالة ،بیروت،ط۱،۱۹۹٦م۔
۹۰۔القواعدفی الفقه الإسلامی :ابن رجب الحنبلی ،تحقیق طه عبدالرووف سعد ،دار الکتب العلمیة ،بیروت،ط۱،۱۹۹۲م۔
۹۱۔الکافی :ابن قدامةالمقدسی ،المکتب الإسلامی ،بیروت،ط۵،۱۹۸۸م۔
۹۲۔کفایة الأخیار فی حلّ غایة الاختصار :تقی الدین الحصنی ، مؤسسة الرسالة،ط۱، ۲۰۰۰م۔
۹۳۔الکواکب السائرة بأعیان المئة العاشرة :نجم الدین الغزیی، تحقیق د۔جبرائیل جبور، دار الآفاق الجدیدة،بیروت ،ط۲،۱۹۷۹م۔
۹٤۔اللباب فی الفقه الشافعی :الإمام ابوالحسن المحاملی ،تحقیق عبد الکریم

العمری،دارالبخاری ،المدینة المنورة ،ط۱،۱٤۱٦ھ۔
۹۵۔لسان العرب:ابن منظور الأفریقی،دار صادر ،بیروت،بدون تاریخ۔
۹٦۔لطائف الاشارات فی شرح نظم الورقات :الشیخ عبد الحمیدقدس المکّیی ،مطبعة مصطفی البابی الحلبیی واولاده بمصر۔
۹۷۔المبدع فی شرح المقنع :ابن مفلح الحنبلی ،المکتب الإسلامی ،بیروت ،۱۳۹۳ھ۔
۹۸۔المجموع شرح المهذب :الإمام النووی ،مصوّرة دار الفکر بیروت عن الطبعة المنیرة بمصر،دون تاریخ ۔
۹۹۔المحررالوجیز:ابن عطیة الأندلسی ،تحقیق عبدالسلام شاهین ،دارالکتب العلمیة ،بیروت ،ط۱،۱۹۹۸م۔
۱۰۰۔المخصّص: ابن سیده ،تحقیق خلیل ابراهیم، دارإحیاء التراث العربی، بیروت ،ط۱،۱۹۹٦م۔
۱۰۱۔مراتب الإجماع :ابن حزم الأندلسی ،دار الکتب العربی ، بیروت ،ط۳،۱۹۸۵م۔
۱۰۲۔المستدرك علی الصحیحین : الإمام الحاکم ،دار المعرفة ،بیروت، بدون تاریخ ۔
۱۰۳۔مسند أبی عوانة :یعقوب بن اسحاق الأسفرایینی ،تحقیق أیمن عارف الدمشقی ،دار المعرفة ،بیروت ،ط۱،۱۹۹۸م۔
۱۰٤۔مسند ابی یعلی الموصلی :تحقیق حسین اسد ،دار المأمون للتراث ، دمشق،الطبعة الأولی ،۱٤۰٤ھ۔
۱۰۵۔مسند الإمام أحمد بن حنبل : تحقیق شعیب الأرنؤوط وآخرین، مؤسسة الرسالة ،بیروت ،ط۱،۱۹۹۳م۔
۱۰٦۔مسند البزار :تحقیق محفوظ الرحمن زین الله، مکتبة العلوم والحکم ، المدینة المنورة ، ط۱،۱۹۸۸م۔
۱۰۷۔مسند الشافعی :دار الکتب العلمیة ، بیروت ط۱،۱۹۸۰م۔
۱۰۸۔مشکل الوسیط : ابن الصلاح ۔منشوربضمیمة الوسیط فی المذهب للإمام الغزالی، حققه وعلّق علیه أحمد محمود إبراهیم ومحمد محمد تامر، دار السلام ،القاهرة ،۱۹۹۷م۔
۱۰۹۔مصباح الزجاجة فی زوائد ابن ماجه : الشهاب البو صیری ،تحقیق موسی

محمد على و د ـعزت على عطية،دار الكتب الحديثة ،مصر ، بدون تاريخ ـ

١١٠ـالمصباح المنير :الفيّومى ،مصوّرة دار العلم للملايين ببيروت عن الطبعة المصرية الأولى ـ

١١١ـالمصنف:ابن أبى شيبة ، ضبطه وصححه محمد عبد السلام شاهين ، دار الكتب العلمية ،بيروت ،ط١، ١٩٩٥م ـ

١١٢ـالمصنّف : عبد الرزاق الصنعانى ،تحقيق أيمن الأزهرى ،دار الكتب العلمية ،بيروت ، ط١، ٢٠٠٠م ـ

١١٣ـالمطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية :ابن حجر العسقلانى ،تحقيق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمى ،دار المعرفة ،بيروت ،١٩٩٣م ـ

١١٤ـمعالم التنزيل :الإمام البغوى ،تحقيق محمد عبدالله النمر وزميليه ، دار طيبة ،الرياض،ط٢،١٩٩٣م ـ

١١٥ـالمعجم الأوسط :ابو القاسم الطبرانى ،تحقيق طارق بن عوض عبد المحسن بن ابراهيم ،دار الحرمين،القاهرة ،ط١،١٩٩٥م ـ

١١٦ـمعجم البلدان : ياقوت الحموى ،دار إحياء التراث العربى ،بيروت ،١٩٧٩م ـ

١١٧ـالمعجم الكبير: أبوالقاسم الطبرانى،تحقيق حمدى عبد المجيدالسلفى ـ

١١٨ـمعجم تصحيح لغة الإعلام العربى :د ـ عبد الهادى بو طالب ـ

١١٩ـالمعرّب من الكلام الأعجمى : ابو منصور الجواليقى،تحقيق وشرح أحمد محمدشاكر، مطبعة دار الكتب المصرية ،١٣٦١هـ ـ

١٢٠ـمعرفة السنن والأثار :الحافظ البيهقى،تحقيق عبدك المعطى قلعجى، جامعة الدراسات الاسلامية ، كراتشى ،ط١،١٩٩١م ـ

١٢١ـالمعونة على مذهب عالم المدينة :القاضى عبدالوهاب البغدادى، تحقيق حميش عبد الحق،دار الفكر ،بيروت ،بدون تاريخ ـ

١٢٢ـمغنى المحتاج شرح المنهاج :محمد الشر بينى الخطيب ،صححه واعتنى به على عاشور، دار إحيا ء التراث العربى ،بيروت ،بدون تاريخ ـ

١٢٣ـالمغنى عن حمل الأسفار فى الأسفار فى تخريج مافى "الإحياء"من الآثار ،

بهامش "إحياء علوم الدين":الحافظ زين الدين العراقى ،دارالفكر، بيروت ،ط٣،١٩٩١م ـ

١٢٤ـملتقى الأبحر :الإمام إبرهيم الحلبى ،تحقيق ودرا سة الشيخ وهى سليمان الأبانى ،مؤسسة الرسالة ،بيروت ط١،١٩٨٩م ـ

١٢٥ـالمنتقى :ابن الجارود ،عبدالله بن على النيسابورى ،دار الكتب العلمية، بيروت ،ط١،١٤٧١هـ ـ

١٢٦ـالمنثور فى القواعد :بدرالدين الزركشى ، تحقيق محمد حسن إسماعيل ،دار الكتب العلمية ،بيروت ،ط١،٢٠٠٠م ـ

١٢٧ـالمطأ: الإمام مالك بن أنس،تخريج وتعليق وترقيم محمد فؤاد عبد الباقى ،دارالحديث، القاهرة ،ط٢،١٩٩٣م ـ

١٢٨ـالنجم الوهاج : كمال الدين الدميرى ،بتحقيق اللجنة العلمية للناشر دار المنهاج للنشر والتو زيع ،جدة ،ط١،١٤٢٥هـ ـ ٢٠٠٤م ـ

١٢٩ـنهاية المحتاج إلى شرح المنهاج :شمس الدين الرملى ،دار الكتب العلمية ،بيروت ،١٩٩٣م ـ

١٣٠ـالنهاية فى غريب الحديث :ابن الأثيرالجزرى،خرّج أحاديثه وعلّق عليه صلاح عويضة ، دار الكتب العلمية ،بيروت ، ط١،١٩٩٧م ـ

١٣١ـنيل الرجابشرح سفينة النجا: السيد أحمدبن عمر الشاطرى ،دار المنهاج للنشر والتوزيع ، جدّة ، ط٢،١٤٢٨هـ ـ ٢٠٠٧م ـ

١٣٢ـالهداية فى تخريج أحاديث البداية :أحمد بن صديق الغمارى ،تحقيق يوسف المرعشلى وعدنان شلاق ،عالم الكتب ،بيروت، ط١،١٩٨٧م ـ

١٣٣ـالوسيط فى المذهب :الإمام الغزالى ،حققه وعلّق عليه أحمد محمود إبراهيم ومحمد محمدتامر ،دارالسلام ،القاهرة، ١٩٩٧م ـ

١٣٤ـالياقوت النفيس فى مذهب ابن إدريس :السيد أحمد بن عمر الشاطرى، دار الشروق بجدّة، ط٣، ١٣٩٩هـ ـ ١٩٧٩م ـ

یہ کتاب المکتبة الشافعية اداره رضية الابرار بھٹکل میں شامل کیا جارہاہے،

https://telegram.me/shafayibooks